انیس ناگی کے ناولوں میں تاریخی شعور: تحقیقی و تنقیدی جائزہ

بحوالہ خصوصی: فصیلیں (مجموعہ چار ناول)

(تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اُردو)

مقالہ نگار:

سحر افشاں

رجسٹریشن نمبر: 153-FLL/MSURDU/F14

نگران:

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

International Islamic Univ
CENTRAL LIBRARY
ISLAMABAD

TH-21145
Acc #

MS Rc
891.439309
12س

انیس ناگی - تنقید و تشریح

اردو ادب - افسانہ نگاری

بسم الله الرحمن الرحيم

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Sehar Afshan**

Title of the Thesis: " انیس ناگی کے ناولوں میں تاریخی شعور: تحقیقی و تنقیدی جائزہ" بحوالہ خصوصی: فیصلیں (مجموعہ چار ناول) "

Registration No: 153-FLL/MSURDU/F14

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Prof. Dr. Munawar Iqbal Ahmad
Dean Faculty of Language & Literature IIUI

Chairperson Department of Urdu:

Dr. Najeeba Arif
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr.Arshad Mahmood Nashad
Associate Professor,Urdu Department,
AIOU, Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor, Department of Urdu Female IIUI

Supervisor:

Dr. Humaira Ishfaq
Assistant Professor Department Of Urdu Female IUII

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ سحر افشاں رجسٹریشن نمبر: 153-FLL/MSURDU/F14 نے ایم ایس اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی و تنقیدی مقالہ بعنوان " **انیس ناگی کے ناولوں میں تاریخی شعور: تحقیقی و تنقیدی جائزہ بحوالہ خصوصی: فصیلیں (مجموعہ چار ناول)**" رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

AL508827

Rupees 50 ۵۰ روپیہ

﴿بیان حلفی﴾

منکہ مسماۃ سحر افشاں دختر عبدالوحید خاں رجسٹریشن نمبر 153-FLL/MSURDU/F14 حلفاً اقرا
کرتی ہوں کہ میرا مقالہ بعنوان "انیس ناگی کے ناولوں میں تاریخی شعور: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، بحوالہ خصوص
:فصیلیں (مجموعہ چار ناول)" سرقے سے پاک ہے اور اس مقالے میں مکمل اور اصل حوالہ جات د
گئے ہیں۔

متذکرہ بالا بیان میرے علم ویقین کے مطابق درست ہے اور کوئی امر مخفی ہرگز نہ رکھا گیا ہے

مقالہ نگار

SehrAfshan

سحر افشاں

35302-1894908-6

ATTESTED

OATH COMMISSIONER RAWALPINDI

30-05-2022

پیش لفظ

ڈنیا کا وجود اور اس میں زندگی کا آغاز تاریخ کا نقطہء آغاز تھا۔ ہر گزرتا دور تاریخ کا دامن وسیع سے وسیع تر کرتا گیا۔ ڈنیا میں حضرتِ انسان کی آمد تاریخ کا وہ پہلا اور اہم ترین واقعہ تھا۔ جس نے دنیا کی تاریخ کو عظیم واقعات و سانحات کے حوالے سے بنیاد فراہم کی۔ انسان ہی وہ مرکزی نقطہ تھا، جس سے معاشرے کے عوامل نے جڑ کر تاریخ کے تانے بانے بُنے اور ہمیں قرنوں کی تاریخ کا وارث کیا۔ وقت گزرتا گیا، انسان سماجی و تہذیبی حوالوں سے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے شعور کے درجے سر کرتا گیا۔ انسان نے اپنے اسلاف کی تاریخ کو کاغذوں میں سمیٹ کر اپنے لیے زادِ راہ بنایا۔ اس عمل کے دوران ڈنیا نے انسان کے گوں ناگوں روپ دیکھے، وقت کے دھاروں کو بدلتے اور بالآخر تاریخ میں ضم ہوتے دیکھا۔ ہر انسان اپنی تفہیم کے مطابق تاریخ کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے ماضی، حال اور مستقبل کی کڑیوں کو جوڑ کر اپنے تاریخی شعور کا اظہار کرتا ہے۔ ہر شخص اپنی فہم اور ادراک کی صلاحیت کی بنا پر دوسرے انسان سے مختلف شخصیت کا حامل ہے۔ یہ عملوں اور مزاجوں کا اختلاف ہی دنیا کی بنیاد ہے۔ خارجی و باطنی عوامل سے متاثر ہونے کی سطح ہر انسان کی مختلف ہوتی ہے۔ ایک شخص اگر کسی واقعے سے ذہنی و جذباتی حوالے سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے تو ممکن ہے دوسرا شخص اُس واقعے کو سرسری انداز میں قبول کرے۔

انسانی مزاجوں کا یہ اختلاف بیان اور تحریر کے ذریعے ہمارے سامنے آتا ہے۔ تاریخ کو تحریری صورت میں محفوظ کرنے کا خیال زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ازل سے دورِ حاضر تک ہر گُزرے دور کے کچھ واضح کچھ دُھندلے نقوش ملتے ہیں۔ اختلافات کی گنجائش موجود ہونے کے باوجود تاریخ وہ سچ ہے، جسے جُھٹلایا نہیں جا سکتا، اس سچ کو ادب نے بھی قبول کیا اور تاریخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ڈنیا کے بہترین قلم کاروں نے ماضی کے جھروکوں سے تاریخ کے متنوع پہلوؤں کو چُن کر ادب کا اٹوٹ حصّہ بنا دِیا۔ عالمی ادب سے بہترین لکھاریوں نے تاریخ کو ادب کے پیرایہ میں اس طرح بیان کیا کہ تاریخ کا خشک اسلوب، ادب کی چاشنی سے تر ہو کر نگاہوں کے ذریعے دل میں گھر کرتا چلا گیا۔ جہاں انگریزی ادب میں تاریخی ادب پاروں کے شاہکار موجود ہیں وہیں اُردو ادب کی روایت بھی تاریخی ناول نگاری کے بنا ادھوری رہے گی۔ ابتدا ہی سے تاریخ کے موضوعات نے اردو ناول میں اپنی جگہ بنالی۔ ہمارے ادیبوں نے تاریخ کو ناول میں بہت خوبی سے سمیٹا۔ تاریخ کا ادب کی مختلف اصناف میں اظہار جہاں تاریخ سے کماحقہ آگاہی کا باعث بنا وہی تاریخی ناول، اپنے لکھنے والوں کے تاریخی شعور کے عکاس بھی ثابت ہوئے۔ سچ ہے کہ ہر فن پارہ اپنے تخلیق کرنے والے کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ زیر تحقیق موضوع میں انیس ناگی کے ناولوں کے ذریعے

اُن کے تاریخی شعور کو خارجی و باطنی عوامل کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مجموعی طور پر اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں تاریخ، تاریخ کے مختلف نظریات، تاریخی شعور کے مُباحث، انگریزی میں تاریخی ناول نگاری کا مختصر جائزہ نیز اُردو ناول کی روایت میں تاریخی شعور کا تجزیہ ناول نگاروں کی نگارشات کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ باب اوّل کے اختتام پر تجزیاتی فریم ورک کو مُفصل بیان کیا گیا ہے۔ جس کی بنیاد پر آئندہ ابواب میں فصیلیں میں شامل ناولوں میں تاریخی حوالوں کا جائزہ لے کر انیس ناگی کے تاریخی شعور سے بحث کی گئی ہے۔

باب دوم میں ناول ایک گرم موسم کی کہانی میں تاریخی حوالوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ مختلف تاریخی کتب کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ تجزیئے میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پس منظر، حالات و واقعات نیز انگریزی عملداری میں لوگوں کے ذہنی و فکری رویوں کو انیس ناگی کے تاریخی شعور کے ضمن میں جانچا گیا ہے۔

باب سوم میں ناول قلعہ میں قیام پاکستان کے بعد مُنتشر حالات، زمینوں اور مکانوں کی الاٹمنٹ کے قضیے، جو پاکستان بننے کے تیس برس بعد بھی جوں کے توں رہے نیز لاہور میں فالتو زمینوں اور پلاٹوں کی ناجائز الاٹمنٹ کے پس منظر میں نیکی و بدی کی جنگ کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ انیس ناگی کے فکری تناظر میں لیا گیا ہے۔

باب چہارم میں ناول چوہوں کی کہانی، جسے انیس ناگی نے علامتی پیرایہ میں بیان کیا ہے، میں ۱۹۹۴ء میں بھارت میں پھوٹ پڑنے والی طاعون کی وبا نے کس طرح پاکستان و ہندوستان کے منفی سوچ کے حامل بااثر طبقے کی ذہنی کثافتوں کو آشکار کیا، اس کا جائزہ انیس ناگی کے تاریخی نظریات کو سامنے رکھ کر لیا گیا ہے۔

باب پنجم میں ناول کیمپ میں پاکستان میں افغان مہاجرین کیلئے قائم کردہ کیمپوں کی زندگی اور اس سے جُڑے مسائل، ہجرت و جلاوطنی کے دُکھ، انسان کا اپنی سرزمین سے الگ ہونے کا کٹھن تجربہ، نیز مہاجرین میں سے جرائم پیشہ افراد کا پاکستان کو سیاسی و سماجی حوالوں سے نقصان پہنچا کر بھائی چارے کے جذبے کی پامالی کی سازش اور ان سب مسائل سے بہادری کے ساتھ نبرد آزما ہوتے محبِ وطن کے احوال کا انیس ناگی کے فکری رویوں کے ضمن میں تجزیہ اس باب کا حاصل ہے۔ ماحصل میں تجزیئے کا نچوڑ مُفصل بیان کیا گیا ہے۔

دورانِ مقابلہ پیش آنے والے مسائل کے حوالے سے یہ کہنا چاہوں گی کہ گھریلو و پیشہ ورانہ زندگی میں توازن برقرار رکھتے ہوئے اس مقالے کو تکمیل تک پہنچانا اتنا آسان نہ تھا۔ اس کے لیے میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں کہ اُس نے ہر مُشکل میں میرا ساتھ دیا۔ ہمیشہ دُرست سمت میں میری رہنمائی فرما کر مجھے توفیق دی کہ

میں اس تحقیقی کام کو اُس کی عطا کردہ صلاحیتوں کے مطابق انجام دے سکوں۔ اپنی بڑی امی شکیلہ بیگم، اپنے والدین اور اُن تمام مہربان ہستیوں کی دُعاؤں اور محبتوں کی مقروض ہوں، جنھوں نے مجھے زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشا۔ اُن میں سے ایک شفیق ہستی کے خصوصی ذکر کے بغیر میری ہر بات ادھوری ہے، میرے پیارے ماموں، کنور محمد نعیم، جو اب اس جہان فانی میں موجود نہیں، اُن کی حوصلہ افزا باتیں اور انمٹ یادیں، اس مقالے کیلیئے کی گئی تمام تر کاوشوں کی بنیاد ہیں۔

زندگی میں ملنے والی کامیابیوں میں ہمارے اساتذہ کرام خصوصی کردار ادا کرتے ہیں۔ اُن کی رہبری و معاونت ہمیں معاشرے کے قدم سے قدم ملا کر چلنا سکھاتی ہے۔ میں اپنے تمام اساتذہ بالخصوص ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ (مرحوم)، ڈاکٹر روبینہ ترین اور ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تہہ دل سے مشکور ہوں۔ اس مقام پر اپنے تحقیقی مقالے کی نگران اور اپنی ہمدرد دو معاون اُستاد ڈاکٹر حمیرا اشفاق صاحبہ کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہوں گی، جن کی توجہ و رہنمائی نے مجھے اس مقالے پر پیہم نظر ثانی کرتے ہوئے خوب سے خوب تر کے حصول کی طرف مائل رکھا۔ جن کی دھیمی و دلفریب مُسکراہٹ ہمیشہ میری تمام تر تھکن کو زائل کرنے کا باعث رہی ہے۔ اپنے شریک حیات خالد محمود شاہ اور اپنے پیارے بچوں مومنہ خالد اور سید عبداللہ خالد کی مُحبتوں کا تہہ دل سے اعتراف کرتے ہوئے بھی میں ان مُحبتوں کا حق الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر ہوں کہ ان کا ساتھ میرا سرمایہء حیات ہے۔

سحر افشاں

مقالہ نگار

فہرستِ ابواب

بابِ اوّل	اُردو ناول میں تاریخی شعور: ایک جائزہ	02
بابِ دوم	انیس ناگی کا تاریخی شعور: ایک گرم موسم کی کہانی کے تناظر میں	46
بابِ سوم	قلعہ: انیس ناگی کے تاریخی نظریات کا عکاس	87
بابِ چہارم	چوہوں کی کہانی: انیس ناگی کی تاریخی جہات کی روشنی میں	109
بابِ پنجم	کیمپ: انیس ناگی کی تاریخی فکر کا نمائندہ ناول	130
	ماحصل	152
	کتابیات	166

باب اوّل

اردو ناول میں تاریخی شعور: ایک جائزہ

تاریخ اور اس کے مختلف نظریات

تاریخ، ماضی کے واقعات کو پیش کرنے کا نام ہے۔ تاریخ، ماضی کے گزرے ہوئے حقیقی واقعات کو سچائی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ماضی کے لوگ، حالات وواقعات اور بڑی بڑی تبدیلیاں، جنھوں نے دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا، تاریخ اُنھیں اپنے اندر سمو کے، حال اور مُستقبل کے لوگوں تک پہنچانے کا باعث بنتی ہے۔ دورِ قدیم سے دورِ حاضر تک تاریخ سے متعلق مختلف طرح کے نظریات پیش ہوتے آئے ہیں، جن میں وقت کے ساتھ کمی و بیشی ہوتی رہی ہے۔ مگر ان تعریفات میں جو بنیادی نکتہ ہے وہ یہ کہ تاریخ ماضی کے واقعات کا بیان ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق:"انسانی خطاپذیر شہادت و فہم کے مطابق قضائے پارینہ کا زیادہ محنت کر کے بیان کرنا تاریخ کہلاتا ہے"۔(۱) تاریخ کے ذریعے دورِ ماضی کی تہذیب و تمدن سے خاطر خواہ واقفیت و آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ بصورت دیگر ماضی تک رسائی حاصل کرنا ناممکن رہتا۔ ڈچ مورّخ جان ہیوزنگا(Johan Huizinga) کے مطابق:"تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ماضی کی تہذیب کا عکس نظر آتا ہے۔"(۲) تاریخ ایک مُسلسل جاری و ساری عمل کا نام ہے۔ لُغوی اعتبار سے تاریخ سے مُراد"وقت کی نشاندہی کرنا"یا"وقت بتانا"کے ہیں۔ جبکہ اصطلاح میں تاریخ سے مُراد ماضی میں ہونے والے اہم واقعات و حادثات ہیں، جن سے دُنیا میں کوئی بڑی تبدیلی آئی ہو، جن کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور سائنسی سطح پر اہمیت مُسلّم ہو، کی سنہ وار ترتیب و تدوین کا نام ہے۔

دائرۃ المعارف میں تاریخ کی تعریف یوں کی گئی ہے:"تاریخ ایک ایسا مضمون ہے، جس میں ماضی میں پیش آنے والے واقعات اور لوگوں کے بارے میں معلومات ہوتی ہیں۔"(۳) تاریخ، ماضی کے واقعات کے ذریعے مستقبل کو روشن کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ حال سے تعلق رکھنے والے لوگ ماضی کے حالات وواقعات اور حوادث کی بُنیاد پر مستقبل کی عمارت کی تعمیر کرتے ہیں۔ تاریخ رقم کرتے ہوئے مورخ کے لیے ہر دور، ہر واقعہ اور ہر شخصیت کے حوالے سے صداقتوں کے تمام تقاضوں کو پورا کرنا ازحد ضروری ہے تاکہ واقعات کی اصل کسی صورت مسخ نہ ہونے پائے۔ ایف۔ ایس۔ آلیور(Frederick Scott Oliver) کے نزدیک"مورخ صرف کہانی کو ہی سلسلہ وار ترتیب سے بیان نہ کرے بلکہ تاریخ میں اپنے ذاتی، اخلاقی اور مذہبی خیالات کی آمیزش سے بھی اجتناب کرے۔"(۴) تاریخ ماضی، حال اور مستقبل کی سلسلہ وار کڑی کا نام ہے جس میں جس حد تک مورخ غیر جانبداری سے کام

لیتے ہوئے حقائق و شواہد کو بیان کرے گا، اُسی حد تک وہ تاریخ معیاری ہو گی۔ مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ تاریخ رقم کرتے ہوئے مکمل طور پر خیال آرائی سے گریز کرے۔ تاریخ حقائق کی تلاش ہے۔ اس میں حقائق کو اُس کے لوازمات کے ساتھ پیش کرنا مورخ کا فرض ہے۔ تاریخ میں تخیل کی آمیزش سے حقائق کی صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے سچائی کا حصول مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی اس حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ ”تاریخ محض خیال آرائی نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں ماضی کے کارنامے اور قصّے بیان کیے جاتے ہیں اور قصّوں میں تخیل موجود ہوتا ہے لیکن آنے والا مورخ اپنی تحقیق سے ان داستانوں اور قصّوں میں حقیقی عناصر تلاش کرتا ہے۔“(۵)

تاریخ معاشرے سے متعلق ہوتی ہے۔ تاریخ میں افرادِ معاشرہ کی زندگی اور اس سے متعلق حالات و واقعات اور انسانی سرگرمیوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی اُتار چڑھاؤ، عروج و زوال اور خوشی و غم دونوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ تاریخ میں انہی کارناموں کو جگہ دی جاتی ہے۔ تاریخ کا تصور کتنا قدیم ہے؟ کتنے برسوں سے تاریخ رقم کی جارہی ہے؟ تاریخ کس وقت سے انسانی سرگرمیوں اور معاشرے کے افراد کے حالات وواقعات کو سمیٹتی آئی ہے؟ وقت کے ساتھ ساتھ تاریخ نے اپنے روپ بدلے ہیں۔ جیسے جیسے انسانی زندگی تبدیلیوں کا شکار ہوتی رہی ہے۔ ویسے ویسے تاریخ نے بھی مختلف دھارے بدلے۔ زندگی مسلسل حرکت اور تبدیلی کا نام ہے، ہر آن زندگی ایک نئی صورت، ایک نیا رخ اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان، معاشرے، وقت اور حالات میں آنے والی نمایاں تبدیلیاں تاریخ میں ضم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ تصور تاریخ کے ضمن میں ڈاکٹر آفتاب اصغر لکھتے ہیں: ”تصور تاریخ اتنا ہی قدیم ہے کہ جتنا تصور زماں و مکاں، ۔قصّے، کہانیوں سے شروع ہو کر آج تک تاریخ اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اسے تمام علوم انسانی کی رواں دواں داستان کہا جاسکتا ہے۔“(۶)

تاریخ ہر عہد کے واقعات کو اپنے اندر سموئے ہوتی ہے اور اُس عہد کا مکمل منظر نامہ، اُس دور کی تاریخ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ تاریخ ہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم ماضی، حال اور مُستقبل کا سفر کرتے ہیں۔ ایسے میں ہمیں تاریخ کے اُن حقائق کو جاننے کا موقع ملتا ہے جن کے ذریعے دُنیا میں وہ عظیم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جنھوں نے دُنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ درحقیقت تاریخ کا آغاز وہیں سے ہوتا ہے جہاں سے اس دُنیا کا آغاز اور ابتدا ہوئی۔ تاریخ کی قدامت کے حوالے سے ڈاکٹر آفتاب اصغر رقم طراز ہیں” تاریخ اتنی قدیم ہے کہ جتنی تحریر۔(۷) تاریخ کا آغاز، تحریر کے شانہ بشانہ ملتا ہے۔ آج جو تحریر ہمارے سامنے ہے وہ ہزاروں سال کی پے در پے تبدیلیوں کے بعد ہم تک پہنچی ہے۔ تحریر کی ابتداء پتھر، لکڑی، درختوں کی چھال، چمڑے اور مختلف طرح کی دھاتوں پر نقش ہونے سے شروع ہوئی۔ بعد ازاں ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے کاغذ پر محفوظ ہوئی۔ تاریخ کو محفوظ کرنے کے حوالے سے ڈاکٹر

مبارک علی، ڈاکٹر کے۔ ایم اشرف کی کتاب علم تاریخ اور ہماری تاریخ نویسی سے حوالہ دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں:" انسان ابھی نیم وحشی دور میں اور قبائلی تمدن سے آگے نہ بڑھا تھا کہ اسے اپنے آباؤاجداد اور ناموروں کے کارناموں کو محفوظ کرنے کا خیال آیا۔"(۸) گویا انسان نے اپنے شعور اور فہم سے اس امر کا ادارک کر لیا تھا کہ اُسے اپنی بقا کیلئے اپنے ماضی کو یاد رکھنا ہوگا۔ تاکہ ماضی میں ہونے والے حوادث و عظیم واقعات اور اہم شخصیات کے حوالے مُستقبل کو بہتر بنانے کا ذریعہ ثابت ہوں۔ نیز ہم ماضی کے روشن پہلوؤں کو مشعل راہ بناتے ہوئے ترقی کی منازل طے کر سکیں اور ماضی میں ہونے والی کوتاہیوں سے حتی الامکان بچیں۔ تاریخ سے رشتہ استوار رکھ کر ہی انسانی افکار و حوادث کی بہتر تفہیم کی جاسکتی ہے۔ ماضی ہی کے ذریعے ہم حال سے بہتر رشتہ قائم کرتے ہوئے مستقبل کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ تاریخ میں ہم اپنی سوچ کو دخل اندازی کا موقع نہیں دیتے بلکہ حقائق اور سچائی کو پیش کرتے ہیں۔

جارج سنتایانا(George Santayana) ماضی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے"جو لوگ اپنے ماضی کو فراموش کر دیتے ہیں، انہیں ماضی کو دہرانے کی سزا دی جانی چاہیے۔"(۹) تاریخ اُن واقعاتِ گذشتہ کی داستان سناتی ہے، جنھوں نے دنیا کو سیاسی و سماجی سطح پر متاثر کیا، اور اُن واقعات کی نوعیت خارجی ہوتی ہے۔ ماضی کی اہمیت مسلم ہے۔ ماضی کو فراموش کرنا گویا اپنی بنیاد کو کمزور بنانا اور اپنی جڑوں کو کاٹ دینا ہے۔ تاریخ چونکہ خارجی واقعات کا بیان ہے لہٰذا تاریخ دردمندی اور سوزو گداز سے عاری ہوتی ہے۔ اس میں داخلی کیفیات و احساسات کو کوئی دخل نہیں ہے۔ مورخ کا فریضہ تاریخ کو غیر جذباتی و غیر جانبدار ہوتے ہوئے سچائی و دیانت داری کے ساتھ احاطہ تحریر میں لانا ہے۔ مختلف محققین کی رائے اس پہلو پر روشنی ڈالتی ہے کہ تاریخ کا بیشتر حصہ سیاسی دباؤ کے تحت تحریر کیا گیا ہے۔ جس سے تاریخ مسخ ہوئی اور بہت سے واقعات کی اصل روح سامنے آنے سے قاصر رہی۔ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ اس ضمن میں بیان کرتے ہیں:

> " تاریخ نویسی کا بیشتر کام سیاسی دباؤ اور سیاسی تناظر میں مکمل ہوا ہے۔ مثلاً خلفائے راشدین کے عہد کی تاریخ زیادہ تر بنی اُمیہ کے عہدِ ملوکیت میں لکھی گئی۔ اسی طرح دورِ امیہ کی تاریخ دورِ عباسیہ میں تحریر ہوئی۔ اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ مورخ کسی خاص عہد کے سیاسی تغلب کی بنا پر اسباب کا تجزیہ کرنے میں مکمل غیر جانبداری کا مظاہرہ نہ کر سکا ہو۔"(۱۰)

تاریخ میں سچائی اور صداقت تو لازمی امر ہیں ہی، لیکن کیا تاریخ میں تخیل کی آمیزش کی جاسکتی ہے؟ اس حوالے سے ولیم انگ(Willam Inge) درست حقائق جاننے کے ضمن میں تاریخ میں تخیل کی آمیزش ضروری خیال کرتا ہے اور اسے سچی تاریخ سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ولیم انگ کے مطابق:

"The Motives for Falsifying history are in exact proportion to the

interest of posterity in knowing the truth falsified history has perhaps had more influence than true story." (11)

ولیم انگ کی یہ رائے کہ تاریخ میں تخیل کی آمیزش ہونی چاہیے، دُرست معلوم نہیں ہوتی۔ تاریخ حقیقی زندگی کے افراد اور حقیقی واقعات کو پیش کرتی ہے جبکہ تخیل کی آمیزش تاریخ کو خالص نہیں رہنے دیتی۔ در حقیقت تخیل کی آمیزش جہاں شعر و ادب میں دلکشی و خوبصورتی پیدا کرتی ہیں۔ وہیں تاریخی حقائق کے بیان میں تخیل اور خیال آرائی حقائق کو مسخ کر کے حقیقت سے بھی دور کر دیتی ہے۔ لہذا تاریخ میں صرف سچائی کو ہی بیان کیا جانا چاہیے۔ تاریخ کی مختلف تعریفات و نظریات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مفکرین و محققین کے نزدیک تاریخ ماضی کے اہم واقعات کا آئینہ ہے، کچھ لوگوں کی رائے کے مطابق اہم شخصیات اور نامور لوگ تاریخ کا حاصل ہیں۔ بعض کے نزدیک تاریخ قوموں کے عروج وزوال کی داستان کو زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کا نام ہے۔ کچھ لوگوں کے مطابق تاریخ انفرادی و اجتماعی سطح پر انسانی افعال کا بیان اور ماضی کی صداقتوں کا حوالہ ہے۔ ان تمام حوالوں سے تاریخ اور اس کے مختلف نظریات پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے کہ تاریخ عہد گذشتہ کے اہم احوال و آثار، غیر معمولی شخصیات، ماضی کے اُتار چڑھاؤ اپنے اندر سموئے ہوتی ہے۔

تاریخ سیاسی، سماجی، معاشرتی و معاشی شعور فراہم کرنے کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ تاریخ سے وابستگی افراد میں تاریخ شعور کو جنم دیتی ہے۔ انسان میں اپنے ماضی سے وابستگی نیز حال کو ساتھ لے کر چلنے کے ساتھ ساتھ مستقبل سے آگاہی کا شعور بھی فراہم کرتی ہے۔

تاریخی شعور کے نظری مباحث

کسی بھی دور میں ماضی کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، ہر دور، ہر معاشرے اور ہر تہذیب کا انسان ماضی کی بنیاد پر حال کی عمارت کھڑی کرتا آیا ہے اور حال کی عمارت پر مستقبل کی بنیادیں رکھی جاتی رہی ہیں۔ ایسے میں تاریخ کے ذریعے ہم اپنے ماضی میں جھانک کر قوموں کے عروج زوال کی مکمل تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ نیز اُن اسباب و علل کا جائزہ بھی تاریخ کے ذریعے ہی ممکن ہے جن کی بنا پر ماضی کی عظیم الشان ہستیاں، مطلق العنان بادشاہ اور طاقتور اقوام شکست وریخت کا شکار ہو کر محض تاریخ کے صفحات میں باقی رہ گئیں۔ تاریخ ہی وہ بنیادی کڑی ہے جس کی بدولت انسان کا تاریخی شعور پروان چڑھتا ہے۔ سوال یہ ہے تاریخی شعور کیا ہے؟ اس کے بنیادی عناصر کیا ہیں؟ اس سلسلے میں بہت سے مفکرین و محققین کی آرا ملتی ہیں۔

اینڈریو گلین کروس (Andrew Glencross) نے تاریخی شعور کی تعریف اس طرح سے کی ہے:

"Historical Consciousness is defined as the understanding of the temporality of historical experience, that is how past, present and future are though to be connected for the sake of producing historical knowledge" (۱۲)

(تاریخی شعور کو عارضی تجربے کے طور پر بیان کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح ماضی، حال اور مُستقبل کو تاریخی معلومات کے حصول کی خاطر جوڑا جاسکتا ہے۔)

اہم تاریخی معلومات کے حصول کیلئے ماضی کے ساتھ ساتھ حال اور مُستقبل بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ تاریخی شعور کے پروان چڑھنے میں ماضی، حال اور مُستقبل تینوں کی ایک دوسرے سے وابستگی بہت ضروری ہے۔ ماضی میں ہونے والے اہم واقعات، حادثات اور معاشی و معاشرتی حالات اپنے اثرات حال کی طرف منتقل کرتے ہیں اور حال اُن حالات کو مناسب کمی و بیشی کے ساتھ مُستقبل کی طرف بھیج دیتا ہے۔ ہینس جارج گاڈامر (Hans-Georg Gadamer) نے تاریخی شعور کی جو تعریف کی ہے، اُس میں وہ تاریخی شعور کو جدید دور کے انسان کی علمی کیفیت کا نام دیتا ہے۔ تاریخی شعور، حقائق کا مکمل شعور رکھنے کا نام ہے۔ ہینس جارج کے مطابق: "تاریخی شعور دورِ جدید کے انسان کی علمی کیفیت کا نام ہے اور یہ گذشتہ پانچ سو سالوں میں ہونے والا نہایت اہم ارتقاء ہے۔ (۱۳)

ڈالارنا یونیورسٹی (Dalarna University) کے شعبہ تاریخ کے پروفیسر "رابرٹ تھارپ" (Robert Thorp) نے اپنے تحقیقی مضمون بعنوان ''تاریخی شعور، تاریخی میڈیا اور تاریخی تعلیم" میں تاریخی شعور کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ رابرٹ تھارپ کے نزدیک: "تاریخی شعور سے مراد یہ ہے کہ لوگ ماضی، حال اور مستقبل کے تعلق کی تفہیم کس طرح کرتے ہیں اور ماضی، حال اور مستقبل کو تاریخ میں ایک دوسرے سے کیسے جوڑتے ہیں۔" (۱۴) اہم سوال یہ ہے کہ ایک شخص انفرادی سطح پر تاریخ کو کن حوالوں سے سمجھتا ہے؟ ہر فرد ایک انفرادی سوچ اور شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہر فرد کے کسی بھی واقعہ سے متاثر ہونے کی سطح دوسرے سے یکسر مختلف ہو سکتی ہے۔ تاریخی واقعات ہر فرد پر مختلف طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں کیونکہ ہر ذی روح ذہنی و جسمانی حوالوں سے دوسرے مختلف ہے۔ انسانی شخصیت ایک بہت پیچیدہ مُعمہ ہے۔ ہر فرد کی تاریخ سے مُتاثر ہونے کی نوعیت اُس کے داخلی و خارجی رُجحانات و جذبات کی روشنی میں دوسرے فرد سے مختلف ہوتی ہے۔ یہی داخلی و خارجی رجحان انفرادی سطح پر افراد کا تاریخی شعور مُرتب کرتا ہے۔ رابرٹ تھارپ نے تاریخی شعور معلوم کرنے کے ضمن میں بیانیہ (Narration) کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ انسان کی شخصیت، خیالات، جذبات و احساسات، مزاج اور سوچ کا اظہار اُس کی گفتگو اور بیان سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر فرد کے تاریخی شعور کا اظہار اُس کے بیانیہ سے ہوتا ہے۔ تاریخی شعور کے اظہار کے حوالے سے بیانیہ کتنا اہم کردار ادا کرتا ہے، اس حوالے سے جارجن سٹرائب

(Jurgen Straub) کے تاریخی شعور کے نظریہ کو جیری سبرٹ (Jiri Subrt) نے اپنے آرٹیکل میں اس طرح سے بیان کیا ہے:

> "Jurgen Straub combines historical consciousness with historical narrative construction and historical meanings in the field of the human mind." (۱۵)

جارجن نے تاریخی شعور کی کڑی تاریخی بیانیہ سے ملائی ہے کہ تاریخی بیانیہ وہ اہم کڑی ہے جو تاریخی شعور تک رسائی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تاریخی شعور کا اظہار سب سے پہلے بیان اور تحریر سے لگایا جاسکتا ہے کیونکہ تاریخ کو ہم اپنے مخصوص تاریخی رجحان اور شعور کے مطابق احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ بیانیہ کے ساتھ ساتھ رابرٹ تھارپ نے تحریر میں تاریخی حوالوں کے استعمال اور تاریخی ثقافت کے حوالوں کو بھی تاریخی شعور تک رسائی کیلئے اہم گردانا ہے۔ پیٹر سی سائیکس (Peter C.Seixas) نے تاریخی شعور کے حوالے سے ۲۰۰۴ میں ایک مضمون "Theorizing Historical Consciousness" تحریر کیا، جس میں اس نے تاریخی شعور کی تعریف اس طرح سے کی ہے: "ہماری ماضی کے حوالے سے سمجھ اور آگاہی، ہم میں حال اور مستقبل کی حس کو بناتی اور اُس کا شعور پیدا کرتی ہے، اسی کو تاریخی شعور کہتے ہیں۔" (۱۶) پیٹر سی سائیکس نے تاریخی شعور کی تعمیر میں ماضی اور ماضی کے حوالوں کو درست سمت میں سمجھنے کو اہم قرار دیا ہے۔ ماضی کے حوالے سے آگاہی اور شعور پیدا ہونے کے بعد ہی حال اور مستقبل کا شعور پیدا کیا جاسکتا ہے اور ماضی کو سمجھنے اور غور کرنے کے بعد ہی حال اور مستقبل کے زوایے درست کیے جاسکتے ہیں۔ یہی شعور، آگاہی اور تفہیم ہم میں تاریخی شعور کو جنم دیتی ہے۔

حال اور مستقبل کی تعمیر میں ماضی بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماضی میں گزرے ہوئے واقعات کا مطالعہ انفرادی سطح پر فرد کے تاریخی شعور کی تعمیر کرتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں تاریخ کی اہمیت مُسلم ہے۔ جو قوم اپنا ماضی فراموش کر دیتی ہے، وہ اپنی جڑوں کو کمزور کر دیتی ہے اور آنے والی نسلوں میں تاریخ کا شعور پروان نہیں چڑھنے دیتی۔ قاضی قیصر الاسلام نے جرمن تاریخ دان و فلسفی ول ہیلم ڈیلتھے (Wilhelm Dilthey) کے تصورِ حیاتِ انسانی اور تاریخی شعور کے حوالے سے اپنی کتاب فلسفے کے جدید نظریات میں بیان کیا ہے:

> "اُس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تاریخیت ایک نظریہ ہے تاہم سب سے پہلے تاریخیت ایک "طرزِ وجود" یا ایک "اندازِ ہستی" ہے یعنی ایک ایسا اندازِ ہستی کہ جہاں زندگی اپنے سو سو قرینوں کے ہزار جہتی فضاؤں کی طرف رواں دواں نظر آتی ہے اور اسی طرزِ وجود کو "ڈیلتھے" تاریخی شعور سے تعبیر کرتا ہے۔" (۱۷)

ڈیلتھے تاریخی شعور کو تاریخیت سے جوڑتا ہے نیز تاریخیت کو زندگی کے مختلف پہلوؤں اور گوں ناگوں جہات سے منسلک کرتا ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق طرزِ وجود ڈیلتھے کے یہاں تاریخی شعور قرار پاتا ہے۔ تاریخی شعور کی تفہیم اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم تاریخ کو مکمل طور پر اپنے اندر جذب کر کے اُسے حقائق

وبراہین کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاریخ کو سمجھنے کیلئے ماضی کے وقت، حالات، خیالات اور معلومات کو حال اور مستقبل سے جوڑنا ضروری ہے، تاریخ کو ان حوالوں سے سمجھ کر ہی تاریخی شعور قائم ہوتا ہے۔ اس حوالے سے جیری سبرٹ لکھتا ہے:" تاریخی شعور کو محض ماضی سے متعلق مختلف معلومات کے حوالے سے نہیں سمجھا جاسکتا ہے بلکہ تاریخی شعور کو سمجھنے کیلئے ماضی، حال، اور مستقبل کے درمیان مختلف حوالوں کو جاننا ضروری ہے۔"(۱۸)

تاریخ کا مکمل شعور حاصل کرنے کے حوالے سے محض ماضی کو بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ ہر چیز کے اثرات، بعد میں آنے والے وقت اور افراد پر اپنا اثر ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ ماضی میں جو سانحات ہوئے، ان کا اثر محض ماضی تک محدود نہیں رہا بلکہ اُن سانحات کے اثرات حال اور اس کے ساتھ ساتھ مستقبل پر بھی مرتب ہوئے۔ ایسے میں ماضی کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل کا تعلق ماضی کے حوالوں سے جوڑنا بہت ضروری ہے، تبھی تاریخی شعور کو سمجھا جاسکتا ہے۔ تاریخی شعور حال اور مستقبل کے بارے میں لوگوں کے رویے اور طرز عمل کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ نیز تاریخی شعور نہ صرف ماضی کے پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے بلکہ حال اور مستقبل کی راہیں بھی متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ تاریخی شعور کی تعمیر میں ماضی، حال اور مستقبل کی کڑیاں آپس میں جوڑنا کتنا ضروری ہے، اس حوالے سے کارل-ارنسٹ جائسمن،(Karl-Ernst Jeismann) کے مطابق:" تاریخی شعور کو ایک ایسے نظریے کے طور پر بیان کیا جاسکتا ہے جو ماضی کے درمیان تاویل و تعبیر کے تعلق کو، حال کے شعور اور مستقبل کی ہیئت اور تناظر کو آپس میں جوڑتا ہے۔"(۱۹) کارل نے تاریخی شعور کو ایک ایسا نظریہ کہا ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کو شعور اور تاویل کی کڑیوں کے ذریعے آپس میں جوڑتا ہے۔ تاریخی شعور کو تبھی سمجھا جاسکتا ہے جب ماضی، حال اور مستقبل کو آپس میں پیوست کر کے دیکھا جائے تبھی ہمیں ماضی میں ہونے والے واقعات کی اصل سمجھ آسکے گی اور ماضی کے یہی واقعات حال اور پھر مستقبل کو متاثر کرتے ہیں۔ لہٰذا ان تینوں کا آپس میں تعلق از حد ضروری ہے۔ تاریخی شعور کیسے پروان چڑھتا ہے؟ اس حوالے سے رابرٹ تھارپ اپنے تحقیقی مقالہ میں جو بیان کرتا ہے اُس کا مفہوم کچھ یوں ہے:

> "تاریخی شعور کئی ذریعوں سے پروان چڑھتا ہے۔ تاریخی شعور تب ارتقاء پذیر ہوتا ہے جب افراد تاریخ کو مختلف تناظرات اور ہیئتوں میں ظاہر کرتے ہیں اس کے علاوہ تاریخی شعور کی تعمیر تب ہوتی ہے جب تاریخ کے حوالے سے ہم اپنے موروثی حوالوں اور تناظرات کا اطلاق کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جب ہم اپنی تاریخ کے حوالے سے سوچ کو عمل میں لاتے ہیں۔"(۲۰)

رابرٹ تھارپ نے تاریخی شعور کے پروان چڑھنے کے ضمن میں تاریخ کے حوالے سے افراد کا شعور اور زاویہ نظر واضح کیا ہے۔ تاریخی شعور تب نشو و نما پاتا ہے جب افراد، تاریخ کو مختلف صورتوں اور حالتوں میں ظاہر کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس حوالے سے انسان کی شخصیت، پسند و ناپسند اور ماضی کے حوالے سے انسان کی

معلومات نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ تاریخی شعور کے پروان چڑھنے میں تاریخ کے حوالے وراثت کے حوالوں کے ساتھ جوڑے جاتے ہیں یعنی وراثت میں ہمیں اپنے بزرگوں اور آباؤاجداد سے تاریخ کا علم جس طرح سے ملا۔ تاریخ جن صورتوں اور تناظرات میں موروثی حوالوں کے ساتھ ہم تک پہنچی۔ ہمارا تاریخی شعور بھی انہی حوالوں کی روشنی میں پروان چڑھتا ہے۔ خورشید انور نے تاریخی شعور کیلئے زماں و مکاں کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ خورشید انور قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور میں لکھتے ہیں: "تاریخی شعور کیلئے زمانی اور مکانی شعور شرط ہے۔ کسی بھی عہد کو اس کے زمانی اور مکانی سیاق و سباق سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔" (۲۱)

تاریخ کا مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب ہمیں تاریخ کے شعور سے کماحقہ آگاہی ہو گی، تبھی ہم ماضی کی روشنی میں حال، اور حال کی روشنی میں مستقبل کو دیکھ کر اپنے خیالات کو درست سمت دے سکیں گے۔ اور یہی تاریخ کا بنیادی مقصد بھی ہے کہ اُسے ماضی، حال اور مستقبل کے درست تلازموں کے ساتھ سمجھا جائے۔ ہر دور اور زمانے کی تاریخ کو اسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے کہ جب ہم اسے اس کے مخصوص منظر نامے میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ خاص عہد میں رونما ہونے والے عظیم واقعات کی تشریح و توضیح تب تک انصاف کے ساتھ نہیں کی جا سکتی جب تک اُن واقعات کو اُن کے مخصوص دور کے حالات و واقعات کی روشنی میں نہ دیکھا جائے۔ ماضی کے حالات و واقعات کو، عظیم شخصیات و افراد کو اُن کے زمان و مکاں کے ساتھ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ ہر دور، ہر علاقے کی اپنی تہذیب، تمدن، زبان، رہن سہن، رسم و رواج، مخصوص جغرافیائی حالات، مذہب اور آب و ہوا ہوتی ہے۔ لہٰذا ماضی کو تبھی بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے جب اسے اُس کے مخصوص دور اور وقت کے سانچے میں ڈھال کے دیکھا جائے۔ ہر واقعے کی توضیح اپنے مخصوص دور کی متقاضی ہے۔ اس ضمن میں خورشید انور مزید لکھتے ہیں:

> "مختلف سماجوں کی بنیاد اور اُن کے اسٹرکچر میں بھی فرق ہوتا ہے جو کہ پیداواری طریقوں میں فرق کے باعث بھی ہوتا ہے اور ہر سماج میں جاری ارتقائی عمل بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف سماجوں میں بعض مماثلتیں بھی ہوتی ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کے مناسب علم اور سمجھ کے بغیر مثبت تاریخی شعور ممکن نہیں۔" (۲۲)

زمان و مکاں سے مکمل آگاہی کے ساتھ ساتھ سماجوں کے اتفاقات و اختلافات کو مدِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ بات دُرست ہے کہ ہر سماج اپنی ایک الگ پہچان اور خاصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اور یہ پہچان اور خاصیت اُس سماج میں رہنے والوں کے مذہب، تہذیب، تمدن، کلچر اور زبان کے مرہونِ منت ہے۔ ہر سماج میں دوسرے سماج سے ملتی جلتی باتیں بھی ہوتی ہیں اور ٹکراؤ کی بھی بہت سے صورتیں ہوتی ہیں۔ ایسے میں تاریخی شعور تک رسائی کیلئے اُس سماج کو اُس کے تلازمات کے ساتھ سمجھنا بہت ضروری ہے۔ تاریخی شعور کی مختلف صورتیں اور نوعیتیں ہو سکتی ہیں۔ ان نوعیتوں کا دارومدار اس بات پر ہے کہ یہ تاریخی شعور ہمیں کیسے اور کن ذریعوں سے ملا۔ جارن روسن

(Jorn Rusen) تاریخی شعور کو چار اقسام میں منقسم کرتا ہے۔ پیٹر لی (Peter Lee) نے تاریخی شعور کے حوالے سے لکھتے ہوئے جارن روسن کی بیان کردہ تاریخی شعور کی اقسام کا ذکر کیا ہے: "روایتی تاریخی شعور، مثالی تاریخی شعور، تنقیدی تاریخی شعور اور وراثتی تاریخی شعور" (۲۳)

۱۔ روایتی تاریخی شعور:

روایتی تاریخی شعور ماضی کے حوالے سے ایک ایسا نقطہ نظر ہے جس میں روایتی بیانات، قصے اور روایتیں پہلے سے دی گئی ہوتی ہیں۔ یہ شعور ہمیں ہماری روایات، رسم و رواج اور زندگی کی مختلف صورتوں اور ہیتوں کی جڑوں اور بنیادوں کے حوالے سے لیس کرتا ہے۔

۲۔ مثالی تاریخی شعور:

مثالی تاریخی شعور ماضی کو تبدیلی کے عملی اصول و قوانین نیز انسانی رہنمائی کے حوالے سے لیتا ہے جو ہمیشہ تمام وقتوں میں درست ثابت ہوتا ہے۔ مثالی تاریخی شعور ہمارے ماضی کے حوالے سے نقطہ نظر کو وسیع کرتا ہے۔ نیز ہمارے اندر ماضی کے حوالے سے منجمد روایات کو توڑ کر ہمارے اندر شعور بیدار کرتا ہے۔

۳۔ تنقیدی تاریخی شعور:

تنقیدی تاریخی شعور، روایتی تحریروں، قصوں اور بیانات کو چیلنج کرتا ہے۔ اس کی توجہ مثالی اصولوں سے انحراف کرنے پر مرکوز ہوتی ہے۔

۴۔ وراثتی تاریخی شعور:

وراثتی تاریخی شعور کا نقطہ نظر سابقہ تینوں شعور سے انحراف اور اُن کی تردید کرتا ہے۔ تبدیلی ماضی کا بنیادی نکتہ ہے اور تاریخ ہمیں اس کے معنی و مفہوم سے آگاہ کرتی ہے۔ انسان اور چیزیں تبدیلی کے باعث وجود قائم رکھتی ہیں۔ اخلاقی روایات اگرچہ جامد ہوتی ہیں مگر اختلاف کو قبول کرنے سے یہ متحد ہو جاتی ہیں اور پھر وقت کے ساتھ اُن میں تبدیلی بھی آجاتی ہے۔ تاریخی شعور کی مختلف اقسام دیکھنے کے بعد تاریخی شعور کے مختلف عناصر اور اجزاء بھی کافی حد تک واضح ہو جاتے ہیں کہ تاریخ کے حوالے سے مخصوص سوچ اور نقطہ نظر تاریخی شعور کی تعمیر میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔ تاریخی شعور کن بنیادوں پر بنتا ہے، اس حوالے سے جارن روسن بیان کرتا ہے:

> "In schools, students learn history. That is, they learn ways of thinking about the past. In short, school history should develop historical consciousness." (۲۴)

گویا ہمارے تاریخی شعور کی تعمیر کی ابتدا ہمارے سکولوں سے شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں طلباء کو تاریخ کی کتابوں کے ذریعے تاریخ کا علم دیا جاتا ہے۔ ابتدائی سطح پر وہ تاریخ کا علم ہمارے تاریخی شعور کے بننے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ کی نصابی کتب، تاریخی شعور کی تعمیر میں اہم ترین کردار ادا کرتی ہیں۔ "ٹیچنگ ہسٹری آرگنائزیشن" کے مطابق:

> "تاریخی شعور بنتا ہے مختلف تاریخی کہانیوں کے مُطالعہ اور سننے سے، جو کہ ہم تک مختلف ذرائع سے پہنچتی ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ کی نصابی کتب ابتدائی سطح پر ہمارے تاریخی شعور کی تعمیر کرتی ہیں۔ مشہور تواریخ، تاریخی واقعات اور شخصیات پر مبنی فلمیں تاریخی شعور کے بننے میں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ تاریخی ڈاکومینٹری، اصلی دستاویزات، تصاویر، سندیں، ڈاک ٹکٹ وغیرہ بھی اس سلسلے میں اہم ہیں۔ ہمارے بزرگوں اور آباؤاجداد سے ملا ہوا تاریخ کا علم ہمارے ذہن پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتا ہے، جو ہمارے تاریخی شعور کو بناتا ہے۔"(۲۵)

وہ تمام عناصر و عوامل جو ہمارا تعلق ماضی سے جوڑتے ہیں، ہمیں ماضی کی اہم شخصیات، اہم سانحات و واقعات، معاشی، معاشرتی، سیاسی وسائنسی نیز مذہبی سرگرمیوں سے روشناس کراتے ہیں، وہ تمام عوامل مل کر ہمارے تاریخی شعور کی تعمیر کرتے ہیں اور اسی تاریخی شعور کی روشنی میں ہم ماضی کو دیکھتے، سمجھتے اور پرکھتے ہیں۔ تاریخ اور ادب کا رشتہ بہت پُرانا ہے۔ ادبی تخلیقات میں تاریخ کا اظہار بہت پہلے سے چلا آرہا ہے۔ تاریخ نے اپنے اثرات شاعری اور نثر دونوں پر مُرتب کیے ہیں۔ اس تحقیقی مقالہ میں ناول میں تاریخی شعور سے بحث کی جائے گی۔

انگریزی فکشن / ناول میں تاریخی شعور

انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا نے تاریخی فکشن کی تعریف یوں کی ہے: "تاریخی فکشن کا بنیادی عنصر یہ ہے کہ اس میں ماضی کے طور طریقوں، معاشرتی عوامل اور مخصوص دور کی دیگر معلومات وتفصیلات پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔" (۲۶) جس ادب میں تاریخ کو موضوع بنایا جائے، اُس ادب میں پلاٹ، ماضی کے واقعات کی ایک ترتیب کو پیش کرتا ہے۔ تاریخی فکشن کی اصطلاح ادبی اور ایک حد تک مبہم اصطلاح ہے کیونکہ یہ اصطلاح تاریخی ناول کی وضاحت کیلئے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخی فکشن کی اصطلاح ادب کی اور اصناف کیلئے بھی استعمال ہو سکتی ہے، جس میں تھیٹر، اوپیرا، سینما، ٹیلی ویژن، مزاحیہ اور جغرافیائی ناول شامل ہیں۔ ادب اور تاریخ کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ ادبی تحریروں میں تاریخی شعور، ادب اور تاریخ کے رشتے کو مضبوط کرتا ہے۔ ادب میں تاریخ، تاریخی واقعات، نمایاں تاریخی شخصیات، قابل ذکر تحریکیں، جنہوں نے ماضی میں اپنے اثرات مرتب کیے، اُن سب کا ذکر

مختلف اصناف میں ہوتا آیا ہے، جس نے ادب اور تاریخ کے رشتے کو لازوال بنادیا ہے۔ ادب نام ہی مختلف موضوعات وخیالات کے اظہار کا ہے۔ ایسے میں تاریخ جو ہمارے معاشرے و معاشرتی عوامل، ماضی اور ماضی کے مختلف نقوش اپنے اندر سموئے ہوتی ہے، نیز حال کے گوناگوں رنگ اور مستقبل کی قیاس آرائیوں سے مزین ہوتی ہے، کیسے ممکن ہے کہ ادب کو متاثر نہ کرے یا ادب تاریخ کو اپنے اندر جگہ نہ دے۔ کیا ادب میں تاریخی حوالوں کی کثرت تاریخی شعور کے اظہار کا ذریعہ ہے؟ ادبی تخلیقات میں تاریخی شعور کی نشاندہی کیسے ممکن ہے؟ ادبی تخلیقات میں تاریخی شعور کی نشاندہی کے ضمن میں خورشید انور بیان کرتے ہیں: "ادبی تخلیقات میں تاریخی شعور کی نشاندہی کیلئے ہمیں ادب کے مفہوم، تاریخی شعور کے معنی اور تخلیقات میں تاریخی شعور کی نوعیت سے بحث کرنی ہوگی۔"(۲۷) ادب میں تاریخی شعور کی نشاندہی کے لیے ادب کے معنی و مفہوم سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ ہمیں علم ہو کہ ادب کا بنیادی مقصد کیا ہے اور اس میں کس نوعیت کا پیرایہ اظہار کیا گیا ہے۔ ادب کے معنی و مفہوم سے کماحقہ آگاہی کے بعد ہم ادبی تخلیقات میں تاریخی شعور کو جانچ سکیں گے۔ تاریخی شعور کے مختلف پہلوؤں کو جاننے کے بعد ہی ادب میں اُسکی تلاش ممکن ہے۔

ادب اور تاریخ کے رشتے کی گہرائی کی نوعیت کے حوالے سے غور کریں تو ادب اور تاریخ علم کی دو مختلف شاخیں ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں کا رشتہ ایک دوسرے سے بہت مضبوط ہے۔ ادب اور تاریخ کا رشتہ جتنا مضبوط ہو گا، ادبی تخلیقات میں تاریخی شعور کی بنیاد بھی اُتنی ہی پائیدار ہو گی۔ تاریخی شعور کی بنیاد، ادب اور تاریخ کے باہمی رشتے میں ہی مضمر ہے۔ ادب تاریخ کے کن پہلوؤں کو بیان کرے اور کن پہلوؤں کو نظر انداز کرے؟ وہ کون سے عوامل ہیں جو تاریخ کا بیان ادب میں کرتے ہوئے، ایک ادیب کو ملحوظ خاطر رکھنے چاہئیں؟ کیا تمام واقعہ کو پوری جزئیات کے ساتھ بیان کر دینا چاہیے کہ اُس میں ضروری و غیر ضروری تمام معلومات کا احاطہ کرنا لازم ہے؟ اس حوالے سے "خورشید انور" بیان کرتے ہیں: "ادب میں تاریخی شعور کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ ادب میں پورے سماج انسانی کی یا مختلف ادوار کی سلسلہ وار تاریخ بیان کی جائے بلکہ ادب میں تاریخی شعور سے مراد مختلف سماجی حقیقتوں کی صحیح سمجھ اور اُن حقیقتوں کا پُر اثر اظہار ہے۔"(۲۸) ادب میں تاریخی شعور کے اظہار کیلئے پورے معاشرے کی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ماضی کے تمام ادوار کو بہ اعتبار زمانہ بیان کیا جانا چاہیئے۔ ورنہ ادب اور تاریخ میں فرق بالکل ختم ہو کر رہ جائے گا۔

ادبی تحریروں اور ادبی تخلیقات میں تاریخی شعور کی وضاحت کی غرض سے تاریخ اور ادب کے باہمی تعلق کی وضاحت ضروری ہے۔ تاریخ کا موضوع حضرت انسان ہے اور ادب کا موضوع بھی انسان اور انسان سے متعلق مختلف عوامل ہیں۔ ادب کا تصور معاشرے کے بغیر محال ہے، اسی طرح تاریخ کی بنیاد بھی معاشرہ ہی ہے۔ انسان،

سماج کا بنیادی عنصر ہے اور تاریخ بھی سماج اور انسانوں سے متعلق ہی رقم ہوتی ہے۔ کمال اس بات میں ہے کہ ادب میں ماضی کو اور ماضی سے متعلق حالات و واقعات، شخصیات اور دیگر عوامل کو کس خوبی اور ہنر سے پیش کیا گیا ہے۔ وہی ادب آج تک زندہ ہے جس میں تاریخ کو ایسے پیش کیا گیا ہو کہ وہ ادب اپنے دور کی زندہ جاوید تصویر بن جائے۔ ہندی نقاد تری بھون سنگھ کا کہنا ہے: تاریخ پر نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جس ادب میں اپنے عہد کی بہترین تصویر پیش کی گئی ہے، وہی ادب بہترین ادب بن کر آج تک زندہ رہ سکا ہے۔"(۲۹)

ناول، ادب کی ایسی صنف ہے، جس میں انسان اور انسان سے متعلق مختلف موضوعات، واقعات اور حقائق بہت خوبی کے ساتھ پیش ہوتے آئے ہیں۔ تاریخی ناول میں ادبی مقاصد کے ساتھ ساتھ تاریخی تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں۔ تاریخی ناول میں تاریخ کے مخصوص دور کو پیش کرتے ہوئے اُس مخصوص تاریخی دور کی روح، آداب اور معاشرتی زندگی کو تمام حقیقتوں کے ساتھ پیش کیا جانا ضروری ہے۔ اس میں اصل تاریخی شخصیات اور اصل تاریخی واقعات کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ تاریخی ناول میں زیادہ تر گذشتہ معاشرے کی وسیع تناظر میں تصویر کشی کی کوشش کی جاتی ہے۔ گذشتہ معاشرہ، جس میں عظیم واقعات، افسانوی افراد کی ذاتی زندگی کو متاثر کرتے ہوئے اپنا عکس چھوڑتے ہیں۔ تاریخی ناول میں کتنا عرصہ قبل کے واقعات کو موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے ہسٹاریکل ناول سوسائٹی کے مطابق:" تاریخی ناول کو واقعہ کے کم از کم پچاس سال بعد تحریر میں لانا چاہیے۔"(۳۰) جبکہ لائنڈا ایڈیمسن (Lynda Adamson) کے نزدیک:" تاریخی ناول ایسا ناول ہے جسے واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے پچیس سال بعد احاطہ تحریر میں لایا جائے۔"(۳۱) عالمی ادب میں تاریخی نثر اور ناول کی ایک طویل روایت ملتی ہے۔ مغرب میں تاریخی نثر کی بنیاد اور جڑیں انیسویں صدی کے اوائل میں ملتی ہیں جس میں سر والٹر اسکاٹ (Sir Walter Scott)(۱۷۷۱۔ ۱۸۳۲) اور اُن کے معاصرین، مختلف قوموں کے ادب سے وابستہ لوگ سامنے آئے۔ فرانسیسی ادب سے آنرے ڈی بالزک (Honor'e de Balzac) (۱۷۹۹۔ ۱۸۵۰) امریکی ادب سے جیمز فینی مور کوپر (Jams Fenimore Copper)(۱۷۸۹۔۱۸۵۱) اور روسی ادب سے لیو ٹالسٹائی (Leo Tolstoy) (۱۸۲۸۔ ۱۹۱۰) کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

مارگریٹ اینی ڈوڈی (Margaret Anne Doody) کے مطابق" کلاسیکل یونانی ناول نگار بھی ماضی کے لوگوں اور جگہوں کے حوالے سے لکھنے کا بہت اشتیاق رکھتے تھے۔"(۳۲) یونانی ناول نگاروں نے بہترین ناول تحریر کیے جس میں ماضی کے لوگوں، شخصیات، واقعات و سانحات کا ذکر اس خوبی سے کیا ہے کہ وہ ناول آج کلاسیک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں انگلستان سے تعلق رکھنے والے بہت سے معروف ناول نگاروں نے تاریخی ناول تحریر کیے۔ ان میں ولیم تھیکرے (William Thackeray)، (۱۸۱۱۔ ۱۸۶۳)، چارلس ڈکنز

(Charles Dickens)(۱۸۱۲۔۱۸۷۰) جارج ایلیٹ(George Eliot) (۱۸۱۹۔۱۸۸۰) اور چارلس کنگ سلے (Charles Kingsley) (۱۸۱۹۔۱۸۷۵) نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ انیسویں صدی عیسوی میں رومانوی تاریخی ناول کے حوالے سے وکٹر ہیوگو(Victor Hugo) (۱۸۰۲۔۱۸۸۵) نے بہت شہرت حاصل کی۔ مغرب میں بیسویں صدی میں تاریخی ناول نگاروں میں ایک اہم نام جرمن مصنف تھامس مین Thomas) (Mann(۱۸۷۵۔۱۹۵۵) کا سامنے آتا ہے۔ بلغاریہ سے تعلق رکھنے والی ناول نگار فانی پوپوا میوٹا فووا Fani) (Popova-Mutafova(۱۹۰۲۔۱۹۷۱) کے تاریخی ناولوں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ جین چینس Jane) (Chance کے مطابق: "فانی پوپوا کے ناولوں کو سب سے زیادہ فروخت ہونے والے بلغاریہ ناولوں کا اعزاز حاصل ہے۔" (۳۳) برطانوی ناول نگاروں میں رابرٹ گریوز(Robert Graves) (۱۸۹۵۔۱۹۸۵) نے بہت سے تاریخی ناول تحریر کیے جنہیں کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔

تاریخی ادب نے ہمیشہ لوگوں میں حب الوطنی کے جذبات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سر والٹر اسکاٹ کے ناولوں نے لوگوں میں اسکاٹش تاریخ کو جاننے اور پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔ اسی طرح ہر تہذیب اور ہر خطے سے تعلق رکھنے والے ناول نگاروں نے اپنے بہترین تاریخی فن پاروں کے ذریعے اپنے ماضی کے اُن تاریک پہلوؤں کو روشن کیا کہ جہاں تک لوگوں کی رسائی نہیں تھی۔ لوگ تاریخ کی کتب پڑھنے سے جلد اکتا جاتے ہیں۔ ایسے میں تاریخی ادب اور ناول لوگوں میں تاریخ کو پڑھنے اور سمجھنے کا شعور بیدار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی ناولوں نے ہر معاشرے اور ہر دور پر اپنے گہرے اثرات مُرتب کیے ہیں اور قارئین کو ہر دور میں متاثر کیا ہے۔

اردو ناول میں تاریخی شعور

پہلا دور (نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور)

مغربی ناول نگاروں نے تاریخی ناولوں کے ذریعے ماضی کو زندہ کیا۔ ماضی کے لوگ، معاشرہ، طرز زندگی، ماضی کے اہم واقعات اور سانحات کو تاریخی ناولوں میں بیان کر کے لوگوں کو اُن کی روایت سے جوڑا گیا۔ ہر دور اور ہر معاشرے کے ادب میں ماضی کو شاندار اور خوبصورت دکھانے کے ساتھ ساتھ ماضی میں ہونے والی کوتاہیوں کو بھی پیش کیا گیا۔ عروج کے ساتھ ساتھ زوال، بلندی کے ساتھ ساتھ پستی کو بھی ادب میں جگہ دی گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ سے قبل اردو ادب میں قصے، کہانیاں، تمثیلیں، حکایتیں اور داستانوں کا عروج تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں مسلمانوں کو بُری طرح شکست ہوئی اور مُسلم اقتدار کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا اور انگریز کا اقتدار قائم ہوا۔ اس جنگ کے اختتام کے

بعد مسلمانوں کو انگریز نے اپنے عتاب کا نشانہ بنایا۔ کرم حیدری لکھتے ہیں: "انتقام لینے میں انگریز سب سے آگے نکل گئے۔ ہر انگریز مقتول کے بدلے ایک سو ہندوستانیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ (۳۴)انگریز نے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں فتح کے بعد ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں پر ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا۔ مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا اور اُن کیلئے معاشی و معاشرتی زندگی کے تمام معاملات میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ مسلمانوں کو اُن کے جائز حقوق سے دستبردار کر دیا گیا۔ پروفیسر احمد سعید جنگِ آزادی ۱۸۵۷ کے بعد شکست خوردہ مسلمانوں کی حالتِ زار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ حد تک خراب ہو چکی تھی۔ انگریز اُن کو ہندوستان میں اپنی سلطنت کیلئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی ہر ممکن سعی کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مسلمانوں کے لیے آفات و مُشکلات کا سر چشمہ ثابت ہوئی۔ مُسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔"(۳۵)

۱۸۵۷ء کی جنگ میں شکست سے جہاں مسلمانوں کا تقریباً ساڑھے چھ سو سالہ (۱۲۰۶۔۱۸۵۷) دورِ حکومت ختم ہُوا، وہاں مسلمانوں کی طویل غلامی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ مسلمانوں سے اُن کے عہدے چھین کر انگریز نے انہیں کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ نے پورے ہندوستان میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس جنگ نے نہ صرف لوگوں کی تہذیب و معاشرت اور رہن سہن پر اپنے اثرات مرتب کیے بلکہ ادب کو بھی متاثر کیا۔ ان مشکل حالات میں سر سید احمد خان ایک مُصلح کے روپ میں سامنے آئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ترقی یافتہ قوم بنانے کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ سر سید کی اصلاحی تحریک نے جہاں مسلمانوں کی زندگیوں پر مثبت اثرات مرتب کیے، وہیں ادب کو بھی خاطر خواہ کامیابی ملی اور نئی نئی اصناف کا وجود ہوا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں: "موجودہ اردو نثر نے جو ترقی کی ہے، اس کی ابتداء علی گڑھ تحریک کے اثرات کے ماتحت ہوئی تھی۔"(۳۶) سر سید احمد خان اور اُن کے رفقاء الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، نذیر احمد دہلوی، محسن اُلملک، وقار اُلملک، وحید الدین سلیم نے مُسلمانانِ ہند کی تعلیم و ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ سر سید نے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا، جس میں سٹیل اور ایڈیسن کی تقلید کرتے ہوئے مسلمانوں کی بہتری و فلاح کے نقطہ نظر سے مضامین تحریر کئے گئے۔

مولوی نذیر احمد

مولوی نذیر احمد (۱۸۳۰۔۱۹۱۲) نے سب سے پہلے اُردو ادب میں ناول نگاری کا آغاز کیا اور ۱۸۶۹ء میں اپنا پہلا ناول مراۃ العروس تحریر کیا۔ کچھ ناقدین کے نزدیک مولوی نذیر احمد کے ناول، جدید ناول کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے، اس حوالے سے ڈاکٹر محمد احسن فاروقی لکھتے ہیں:

"اصلاح موعظت مولوی نذیر احمد کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اُن کی بچیاں جب لکھنے پڑھنے کے قابل ہو گئیں تو کوئی کتاب اُردو میں ایسی نہ ملی جو اُنہیں اُمور خانہ داری اور عام اخلاقیات کا درس اس طرح دے سکتی جن میں اُن کم عمر بچیوں کو بھی دلچسپی ہوتی۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد نے خود ایک قصہ گھڑا۔ جس کے اجزاء وہ روزانہ لکھ کر بچیوں کے پڑھنے کیلئے دے دیتے تھے۔ یہی اجزاء مکمل ہو کر مراۃ العروس کے نام سے طبع ہوئے۔"(۳۷)

مولوی نذیر احمد کے ناول اُن کی ذات اور شخصیت کے بھرپور عکاس ہیں۔ مولوی صاحب کے کردار مثالی ہیں۔ جس طرح کا معاشرہ وہ چاہتے تھے، ویسا ہی معاشرہ وہ اپنے ناول میں دکھاتے ہیں۔ نذیر احمد کے ناول میں جگہ جگہ وہ خود بولتے اور نصیحت و وعظ کرتے نظر آتے ہیں۔ زورِ بیان میں جگہ جگہ اُن کے ناولوں میں طویل تقریریں نظر آتی ہیں۔ جس سے ناول اور اُس کے کردار ایک مخصوص پٹڑی پہ چلتے نظر آتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے دیگر ناولوں میں فسانہ مبتلا، بنات النعش، توبتہ النصوح اور ابن الوقت کے نام اہم ہیں۔

اردو ناول کی روایت میں تاریخی نقوش کے حوالے سے ابن الوقت کا ذکر اہم ہے۔ نذیر احمد نے یہ ناول ۱۸۸۸ء میں تحریر کیا۔ نذیر احمد نے ملکی سیاست اور اپنے دور کی ماضی قریب کی تاریخ کو اس ناول میں بطور پس منظر استعمال کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد ہندوستان کے حالات کی تصویر کشی اس ناول میں کی گئی ہے۔ اس ناول کی فضا تاریخی ہے۔ کیا نذیر احمد اس ناول میں تاریخی حقائق کو نبھانے میں کامیاب ہوئے؟ اس کا اظہار رشید احمد گوریجہ نے یوں کیا ہے: "نذیر احمد نے مذہبی فکر کے ذریعے تاریخ کے بدلتے ہوئے رُجحانات کی نفی کرنے کی کوشش کی ہے۔" (۳۸) اس ناول میں نذیر احمد نے جس طرح ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کے رویے اور مسلمانوں کی انگریزوں کے ساتھ یگانگت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے، اسے نقادوں نے اہمیت دیتے ہوئے نذیر احمد کے طرز خیالات اور نظریات کو سراہا ہے۔ انیس ناگی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"فسانہ مبتلا اگر نذیر احمد کی فنی معراج ہے تو ابن الوقت ان کے نظریات کی تکمیل ہے۔ انہوں نے ابن الوقت میں جن تضادات اور ذہنی مجادلوں کو جس سطح پر پیش کیا ہے، وہ ان کی ذہنی رفعت، بالغ نظری اور عمیق ہمعصری شعور پر دلالت کرتی ہے۔ "ابن الوقت" تاریخی اور تمدنی دستاویز ہونے کے علاوہ اردو ناول کی فنی روایت میں تصور سے واقعہ کی تشکیل اور کرداروں کی تعمیر کی طرف پہلی کامیاب کوشش ہے۔" (۳۹)

۱۸۵۷ء کی جنگ کا سارا ملبہ مسلمانوں پر گرا، اس جنگ کا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دیا گیا۔ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں سے گیا تھا اور جنگ کے بعد عتاب کا نشانہ بھی مسلمان بنے۔ ابن الوقت میں نذیر احمد نے شعوری کوشش کرتے ہوئے مسلمانوں کو غدر سے بری الذمہ قرار دینے کی سعی کی ہے۔ انگریزوں کی مخصوص ذہنیت،

مسلمانوں کے ساتھ اُن کا تحقیر آمیز رویہ اُس دور کی مخصوص طرز معاشرت، ان سب کا اظہار ابن الوقت میں کیا گیا ہے۔ یہ ناول اپنے دور کے تاریخی شعور کا ترجمان نظر آتا ہے۔ نذیر احمد کے ناول اگرچہ فنی لحاظ سے ناول کے مخصوص پیمانے پر پورے نہ اُترتے ہوں مگر اُن کے تمام ناولوں میں ہمیں تاریخ کا ایک نقش، ایک عکس، کہیں واضح کہیں دھندلا ضرور نظر آتا ہے۔ مراۃ العروس،بنات النعش،فسانہ مبتلا میں ہمیں نذیر احمد کے دور کی مخصوص معاشرت، طرز زندگی، رسم ورواج، تہذیب، رہن سہن، کھانے، زبان، لباس، ادب آداب، طور طریقے، سلیقہ، معاشرتی حالات، گھریلو زندگی، سبھی کی بہترین عکاسی نظر آتی ہے۔ ابن الوقت میں مخصوص دور کی سیاسی زندگی، اُس دور کی تاریخ کو واضح کرتی ہے۔ بہت سی فنی خامیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ نذیر احمد کے ناول ابتدائی طور پر تاریخی شعور کے حامل ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار

نذیر احمد کے پہلو بہ پہلو ہمیں پنڈت رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶۔۱۹۰۳) نظر آتے ہیں۔ سرشار نے بحیثیت مدیر ''اودھ'' اخبار میں ملازمت کی۔ اس دوران انہوں نے لکھنوی زندگی کی تہذیب و معاشرت اور رہن سہن پر چند فکاہیہ کالم تحریر کئے۔ آزاد کے ان فکاہیہ کالموں کو عوام میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک سال تک سرشار نے یہ کالم تحریر کئے اور پھر ۱۸۸۰ء میں انہیں فسانہ آزاد کا نام دیتے ہوئے کتابی شکل میں شائع کروادیا۔ فسانہ آزاد اڑھائی ہزار صفحات کا ضخیم ناول ہے۔ یہ ناول واقعات کا جنگل ہے۔ ہر واقعہ اپنی جگہ پر خاص لطف اور مزہ رکھتا ہے۔ مگر ناول میں ربط ضبط کی کمی ہے۔ رام بابو سکسینہ تاریخ ادب اُردو میں فسانہ آزاد کے حوالے سے پنڈت بشن نرائن کے بیان کا حوالہ یوں دیتے ہیں:

> ''قصہ کا پلاٹ تو بہت سادہ بلکہ حد درجہ بے مزہ ہے مگر اڑھائی ہزار گنجان صفحے پڑھتے چلے جایئے، ذرا بدمزہ نہ ہویئے گا بلکہ سطر سطر پر اشتیاق بڑھتا جائے گا، محض اس وجہ سے کہ عبارت آرائی غضب کی ہے۔ طرز ادا نہایت بے تکلف اور آسان، تازہ اور نیچرل، تمثیلی اور واضح۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ جا بجا پر لطف ظرافت، پھڑکتے ہوئے فقرے، مزیدار شوخیاں، ترکی بہ ترکی جواب، حماقت آمیز مضحک باتیں جن کو پڑھ کر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔'' (۴۰)

سرشار کی چُست اور آرائشی نثر جہاں بیان میں روانی پیدا کرتی ہے۔ وہیں قصے کا لطف اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ ۱۸۵۶ء میں سقوط لکھنو کا دردناک سانحہ پیش آیا، جس نے لکھنو کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کو تباہ کرکے رکھ دیا۔ بادشاہ واجد علی شاہ کی حکومت کو زوال ہوا اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ لکھنو کی معاشرت زوال کا شکار ہوگئی۔ عوام پر بھی ایک بے حسی کی کیفیت طاری تھی۔ فسانہ آزاد میں سرشار نے لکھنو کی زوال پذیر تہذیب پر طنز کے تیر

برسائے ہیں۔ اخلاقی طور پر عوام کی پس ماندگی کا ذکر مزاح کے پیرائے میں کیا گیا ہے۔ سقوط لکھنو کی حقیقی تصویر کشی ہمیں فسانہ آزاد میں نظر آتی ہے۔ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ اس حوالے سے بیان کرتے ہیں:

"سرشار کے عہد میں ایک تاریخی عہد دم توڑ رہا تھا۔ دوسرا تاریخی عہد اس کی کوکھ میں جنم لے رہا تھا۔ ۱۸۵۶ء کے فوراً بعد لکھنو کو جس طرح آزاد نے پیش کیا ہے۔کوئی مورخ بھی ایسے پر اثر انداز میں تاریخ بیان نہیں کر سکتا۔ سرشار نے صرف قصہ ہی تخلیق نہیں کیا بلکہ اس قصہ سے تنقید حیات کا کام بھی لیا ہے اور اپنے دور کی تاریخ بھی قلم بند کر لی ہے۔"(۴۱)

یہ بات دُرست ہے کہ سرشار نے اپنے عہد کے زوال پذیر لکھنو کو بہت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ فسانہ آزاد کے کردار، واقعات ہمیں حقیقی معلوم ہونے لگتے ہیں گویا ہمارے سامنے چلتے پھرتے کردار ہوں۔ واقعات حقیقی زندگی کے قریب ترین معلوم ہوتے ہیں۔ سرشار نے اپنے عہد کی سچی تصویر کشی اور منظر نگاری کی ہے۔ تاریخی ناول تحریر کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ ناول نگار تاریخ کو بیان کرتے ہوئے لوگوں تک حقائق کو اصل صورت میں پہنچانے کا امین ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے اصل واقعہ، جگہ، کردار اور صورتحال میں تبدیلی کا مجاز نہیں ہوتا۔ تاریخی ناول نگار اپنے ناول میں تخیل کی جولانی دکھاتا ہے مگر صرف اس حد تک کہ حقائق کسی صورت مسخ نہ ہونے پائیں بلکہ اور زیادہ نکھر کر سامنے آسکیں۔ تاریخی ناول کا مقصد قاری کو اکتاہٹ کا شکار کرنا ہرگز نہیں بلکہ حقائق میں تخیل کی جائز آمیزش سے اُس کے تجسس کو اور زیادہ بڑھانا ہے کہ ناول میں قاری کی دلچسپی قائم رہے نہ کہ سچائی کو مسخ کر کے قارئین کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا ہے۔ سرشار منظر نگاری تو خوب کرتے ہیں لیکن مختلف علاقوں، معاشروں اور ملکوں کی تہذیب و معاشرت اور فضا کو لکھنوی تہذیب و معاشرت کے لبادے اوڑھا دیتے ہیں۔فسانہ آزاد میں بیان کردہ ترکی کی فضا میں ہمیں لکھنو کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔

عبدالحلیم شرر

اردو میں تاریخی ناول نگاری کے ضمن میں عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰۔۱۹۲۶) کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ اردو میں تاریخی ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز کرنے والے عبدالحلیم شرر ہیں جنہوں نے بہت سے تاریخی ناول تحریر کیئے اور مُسلم تاریخ کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ شرر نے ناول نگاری میں تاریخی ناول کو ہی کیوں چُنا؟ اس حوالے سے پروفیسر اشتیاق طالب لکھتے ہیں:"تاریخی ناول لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جنگِ آزادی کے بعد مسلمان افسردہ دلی ،مایوسی اور سراسیمگی کا شکار ہو کر رہ گئے تھے شرر نے نہ صرف انہیں مایوس کن فضا سے نکالنے کی کوشش کی بلکہ وہ اُن میں نئے عزائم، جوش و شجاعت کے جذبے اور نئی توانائی پیدا کرنا چاہتے تھے۔"(۴۲)

عبدالحلیم شرر کا مقصد تاریخی ناول نگاری کے ذریعے مسلمانوں کو اُن کے بزرگوں کا شاندار ماضی یاد دلانا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ناکامی کے بعد مُسلمان شدید معاشرتی زوال کا شکار ہو گئے تھے اور انہیں ہر طرف سے

صرف مایوسی نظر آرہی تھی۔ یہ بات ہمیشہ دیکھی گئی ہے کہ ادب نے ہمیشہ مایوس کن حالات میں اپنے پڑھنے والوں کی دل جوئی کی ہے اور ادیب کا مقصد ہمیشہ سے لوگوں کو ایک نئی امید جگا کر انہیں تازہ دم کرنے کا رہا ہے۔ یہ طریقہ کار عبدالحلیم شرر کے پیشِ نظر رہا۔ اُنھوں نے تاریخی ناولوں کے ذریعے مایوسی اور ناامیدی میں ڈوبی قوم کے سامنے اُن کا ورثہ، اُن کا ماضی لا کھڑا کیا۔ تاکہ لوگوں میں نیا جوش، ولولہ اور انگریز سے لڑنے کی ہمت پیدا کی جاسکے۔ ۱۸۸۰ء میں منشی نولکشور نے عبدالحلیم شرر کو اودھ اخبار کے ایڈیٹوریل سٹاف میں شامل کر لیا۔ لکھنے لکھانے کا شغف زوروں پر تھا۔ اودھ اخبار کے ذریعے شرر کو اپنے خیالات عوام تک پہنچانے میں بہت آسانی ہوگئی تھی۔ آپ نے اُس عرصے میں بہترین مضامین تخلیق کیے، جو اودھ اخبار میں طبع ہوئے اور مقبول عام ہوتے چلے گئے۔ عبدالحلیم شرر خود رقمطراز ہیں: "میں نے اودھ اخبار اور رسالہ محشر میں بہت سے تاریخی، خیالی اور محققانہ مضامین لکھے، جو ملک میں بہت مشہور ہوئے اور پسند کئے گئے۔" (۴۳) عبدالحلیم شرر کا تعلق لکھنو سے تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں دلی مکمل طور پر تباہ ہوگئی۔ دلی کی رونقیں، محفلیں، علم وادب کے سامان سب لکھنو منتقل ہوگئے۔ شرر نے مسلمانوں کا زوال، انگریز کے مسلمانوں پر مظالم، سب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ سے شرر کو بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ لہذا شرر نے اپنے ناولوں میں تاریخ کے مختلف پہلوؤں اور رنگوں کو جگہ دی۔ شرر نے مسلمانوں کی تاریخ کے ایسے ادوار اور واقعات و شخصیات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا، جن کو پڑھ کر مسلمانوں میں ایک جوش اور ولولہ بیدار ہو، ایک نئی روح پھونکی جاسکے۔ مسلمان اپنے اجداد کے کارناموں کو ناول میں زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھ اور سمجھ سکتے تھے کہ ناول، تاریخ کی کتب کی نسبت زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ معلومات کی فراہمی بھی ممکن ہوتی ہے۔ شرر کے پیشِ نظر قوم کی اصلاح اور اپنی تاریخ سے دلچسپی پیدا کرنا تھا۔ اُنھوں نے اس نقطہ نظر کے تحت مسلمانوں کے ماضی کے روشن پہلوؤں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ اس حوالے سے مولانا صلاح الدین احمد لکھتے ہیں:

> "شرر نے اپنے موضوع کے انتخاب میں بڑی زمانہ شناسی اور دور بینی سے کام لیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کے زوال سیاست کے ذہنی ردِ عمل سے پورا فائدہ اٹھایا۔۔۔ ستاون کے ناکام ہنگامہ آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمان اس ملک میں کسی سیاسی تفوق کے تخیل سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ ان کا حال اور مستقبل دونوں غیر یقینی اور مایوس کن تھے۔ اس لیے فطری طور پر اُن کی روحانی نظریں بار بار اپنے شاندار ماضی کی طرف اٹھتی تھیں۔ شرر کی دانش وری نے یہ نکتہ پالیا۔" (۴۴)

عبدالحلیم شرر نے باقاعدہ تاریخی ناول نگاری پر توجہ مرکوز کی اور مسلمانوں کی جذباتی تسکین کا خاطر خواہ لحاظ رکھا۔ شرر کا ناول ملک العزیز ورجنا ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ یہ شرر کا تاریخی ناول ہے جس نے اردو ادب میں تاریخی ناول نگاری کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ اس کے ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے بھی یہ ناول پہلے اردو ناولوں کے مقابلے

میں کامیاب رہا۔ اس ناول میں مسلمانوں کی فلسطین میں اسلامی جدوجہد اور کامیابی کو موضوع بنایا گیا ہے کہ کس طرح سلطان صلاح الدین نے عیسائیوں کا مقابلہ کیا نیز صلیبی جنگوں کا بیان بہت خوبی سے کیا گیا ہے۔ ناول حسن انجلینا ۱۸۸۹ء میں سامنے آیا۔ اس ناول کا اہم موضوع ایرانیوں اور ترکوں کے سُنّی شیعہ اختلافات اور مسلمانوں کے انتشار کے منفی اثرات نیز رومیوں کے خلاف ترکوں کی جرأت و بہادری کے واقعات ہیں۔ منصور موہنا شرر کا تیسرا ناول ہے جو ۱۸۹۰ء میں طبع ہوا۔ پہلے ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی تاریخی شعور ملتا ہے۔ اس ناول میں شرر نے مسلمانوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کیلیے سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان میں حق و باطل کے معرکوں کو موضوع بنایا ہے جبکہ محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ تاریخی پس منظر کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ فلورا فلورنڈا ناول ۱۸۹۶ء میں سامنے آیا۔ اس ناول کا موضوع "عبد الرحمٰن ثانی" کا تاریخی عہد ہے۔ اس ناول میں عیسائیوں اور اسلام دشمنوں کی مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جب مسلمانوں کی سپین میں اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ دو جلدوں پر مشتمل شرر کا پانچواں تاریخی ناول ایام عرب ہے جو ۱۸۹۸ء۔۱۸۹۹ء کے عرصے میں شائع ہوا۔ اس ناول میں اسلام کی آمد سے قبل دور جہالت کے تاریخی واقعات نیز عرب کی اُس دور کی معاشی، معاشرتی، تہذیبی و تمدنی حالت کو موضوع بنایا گیا ہے اور تاریخ کے اوراق سے پردا اٹھایا ہے۔ نیز آمدِ اسلام سے عرب کی بتدریج بہتر ہوتی ہوئی صورتحال کا احاطہ کیا گیا ہے۔ فردوس بریں ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں ۶۵۱ھ سے ۶۵۴ھ کا تاریخی دور دکھایا گیا ہے کہ کس طرح فرقہ باطنیہ کے فدائیوں نے اپنے شر پسند عناصر اور طریقہ کار کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کو زمین پر فرضی جنت کے حیلوں سے شدید نقصان پہنچایا۔ اس ناول میں فرقہ باطنیہ کا تاریخی پس منظر، سرگرمیاں، حسن بن صباح کا شر پسند کردار اور بالآخر ہلاکو خان کے ہاتھوں باطنی فرقے کی تباہی کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مقدس نازنین ناول ۱۹۰۰ء میں طبع ہوا۔ اس میں پاپائیت و مسیحیت سے متعلق پر اسرار واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک نیم تاریخی ناول ہے۔ شوقین ملکہ ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں ۵۳۹ھ کے تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں۔ اس میں عماد الدین زنگی اور صلیبی جنگوں کے واقعات رقم ہیں۔ فتح اُندلس ۱۹۰۷ء میں سامنے آیا۔ اس ناول میں مسلمانوں کی جرأت و بہادری کے واقعات قلم بند کئے گئے ہیں کہ کس طرح مسلمانوں نے دلیری و بہادری سے صدیوں تک ہسپانیہ میں حکومت کی۔ قیس و لبنیٰ ۱۹۰۷ء میں طبع ہوا۔ اس ناول کا پس منظر و پلاٹ رومانوی ہیں۔ اس ناول میں حضرت امیر معاویہؓ کے عہد کے تاریخی واقعات رقم ہیں۔ ماہِ ملک شرر کا گیارہواں ناول ہے جو ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں شرر نے تصرف سے زیادہ کام لیا ہے اور چند تاریخی واقعات کے علاوہ باقی تمام واقعات فرضی و خیالی ہیں۔ فلپانا ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں موضوع حضرت

عثمانؓ کی خلافت کے تاریخی واقعات اور جنگ طرابلس ہے۔زوالِ بغداد شرر کا تاریخی ناول ۱۹۱۳ء میں طبع ہوا۔ اس ناول میں تیرھویں صدی عیسوی میں خلافت بغداد کا انتشار، مسلمانوں میں فرقہ ورانہ تعصّبات و فسادات کو موضوع بناتے ہوئے شرر نے بغداد کے زوال اور تباہی کا ذمہ دار مسلمانوں کے آپس کے اختلافات کو قرار دیا ہے۔رومتہ الکبریٰ ناول ۱۹۱۳ میں طبع ہوا۔ جس میں شرر نے اسلام کی آمد سے قبل ابتدائی پانچویں صدی عیسوی تک کے روم کے سیاسی، اقتصادی و مذہبی حالات رقم کیے ہیں۔یوسف و نجمہ ایک ناول نیم تاریخی ہے اور ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں سلطان فیروز شاہ تغلق کے تاریخی دور کا ذکر کیا گیا ہے۔الفانسو ناول ۱۹۱۵ء میں طبع ہوا۔ اس ناول میں "سسلی" کے ایک بادشاہ کے نیم تاریخی واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سسلی کے بادشاہوں کا خطاب "الفانسو" تھا۔

فاتح مفتوح ۱۹۱۶ء میں طبع ہوا۔ اس ناول میں شرر نے دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں کی فتوحات کو موضوع بناتے ہوئے مختلف ممالک میں مسلم حکومت کا ذکر کیا ہے۔بابک خرمی ناول ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع عباسی دور میں سر اٹھانے والی بہت سی ملحدانہ تحریکیں ہیں۔ تاریخی نوعیت اور حوالوں کے اعتبار سے شرر کا یہ ناول کافی مستند تصور کیا جاتا ہے۔جویائے حق تین حصّوں پر مشتمل شرر کا طویل ناول ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں قبل از اسلام عیسائیوں و عربوں کے عقائد و معاشرتی حالات، حضور پاک ﷺ کی سیرت طیبہ، حضرت سلمانؓ کی سوانح نیز حضرت عمرؓ کا عہد بھی بیان ہوا ہے۔

لعبت چین ۱۹۱۹ء میں طبع ہوا۔ اس ناول میں پہلی صدی ہجری کے تیسرے ربع کی تاریخ شامل ہے۔ اس میں موسیٰؑ کی جد وجہد نیز مسلمانوں کی کوششوں کا ذکر اور عربوں و ترکوں کی جنگوں کا ذکر ہے۔عزیزہ مصر ناول ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں احمد بن طولون کے دور کے واقعات رقم ہوئے ہیں۔ اس ناول میں شرر نے حقیقت اور تخیل دونوں سے کام لیا ہے۔مینا بازار ۱۹۲۵ء میں سامنے آیا۔ اس میں شرر نے حقیقت سے زیادہ فسانہ طرازی سے کام لیا ہے اور شاہجہان کے عہد کی معاشرتی زندگی اور حالات بیان کیے ہیں۔

شرر کے تاریخی ناولوں کا جائزہ لینے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ شرر نے مسلمانوں سے وابستہ تاریخی واقعات، فتوحات اور کارناموں کو نمایاں مسلم شخصیات اور سلاطین کو، اسلامی تاریخ اور اسلامی روایت کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ شرر کے ناولوں نے بہت مقبولیت حاصل کی اور مسلمانوں کا اپنے ماضی سے رشتہ مضبوط بنایا۔ شرر وہ پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے تاریخ کو اپنے ناولوں میں زندہ کر کے اُردو ادب میں تاریخی ناول نگاری کا آغاز کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد مسلمانوں کی ذہنی وجذباتی حوالے سے دلجوئی کو ادیبوں نے اپنا نصب العین بناتے ہوئے تاریخی ناول نگاری کے ذریعے مسلمانوں کو اُن کے روشن ماضی کے حوالے یاد دلائے۔

محمد علی طیب

عبد الحلیم شرر کے معاصر ناول نگار محمد علی طیب کا نام بھی اسی زمرے میں آتا ہے جنھوں نے شرر کے مقابل تاریخی ناول تحریر کیے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری اس حوالے سے لکھتے ہیں: "اُدھر شرر کا ناول دلگداز میں چھپتا، اُدھر محمد علی طیب مرقع عالم میں ایک ناول چھاپ لیتے۔" (۴۵) محمد علی طیب نے تاریخی ناول نگاری کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اردو میں ایسے ناول تحریر کرنے چاہئیں جن کو پڑھ کر عامتہ الناس میں مذہبی جوش و خروش پیدا ہو اور اپنے سے پہلے کے لوگوں کے سچے کارنامے ایک طرف ہمارے دل میں ایمان کا جوش بیدار کریں دوسری طرف با مقصد تفریح بھی حاصل کریں۔ ہم نے تاریخ کو ناول کے روپ میں پیش کرنے کا تہیہ اس لیے کیا ہے کہ آج کے لوگ اپنی تاریخ دلچسپ انداز میں پڑھنا چاہتے ہیں۔" (۴۶)

محمد علی طیب کا تاریخی ناول نگاری شروع کرنے کا مقصد شرر سے ملتا ہوا ہے کہ مسلمانوں کو جذباتی طور پر سہارا دینا اور انہیں ذہنی انتشار سے نکال کر اُن میں نئی زندگی کی روح پھونکنا اور ایسا تبھی ممکن تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کو ناول کی صورت میں دلچسپ بنا کر پیش کیا جائے۔ تفریح کے ساتھ ساتھ اصلاحی مقصد بھی پورا ہوتا رہے۔ محمد علی طیب کے ناولوں میں عبرت، دیول دیوی اور جعفر و عباسیہ تاریخی ناول ہیں، جنہیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ محمد علی طیب کے ناول عبــــرت کو نسبتاً زیادہ پذیرائی ملی۔ یہ ناول مرقع عالم میں ۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۲ء تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد کتابی صورت میں ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں اٹلی کی سرزمین پر کہانی بُنی گئی ہے۔ یہاں محمد علی طیب نے مسلمانوں کے جوش و خروش کو بڑھانے کے مقصد سے قطع نظر کرتے ہوئے اسلامی تاریخ و اسلامی واقعات کو موضوع بنانے کی بجائے ایک دوسرے ملک کی سرزمین کو اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔ جس سے قارئین کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے۔ جبکہ کردار اور اُن کے نام بھی غیر ملکی ہوں تو اپنائیت کا احساس قائم کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ لیکن یہاں طیب ایک اور غلطی کرتے نظر آتے ہیں۔ فضا تو انہوں نے اٹلی کی دکھائی ہے جبکہ کرداروں کی بات چیت اور واقعات کی فضا خالص ہندوستانی ہے جس سے ناول میں تضاد کی کیفیت نظر آتی ہے۔ محمد علی طیب کا دوسرا تاریخی ناول جعفــر و عباســیہ کا موضوع ایک تاریخی مفروضہ ہے کہ جعفر اور ہارون کی بہن عباسیہ کے معاشقہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جس کی سند تاریخ میں موجود نہیں۔ خلیفہ ہارون الرشید اور بغداد کا ذکر پس منظر میں آتا ہے۔ یہ ایک نیم تاریخی رومانوی ناول ہے۔ تیسرا ناول خضر خان دیول دیوی ہمارے سامنے آتا ہے۔ ناول میں ہندوستان کی فضا، رہن سہن اور تہذیب و معاشرت کے نقشے خوبی سے کھینچے گئے ہیں

مگر محمد علی طیب نے خیال آرائی سے زیادہ کام لیا ہے جس نے اُن کے تاریخی ناولوں میں بہت سی خامیاں پیدا کر دی ہیں۔

علامہ راشد الخیری

علامہ راشد الخیری(۱۸۶۸۔۱۹۳۶) کا نام عبدالحلیم شرر کے معاصرین میں سے ایک ہے، جنہوں نے تاریخی ناول نگاری کی روایت میں اپنا حصہ ڈالا اور اُسے آگے بڑھایا۔ نذیر احمد دہلوی سے محمد علی طیب تک، تاریخی ناولوں کے ضمن میں ان ناول نگاروں کی مقبولیت نے راشد الخیری کو تاریخی ناول نگاری پر اُکسایا۔ راشد الخیری کو ''مُصورِ غم'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس خطاب کے ملنے کی وجہ راشد الخیری کا طبقہ نسواں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا دردناک لہجے میں بیان ہے۔ راشد الخیری کا پہلا تاریخی ناول شاہین و دُراج ۱۹۰۸ء میں طبع ہوا۔ اس ناول میں ملکہ شاہین کا معاشقہ ایک دیہاتی دراج سے دکھایا گیا ہے۔ ملکہ شاہین سے نسبت کی بناء پر اسے تاریخی ناول قرار دیا گیا۔ ماہ عجم ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع ایران کا تاریخی وسیاسی پس منظر، حضرت عمرؓ کے دور کی ایرانی فتوحات ہیں۔

اٰفتاب دمشق ۱۹۱۸ء میں سامنے آیا۔ اس ناول میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ابتدائی عہد کے واقعات اور معرکہ آرائیاں نیز فتح شام کو موضوع بنایا گیا ہے۔ محبوبہء خداوند ناول ۱۹۱۹ء میں سامنے آیا۔ اس ناول میں علامہ نے حضرت عثمانؓ کا عہد اور ملکِ طرابلس سے وابستہ واقعات کو بیان کیا ہے۔ عروسِ کربلا ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں علامہ کا تاریخی شعور وضاحت سے سامنے آیا ہے۔ کیونکہ اس میں بیان کردہ واقعات مستند ہیں۔ اس میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت امیر مُعاویہؓ اور حضرت امام حُسینؓ کا عہد دکھایا گیا ہے۔ اُندلس کی شہزادی ۱۹۲۰ء میں یہ ناول شائع ہوا۔ اس ناول میں علامہ نے اندلس میں مسلمانوں کے اقتدار کے آخری ایام کو موضوع بنایا ہے۔ درِ شہوار ناول ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ اس کا موضوع ایران اور ماژندران کی باہمی آویزش ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ ایک کمزور ناول ہے۔

یاسمین ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں مسلمانوں کی ایران اور دمشق میں فتوحات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں علامہ نے ۱۲ھ سے ۱۶ھ تک کے واقعات قلم بند کئے ہیں۔ تیغِ کمال علامہ راشد الخیری نے ترکوں کی سیاسی ومعاشرتی زندگی کو موضوع بناتے ہوئے اتاترک پاشا کے عہد کو بیان کیا ہے۔ منظر طرابلس ناول ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں حضرت زبیرؓ کی سربراہی میں فتح طرابلس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ایک عام تاریخی ناول ہے۔ جس میں دلچسپی کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ امینِ کا دمِ واپسیں ۱۹۲۷ء میں یہ ناول شائع ہوا۔ اس ناول میں علامہ نے خلیفہ ہارون الرشید کے بیٹوں امین اور مامون کی آپس میں رنجش اور تخت نشینی کیلئے جنگ کو

موضوع بنایاہے۔وادعِ ظفر ناول ۱۹۲۸ء میں سامنے آیا ہے۔فنّی وادبی حوالے سے یہ علامہ کا بہترین ناول ہے۔ اس میں بہادر شاہ ظفر کے زوال کے واقعات بہت دردناک انداز میں بیان ہوئے ہیں۔علامہ راشد الخیری کا اسلوب نگارش بہترین ہے۔ تاریخی واقعات بھی معروف لیے گئے ہیں۔ مگر علامہ کے ہاں پلاٹ پر گرفت کی کمی کے باعث اُن کے تاریخی ناول بہت اعلیٰ مقام حاصل نہ کر پائے۔

صادق حسین صدیقی سردھنوی

تاریخی ناول نگاری کا ایک اہم حوالہ صادق حسین صدیقی سردھنوی ہیں۔اُن کے ناولوں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ صادق حسین نے اسلامی تاریخ کے اہم واقعات کو اپنے ناولوں کو موضوع بنایا۔خود لکھتے ہیں:"تاریخ یا تاریخی افسانے لکھنے سے ہمارا منشایہ بھی تھا کہ قوم میں بیداری پیدا ہوا اور تاریخ سے دلچسپی لیں تا کہ پستی سے عروج کی طرف گامزن ہو سکیں۔"(۴۷)صادق حسین سردھنوی نے ۸۰ کے لگ بھگ ناول تحریر کیے، جن میں تاریخی واقعات، مسلمانوں کی فتوحات اور اسلامی شخصیات کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔فنی اعتبار سے صادق حسین کے ناول اعلی مقام حاصل نہ کرسکے نیز ان کے یہاں تاریخی واقعات کے بیان میں بھی بہت سی تاریخی لغزشیں نظر آتی ہیں۔ تخیل کی جولانی اصل حقائق کو مسخ کر دیتی ہے۔

رومانوی دور (نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور)

سرسید کی اصلاح و مقصدی تحریک نے اردو نثر کو عقلیت، مقصدیت وافادیت کے اصولوں پر گامزن کیا۔ جس کے تحت ایسی نثر لکھی گئی جو تخیل و رومانویت سے قطعی دور، صرف اور صرف سائنٹفک ہو کر رہ گئی۔ ادب کا مقصد محض اصلاحی وافادی بن گیا۔ ایسے میں رومانوی تحریک، سرسید تحریک کے ردِ عمل میں ابھری، جس کے بنیادی عناصر تخیل پرستی، ماورایت، ندرت خیال، روایات سے بغاوت، خواب وخیال کی دنیا، انانیت، انحراف، ماضی پرستی اور انفرادیت تھے۔رومانوی دور میں جو ادب، شاعری ونثر تخلیق ہوئی، اُس نے اردو ادب میں جذبات پرستی کو فروغ دیا اور ادیبوں کے رویے اپنے حقیقی ماحول کے بنیادی مسائل کے حوالے سے غیر حقیقی ہوتے چلے گئے۔رومانوی دور میں تاریخی ناول نگاری کے ضمن میں "اے حمید" کا نام قابل ذکر ہے۔

اے حمید

اے حمید (۱۹۲۸۔۲۰۱۱) نے زیادہ رومانوی ناول تحریر کیے۔ تاریخی ناول بہت کم لکھے ہیں۔ غرناطہ کے جلاوطن ناول میں اے حمید نے ہسپانوی تاریخ کو پس منظر کے طور پر بیان کیا ہے۔اس ناول کو مکمل طور پر

تاریخی ناول کہنا درست نہیں ہو گا۔ ناول کے شروع کے کچھ حصے میں تاریخی واقعات کا بیان ہے۔ اس کے بعد ناول کا ہیرو ایک عیسائی حسینہ کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ناول کا اختتام بھی عشق و محبت پر کیا گیا ہے۔ ناول کا اسلوب شاعرانہ و رنگین ہے۔ اے حمید کا ایک اور ناول ڈربے سے سامنے آتا ہے جس میں قیام پاکستان کے زمانے کے ہنگامی حالات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ رومانوی دور میں تاریخی ناول نگاری کی شاندار روایت سامنے نہیں آتی۔ رومانوی دور کے رد عمل میں ترقی پسند دور کا آغاز ہوا جس میں ادب برائے زندگی کے اُصول کو اپناتے ہوئے قبل ذکر ادب تخلیق کیا گیا۔

ترقی پسند دور (نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور)

پریم چند

رومانوی دور کے متوازی ہمیں پریم چند (۱۸۸۰۔۱۹۳۶) ایسے ادیب نظر آتے ہیں جنھوں نے تخیل پسندی کو نہ اپناتے ہوئے واقعیت نگاری و حقیقت پسندی کی راہ لی۔ جن کا بنیادی مقصد و منشور، ادب کو ہیئت پرستی اور منفی رجحانات سے بچانا، ادب کو عوام کے قریب لاتے ہوئے حقیقی زندگی کے بنیادی مسائل، بھوک، افلاس، سماجی پستی و غلامی جیسے مسائل کا عکاس بنانا تھا۔ ہندوستان میں طبقاتی تقسیم، سماجی ناانصافیاں، انسانی حقوق کا استحصال، دولت کی غیر مُنصفانہ تقسیم جیسے موضوعات کو ترقی پسند مُصنفین نے ادب کا موضوع بنایا۔ ۱۹۳۶ء میں پہلی ترقی پسند کانفرنس ہوئی۔ جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی اور اپنے صدارتی خطبے میں کہا: "جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت و حرکت پیدا نہ ہو، ہمارا جذبہ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کیلئے سچا استقلال نہ پیدا کرے، وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔" (۴۸)

اسی رجحان کو لے چلتے ہوئے پریم چند نے ہم خرما ہم ثواب، بیوہ، جلوہ ایثار، بازار حُسن، غبن، روٹھی رانی، پردہ حجاز، چوگان ہستی، گوشہ عافیت، نرملا، میدان عمل، گئودان کے عنوان سے ناول تحریر کیے۔ پریم چند نے چوگان ہستی کو اپنا سب سے بہترین ناول قرار دیا ہے۔ پریم چند نے اپنے عہد کو ایک نباض کی طرح دیکھا، پرکھا اور پھر اپنے ناولوں میں اپنے عہد کی تاریخ کو رقم کیا، اپنے معاشرے کے اتار چڑھاؤ کو بیان کیا۔ یہ ناول پریم چند کے اپنے آبائی گاؤں "پانڈے پور" کے ایک بھکاری، جو نابینا ہے، اُس کی کہانی ہے، مگر پس منظر میں ہمیں ہندوستان کی سیاسی، معاشی و معاشرتی کشمکش نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں سرمایہ داری نے جو طبقاتی تقسیم کو فروغ دیا، انسانیت کا زوال، اخلاقیات کی پامالی، غریب طبقے کا بنیادی انسانی ضروریات سے محروم ہونا، ان سب کی بہترین عکاسی اس ناول میں نظر آتی ہے۔ پریم چند نے ہندو سماج کے معاشرتی،

اقتصادی، سیاسی و مذہبی نظام و اقدار کو ایک نقاد کی نظر سے دیکھا اور آواز اٹھائی۔ چوگان ہستی میں پریم چند نے عصری حالت کو بہت خوبی سے پیش کیا۔ تاریخی اعتبار سے یہ ناول ایک اچھا تجزیہ ہے۔ علی احمد فاطمی کے مطابق:

> "انہوں نے معاشرہ کے مختلف طبقات اور افراد کو پیش کیا۔ زمیندار، مہاجن، جاگیر دار، ساہوکار، ماسٹر، پنڈت، کسان، مزدور۔۔۔ ان سب کی صورتحال اور ان سے ٹکرانے والے کوئی ایک دو واقعات نہیں بلکہ باہم الجھی ہوئی گھتیاں اور پیچیدگیاں، رسم وراہ، تصادمات اور تضادات کو سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی۔ وہ ان سب کی صرف تصویر کشی نہیں کرتے بلکہ ان کی پیچیدگی، آلودگی اور تبدیلی کو ایک بڑے تناظر اور ہندوستان کی صدیوں کی سماجی ساخت اور بافت میں پھنسی عام زندگی کے ناتے بانے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"(۳۹)

پریم چند نے ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کا نعرہ بلند کیا اور اس کا پرچار اپنے ناولوں میں کر کے دکھایا۔ میدانِ عمل میں پریم چند نے ہندو مسلم سماج کے آپس کے تعلقات اور کشیدگی، زندگی کی بے معنویت، مذاہب کا تصادم، ہندو سماج کی منافقانہ سوچ، انقلابیوں کی سرگرمیاں، اس دور کے نظام تعلیم کا استحصال، غرض ہندوستانی سماج کے مختلف موضوعات کو اس ناول میں برتا ہے۔ پریم چند نے اس ناول میں عصری تاریخ کو بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ پریم چند نے چونکہ اپنے عہد کی تاریخ کو بہت قریب سے دیکھا، اس وجہ سے اپنے ناولوں میں تاریخ کو تمام حقائق کے ساتھ پیش کیا ہے۔ گئودان پریم چند کا آخری ناول ہے۔ اس میں پریم چند نے مزاح کے راستے تنقید کی ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے ہندوستان کے استحصالی سماج کو پوری حقیقتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پریم چند کے ناولوں نے نہ صرف تاریخ کا بہترین شعور فراہم کیا بلکہ معاشرتی آگاہی کا کام بھی خوب کیا۔ عالمی جنگوں اور ایٹم بم کی تباہ کاریوں کے اثرات ہندوستان کے عوام کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی پڑے۔ ایسے میں جو ادب تخلیق ہوا وہ ہندوستان کے استحصالی سماج کا بہترین عکاس بن کے سامنے آیا۔

سجاد ظہیر

سجاد ظہیر(۱۹۰۵ء-۱۹۷۳ء) کے ناول لندن کی ایک رات میں اسلوب و روایت سے بغاوت وانحراف کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے استحصالی نظام میں تبدیلی کی خواہش کا اظہار بھی موجود ہے۔ لندن کی ایک رات ہندوستان کے نظام اور معاشرہ میں ناانصافی، طبقاتی کشمکش، فرقہ وارانہ تعصب کا ایک نوحہ ہے۔ اس ناول میں سجاد ظہیر نے ہندوستان میں آنے والے تبدیلی کا اشارہ کیا ہے کہ آنے والے وقت میں ہندوستان کی نوجوان نسل غیر ممالک میں پڑھ کر واپس آنے کے بعد ہندوستان کے فرسودہ اور ناانصافی پر مبنی معاشرے کو تبدیل کرے گی، یہاں ہمیں سجاد ظہیر اور سرسید کی سوچ میں اتفاق نظر آتا ہے۔

فسادات سے قبل اُردو ناول میں تاریخی شعور

(نمائندہ ناول نگاروں کے تاریخی شعور کا جائزہ)

قیام پاکستان سے قبل ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء کے عرصے میں جو ناول تحریر کیے گئے اُن کے مقاصد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے ماضی، روایات، معاشرے اور تاریخ سے جوڑنا تھا۔ ان تاریخی ناولوں میں مسلمانوں کو اسلامی فتوحات کے ساتھ شکست کے بارے میں بھی بتایا گیا۔ عروج کے ساتھ ساتھ زوال کی منظر کشی بھی کی گئی۔ قیام پاکستان سے قبل کئی ایسے ناول نگار ہیں جنہیں قیام پاکستان کے بعد، فسادات کے موضوع پر ناول تحریر کر کے شہرت حاصل ہوئی اور اُن کے فن کے جوہر سامنے آئے۔ ان ناول نگاروں میں نسیم حجازی، قیسی رام پوری، رئیس احمد جعفری اور ایم اسلم کے نام نمایاں ہیں۔ ذیل میں نسیم حجازی کے فن پر تفصیل سے بات کی جائے گی۔ جبکہ باقی ناول نگاروں کو "قیام پاکستان کے بعد تاریخی ناول نگاری" کے ضمن میں بیان کیا جائے گا۔

نسیم حجازی

تاریخی ناول نگاری کے ضمن میں عبد الحلیم شرر کے بعد نسیم حجازی (۱۹۱۴۔۱۹۹۶) کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ نسیم حجازی نے اپنے ناولوں میں اسلامی تاریخ کے ساتھ ساتھ قیام پاکستان کے بعد فسادات اور حالات کو موضوع بنایا۔ نسیم حجازی کے فن کے حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں لکھتے ہیں:

> "نسیم حجازی کا موضوع اسلامی تاریخ ضرور ہے لیکن اُنہوں نے جس طرح مسلمانوں کے کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی کمزوریوں اور ان کے کردار کے نقائص کو بھی اُجاگر کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ان کے زوال میں اُن کا اپنا سازشی ہاتھ بھی شامل ہے ورنہ دشمن کی کیا مجال تھی کہ وہ ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں کامیاب ہوتا۔"(۵۰)

بہترین ناول نگاری وہی ہے جو تاریخ کے تاریک اور روشن پہلوؤں کو حقائق کے ساتھ بیان کرتا ہے تعصب کا شکار نہیں ہوتا نیز تخیل کی آمیزش میں بھی احتیاط سے کام لیتا ہے۔ نسیم حجازی نے اپنے ناولوں میں واقعات و کردار کے حوالے سے حقیقت نگاری کی کوشش کی۔ نسیم حجازی کا سب سے پہلا ناول داستان مجاہد ۱۹۴۳ء میں سامنے آیا۔ اس میں ۵۷ھ سے ۱۲۵ھ تک کے عہد کے تاریخی واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں عبد الملک بن مروان کے عہد میں مسلمانوں کی عظیم فتوحات کا بیان ہے۔ دوسرا ناول محمد بن قاسم ۱۹۴۵ء میں سامنے آیا۔ بقول نسیم حجازی: "میں بذات خود شاید تاریخ اسلام کا کوئی ورق الٹتا لیکن جن حضرات نے مجھے داستان مجاہد کی طرز کے اور ناول لکھنے کی ترغیب دی، ان میں اکثر کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ میں محمد بن قاسم کے متعلق ضرور کچھ لکھوں۔" (۵۱) اس ناول کا موضوع اور کہانی ناہید اور دیگر مسافروں کے بحری بیڑے کا دیبل کے مقام پر بحری قزاقوں کے

ہاتھوں لٹنا، راجہ داہر کا ناہید اور دیگر لوگوں کو قیدی بنانا، ناہید کو حجاج یوسف کو خط، حجاج کا محمد بن قاسم کو سندھ پر حملے کے لیے بھیجنا، محمد بن قاسم کا سندھ کو فتح کرنا، ہے۔ اس ناول میں تاریخ کے پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے۔ آخری چٹان ناول ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں آخری عباسی خلیفہ کے عہد میں چنگیز خان وہلاکو خان کے وحشت و بربریت کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ بغداد کی تباہی و بربادی کے حوالے سے بھی تاریخ کے واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ شاہین ناول ۱۹۴۸ء میں طبع ہوا۔ اس ناول کا موضوع اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کا آخری دور ہے ، خلیفہ ابو الحسن سے خلیفہ ابو عبد اللہ کے عہد کو ناول میں شامل کیا گیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے نسیم حجازی کا یہ ناول بھی اُن کے تاریخی شعور کا عکاس ہے۔

خاک اور خون ۱۹۴۹ء میں سامنے آیا۔ اس ناول میں قیام پاکستان کے بعد فسادات کو موضوع بنایا گیا ہے کہ کس طرح سے ہجرت نے تعصب کو ہوا دی اور تاریخ کی سب سے بڑی خون ریزی ہوئی۔ فنی وفکری اعتبار سے نسیم حجازی کا یہ بہترین تاریخی ناول ہے جس میں مہاجرین کے لٹے ہوئے قافلوں کی ابتر صورتحال کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ یوسف بن تاشفین ۱۹۵۱ میں شائع ہوا۔ جس میں نسیم حجازی نے اندلس کی تباہی بربادی کے بعد طوائف الملوکی کو موضوع بنایا ہے۔ آخری معرکہ ناول ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں نسیم حجازی نے محمود غزنوی کے سومنات پر حملے کو موضوع بناتے ہوئے تاریخ سے پردہ اٹھایا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں معظم علی شائع ہوا۔ اس ناول میں نسیم حجازی نے جنگ پلاسی سے پانی پت کی تیسری جنگ تک کے واقعات کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال پذیر اقتدار کو بیان کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں ناول اور تلوار ٹوٹ گئی کا دوسرا حصہ معظم علی سامنے آیا۔ اس ناول میں "تلوار کا ٹوٹنا" سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی، گھناؤنی سازشوں کے نتیجے میں ہونے والی شکست کے لیے بطور علامت استعمال ہوا ہے۔ اس ناول میں موثر تاریخی شعور ملتا ہے۔

قیصر و کسریٰ ناول ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ تاریخی حوالوں کے اعتبار سے یہ بہترین ناول ہے۔ اس میں نبی پاکؐ کی بعثت سے پہلے قیصر اور کسریٰ سے متعلق تاریخ کے مختلف واقعات اور اوراق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قافلہ حجاز ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں روم اور ایران پر مسلمانوں کے حملے اور فتوحات کا تذکرہ ملتا ہے۔ اندھیری رات کے مسافر ناول ۱۹۷۴ء میں سامنے آیا۔ اس میں نسیم حجازی کا فن عظمت کی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ تاریخ کو انہوں نے بہت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ناول میں ۱۴۹۱ سے ۱۴۹۲ تک سقوطِ غرناطہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ کلیسا اور آگ ۱۹۷۷ء میں طبع ہوا۔ جس میں سقوط غرناطہ کے بعد زبردستی مسلمانوں کو عیسائی بننے پر مجبور کرنے اور مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم کو موضوع بنایا گیا ہے۔

نسیم حجازی کے ہاں تاریخی شعور موثر انداز میں ملتا ہے۔ تخیل و مبالغہ آرائی کا اظہار کم کیا گیا ہے۔ جذباتیت بہر حال موجود ہے، جس کا مقصد مسلمانوں کو جوش دلانا ہے۔ نسیم حجازی کے ناولوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے تاریخ کا بغور مطالعہ کیا اور جس معاشرے اور تہذیب کی تاریخ کا ناقدانہ جائزہ لیا اور جس معاشرے اور تہذیب کی تاریخ بیان کی اُسے حقائق کے ساتھ پیش کرنے کو پوری سعی کی۔ نسیم حجازی کے تاریخی ناول اسلوب، کردار نگاری، منظر نگاری کے اعتبار سے بھی تاریخی شعور کے حامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں کے ذریعے مسلمانوں کو اپنی تاریخی روایات کے تحفظ کا درس بھی ملتا ہے۔ فسادات سے قبل نسیم حجازی، ایم اسلم، قمر اجنالوی، رئیس احمد جعفری اور قیسی رام پوری نے تاریخی ناول تحریر کیے جبکہ فسادات کے بعد ان کا فن بہتر طور پر سامنے آیا۔

قیام پاکستان کے بعد اردو ناول میں تاریخی شعور

(نمائندہ ناول نگاروں کے تاریخی شعور کا جائزہ)

TH-21145

۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام، محض ایک ملک کا معرض وجود میں آنا نہیں تھا بلکہ دو قوموں، دو تہذیبوں اور دو سماجوں کا صدیوں پرانا تعلق ختم ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کا آپس میں ٹکراؤ بھی تھا۔ یہ ٹکراؤ اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت و کینہ کی فضا تبھی پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی جب پاکستان کی تحریک کے خدو خال واضح ہونا شروع ہوئے۔ جن دو قوموں اور تہذیبوں کے ملاپ کی شعوری کوشش اقبال کرتے رہے، اب اُس کا تصور محال ہوتا نظر آنے لگا۔ عرصہ دراز سے ایک جگہ رہنے والے لوگ، ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لینے والی دونوں قومیں، مسلمان اور ہندو، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اب دونوں قوموں کے درمیان معاملہ محض گئو کشی یا اردو زبان کے تحفظ کا نہ رہا تھا بلکہ ایک خطہ ہمیشہ کے لیے بٹنے اور تقسیم ہونے جا رہا تھا۔ ایسے میں وہ ایک دوسرے کے خلاف نفرت تھی یا غصہ، جو صدیوں تک دونوں قومیں اپنے اپنے دلوں میں چھپا کے بیٹھی تھیں، یا اُن کے ذہن کے کسی گوشے میں دوسرے کو کم تر اور خود کو برتر تصور کرنے کا ایسا احساس تھا جس کی بنیاد پر ایک خطے کے بٹوارے کی پاداش میں حضرتِ انسان نے قتل عام اور خون ریزی کی انتہا کر دی۔ ایسی بربریت کا مظاہر کیا گیا کہ تاریخ کے صفحات آج بھی لہو لہو ہیں۔

ایسے میں ادب، جو ہمیشہ سے عصری تاریخ کو اپنے اندر سموتا آیا ہے، معاشرے کا عکاس و ترجمان رہا ہے، تاریخ کے عظیم واقعات اور سانحات کو ہمیشہ ادب نے اپنے اندر جگہ دی ہے، تو کیسے ممکن تھا کہ ہمارے ادیب اس

عظیم سانحے پر نہ سوچتے، نہ لکھتے۔ جب رشتوں کو پامال کیا گیا، صدیوں پرانے تعلق اور بھائی بندی کے تعلق کو پس پشت ڈالا گیا، انسانیت کو مجروح کیا گیا، بچوں، بوڑھوں، عورتوں، جوانوں غرض ہر عمر کے انسانوں کو تہِ تیغ کیا گیا، تو ادیب جو ہمارے معاشرے کا ایک حساس طبقہ ہیں، وہ اس قتل و غارت گری سے کیسے اثر نہ لیتے۔ حسن عسکری اس ضمن میں رقمطراز ہیں: "ادیب ان چیزوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ جو اس کے حسیاتی اور ذہنی تجربے میں آچکی ہوں۔ جب حالات ان کو بدلنے پر مجبور کرتے ہیں تو ادیب بھی حالات کا ہم آواز ہو جاتا ہے۔" (۵۲) فسادات کے حوالے سے ادیبوں نے جہاں حقائق بیان کیے، وہیں جذباتیت کے زیر اثر دوسرے کو ظالم اور اپنے تئیں مظلوم ظاہر کیا گیا۔ فسادات میں قتل و غارت گری محض ایک طرف سے نہیں ہوئی، اس حوالے سے صرف ہندوؤں، صرف مسلمانوں یا صرف سکھوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ فسادات میں نشانہ بننے والی تمام قوموں کے جذبات مشتعل تھے۔ ایسے میں خون ریزی اور انسانیت کا قتل عام دونوں طرف سے ہوا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد سامنے آنے والے ادب میں جذباتیت کا بہاؤ، بعد میں آنے والے ادب کے مقابلے میں زیادہ رہا۔ ایسے میں کچھ ادیبوں نے قیام پاکستان کے بعد فسادات میں لٹے پٹے قافلوں کا حال، ہجرت کے مسائل، لوگوں کے قتل عام کا بیان، لوگوں میں جذبات کو ابھارنے کیلئے زیادہ کیا نہ کہ حقائق کا پتہ دینے کیلیے یا شعور و آگہی کی فراہمی کیلیے۔

حسن عسکری اس حوالے سے لکھتے ہیں: "اگر فسادات کو محض کشت و خون، بہیمیت اور بربریت کے مظاہروں اور جسمانی اذیتوں تک محدود رکھا جائے تو بے شک اچھا ادیب پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر انہیں پوری قوم کے تجربے کی حیثیت سے ایک وسیع تاریخی، سیاسی اور معاشرتی پس منظر کے ساتھ پیش کیا جائے تو اعلیٰ پایہ کی تخلیق ممکن ہے۔" (۵۳) پاکستان کے قیام کے بعد، ہجرت، فسادات، نئے ملک کی معاشی و سماجی صورتحال، غیروں کی نفرت و قتل و غارت گری، اپنوں کی بے حسی، غرض بہت سے موضوعات پر ایسا ادب بھی تخلیق ہوا جو جذبات کو ابھارنے سے زیادہ اُس وقت کی، تاریخ کی حقیقی منظر کشی کرتا ہے، جو قاری کی سوچ کو ایک فکری وسعت عطا کرتا ہے۔ اور حالات کا درست تجزیہ کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد لکھنے والے ادیبوں میں ایم اسلم، رشید اختر ندوی، رئیس احمد جعفری، قیسی رام پوری، رامانند ساگر، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، احسن فاروقی، قدرت اللہ شہاب، جمیلہ ہاشمی، خدیجہ مستور، الطاف فاطمہ، انتظار حسین، عبد اللہ حسین، نسیم حجازی اور حیات اللہ انصاری کے نام نمایاں ہیں۔

ایم اسلم

تاریخی ناول نگاری کے ضمن میں ایم اسلم کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ ایم اسلم نے تاریخی ناول نگاری کا آغاز قیام پاکستان سے پہلے کر دیا تھا اور تقریباً ۱۷ تاریخی ناول تحریر کیے۔ جنکے عنوانات درج ذیل ہے: معرکـــــــہ

بدر ،صبح اُحد،محاصرہ یثرب،فاتح مکّہ،ابو جہل،جوئے خون،پاسبان حرم،شمشیر ستم،بنت حرم،فتنہ تاتار،خون شہیداں، غزالہ صحرا،فاتح قسطنطنیہ،مرد غازی،تیغ ابدالی،رقص ابلیس،خونی سفر۔ایم اسلم نے اپنے ناولوں میں اسلامی تاریخ، مسلمان فاتحین، غزوات اور اس کے ساتھ ساتھ فسادات کو بھی موضوع بنایا۔ ایم۔ اے اسلم کے ناول اُن کے تاریخی شعور کے عکاس ہیں۔ قیامِ پاکستان و فسادات کے پس منظر میں ان کا ناول رقص ابلیس ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں لٹے پٹے قافلوں کی نو ازئیدہ مملکت میں آباد کاری کے مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں ایم۔ اسلم نے ہندوؤں اور سکھوں کی وحشت اور بربریت کی عکاسی کی ہے کہ تقسیم ملک کا اعلان ہوتے ہی سکھوں اور ہندوؤں کے جذبات مشتعل ہو گئے اور اُنہوں نے مسلمانوں کے محلوں اور گلیوں پر ہلہ بول دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایم۔ اسلم نے مسلمانوں کی بے حسی کو بھی ناول میں بیان کیا ہے کہ نئی جگہ پر ہر ایک خود غرضی کی مثال بن کر رہ گیا۔ غیروں کے ساتھ اپنوں نے بھی ان نازک حالات میں ایک دوسرے کے اعتبار کا قتل کیا۔ اس ناول میں ایم۔ اسلم نے حقائق کو جذبات کے لبادے میں پیش کرکے قارئین کے جوش کو ابھارا ہے۔

رشید اختر ندوی

فسادات کے موضوع پر رشید اختر ندوی کا ناول پندرہ اگست ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں فسادات میں ہندوؤں اور سکھوں کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں جس طرح سے مہاجرین کے ساتھ سلوک کیا گیا، جس طرح بڑے عہدے داروں نے زمینوں، جاگیروں، گھروں پر قبضہ کیا، ان سب کو اس ناول میں نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس ناول میں بھی جذباتیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ ناول میں مختلف کردار اپنی آپ بیتی سناتے نظر آتے ہیں۔ ناول میں مسلمانوں کو مظلوم دکھانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

رئیس احمد جعفری

فسادات کے موقع پر ہونے والی خون ریزی کی داستان رئیس احمد کے ہاں مجاہد، قیامت، پچاس ہزار عورتیں اور ایک مہاجر میں بیان ہوئی ہے۔ ان ناولوں کا موضوع فسادات سے قبل ہندوستان کا پس منظر، پاکستان کا اعلان ہونے کے بعد ہندوؤں اور سکھوں کا مسلمانوں کے خلاف غصّہ و نفرت، قتل و خون ریزی کی انتہا، انسانیت کا خون، عورتوں کی آبروریزی جیسے واقعات ہیں۔ فنی اعتبار سے رئیس احمد کے ناولوں کا معیار بہت عمدہ نہیں ہے۔ مگر جذبات کی جولانی ان ناولوں میں نظر آتی ہے۔ جس کی بنا پر ان کے ناول قارئین میں بہت مقبول ہوئے۔ یہ ناول تاریخ کے شعور سے زیادہ واقعات کی رپورٹ کو سنسنی خیز انداز میں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔

قیسی رام پوری

قیامِ پاکستان کے بعد قیسی رام پوری کے تین ناول خون ،بے آبرو اور فردوس سامنے آئے۔ ناول

خون ۱۹۴۸ء میں سامنے آیا۔ اس کا موضوع انسانوں، تہذیبوں، قدروں اور آرزؤوں کا خون ہے جو فسادات اور اس کے بعد بے دردی سے بہایا گیا۔ ناول فردوس میں قیسی رام پوری نے دکھایا ہے کہ سب سے زیادہ قتل و غارت پنجاب اور اس کے مکینوں کو جھیلنا پڑی۔ پنجاب کے مختلف اضلاع میں ہندؤوں اور سکھوں نے مسلمانوں کے خون سے سب سے زیادہ ہولی کھیلی۔ مہاجرین کو نئے ملک میں جن مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ ان سب کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ بے آبرو ناول ۱۹۵۹ میں طبع ہوا۔ اس ناول میں ایک خاتون کی بے آبروئی کو غیروں کے ساتھ ساتھ اپنوں کے منہ پر طمانچہ قرار دیا ہے۔ قیسی رام پور کے ناول اُس دور کی ابتر حالت کی جذباتی تصویر پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

رامانند ساگر

فسادات کے ضمن میں رامانند ساگر (۱۹۱۷۔۲۰۰۵) کا بہترین اور انسان مر گیا ناول سامنے آیا۔ اس ناول کا عنوان اور انسان مر گیا پوری انسانیت کی موت کے حوالے سے استعمال ہوا ہے کہ فسادات میں جو خون ریزی ہوئی اس میں انسان سے زیادہ انسانیت کا قتل ہوا۔ اخلاقی و معاشرتی اور انسانی اقدار کا قتل ہوا۔ ان فسادات نے انسان کو اتنا وحشی بنا دیا کہ اس نے تمام روایات اور لحاظ کے سارے تقاضے بھلا دیے۔ اس ناول میں ہندو مسلم فسادات کے مناظر کی تصویر کشی عمدہ ہے۔

قدرت اللہ شہاب

قدرت اللہ شہاب (۱۹۱۷۔۱۹۸۶) ایک نامور ادیب اور بیوروکریٹ تھے۔ قیام پاکستان اور فسادات کے موضوع پر قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ یا خدا ۱۹۴۸ء میں سامنے آیا۔ فنی و فکری اعتبار سے یہ بہترین تحریر ہے۔ اس میں مصنف نے ۱۹۴۷ء سے پہلے اور بعد کی صورتحال کی اس خوبی سے عکاسی کی ہے کہ ہمیں غیروں سے زیادہ اپنوں کے رویوں سے گھن محسوس ہوتی ہے۔ اس ناول میں ایسی خاتون کو دکھایا گیا ہے جو تقسیم سے پہلے، غیروں کے ہاتھوں اتنی اذیت نہیں اٹھاتی، جتنی تقسیم کے بعد اپنے ملک میں مرد کی ہوس کا نشانہ بنتی ہے۔ اس ناول میں قدرت اللہ شہاب نے ہندو، مسلم اور سکھ، سبھی کے چہروں کے نقاب نوچ کر پھینک دیئے ہیں۔

عزیز احمد

عزیز احمد (۱۹۱۳۔۱۹۷۸) ایک بہترین ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ معاشرہ اور معاشرے سے جڑے تہذیبی، ثقافتی و تاریخی عوامل کا بیان اُن کی تحریروں میں بہت خوبی سے کیا گیا ہے۔ عزیز احمد کے ناولوں میں ہوس، مرمر اور خون، گریز، آگ، ایسی بُلندی ایسی پستی اور شبنم قابلِ ذکر ہیں۔ ایسی بُلندی ایسی پستی ناول میں عزیز احمد نے قیام پاکستان کے بعد کی تاریخی، تہذیبی و معاشرتی صورتحال کو موضوع بنایا ہے۔ ایسی بُلندی ایسی پستی میں عنوان کے مطابق مسلمان امراء کی تہذیب کا کمال اور قیام

پاکستان کے بعد زوال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ناول کے آغاز میں نظیر اکبر آبادی کی نظم بنجارہ نامہ کا مصرعہ ”سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ“ ناول کے مزاج کی بھرپور عکاسی کرتا ہے کہ جب انسان پر زوال آتا ہے تو انسان کی ساری شان و شوکت دھری رہ جاتی ہے۔ ایسے میں انسان اپنی فطرت کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی ناکام کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ جیسے زوال کے بعد مسلمانوں نے انگریز سرکار کی خوشنودی کے لیے اُن کے آگے سر جھکایا۔ اس ناول کا موضوع مسلمانوں کی کھوئی ہوئی وراثت ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ ناول عزیز احمد کے واضح تاریخی شعور کو بیان کرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر

اردو ادب کے ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر (۱۹۲۷۔۲۰۰۷) ایک بلند اور منفرد مقام رکھتی ہیں۔ قرۃ العین اردو ادب کے مروجہ طرز میں روایت شکنی کی علمبردار ہیں۔ ان کا ایک خاص انداز اور اسلوب ہے کہ ہر قاری ان کے ناولوں کی روح تک نہیں پہنچ پاتا۔ قرۃ العین کے خاص اسلوب اور طرز و تکنیک کی بنا پر ان کے ناول وہ پڑھا لکھا طبقہ سمجھ پاتا ہے جن کی فکر میں گہرائی اور سوچ میں وسعت ہو۔ قرۃ العین کے ناولوں میں فکری و علمی شعور کی وسعت اور تاریخ، تہذیب، ثقافت اور تمدن کی بہترین عکاسی موجود ہے۔ جو انہیں دوسرے ناول نگاروں سے منفرد بناتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے عنوانات یہ ہیں: میرے بھی صنم خانے، سفینہ غم دل، آگ کا دریا، آخرِ شب کے ہم سفر، کارِ جہاں دراز ہے، گردش رنگ چمن، چاندنی بیگم۔ ناول میرے بھی صنم خانے قرۃ العین حیدر نے قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں تحریر کیا۔ فسادات کا موضوع اس ناول میں ضمنی طور پر آیا ہے۔ ناول میں لکھنو اور اودھ کی تہذیب بطور پس منظر استعمال ہوئی ہے۔ اس میں لکھنو اور اودھ کے تعلقہ دار گھرانوں کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ کردار اعلیٰ اور جدید تعلیم سے آراستہ ہیں۔ ان کے موضوعاتِ گفتگو سیاست، ادب فنون لطیفہ، سماج، تاریخ، تہذیب، عالمی تمدن اور جدید زندگی ہے۔ انہیں تقسیم ملک سے کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی اُن کی ہمدردیاں کسی ایک قوم کے ساتھ خاص ہیں۔ انہیں اس تہذیبی، علمی و ادبی، معاشرتی اور کلاسیکی ورثے کی فکر ہے جو ہندو مسلم سماج کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ اور جس کے تقسیم کے نتیجے میں تباہ ہونے اور بکھر جانے کے امکانات ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا یہ ناول ایسے افراد کے ذہنی و فکری رویوں کے حوالے سے ایک نوحہ ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں:

> ”قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول ۱۹۴۹ء میں میرے بھی صنم خانے سامنے آیا۔ اس ناول میں قرۃ العین حیدر کے آنسو الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔ تہذیب کے مرکزوں اور گہواروں میں پلنے والے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے صحراؤں کی طرف نکل گئے۔ امام باڑے ویران اور مسجدیں شکستہ

ہو گئیں۔ پرانے خاندان مٹ گئے۔۔۔ وہ تہذیب، ہندوؤں اور مسلمانوں کا وہ معاشرتی اور تمدنی اتحاد، وہ روایات وہ زمانہ سب کچھ ختم ہو گیا۔" (۵۴)

اس ناول میں فسادات اور قتل و خون ریزی کی جذباتیت موجود نہیں لیکن اُن کا دکھ اور المیہ کیفیت ضرور موجود ہے۔ اس میں تہذیبوں کے زوال کی گونج ہے۔ قرۃ العین حیدر کے تاریخی شعور کا بہترین اظہار اس ناول میں ملتا ہے اور صرف یہی نہیں، اُن کے بعد میں آنے والے ناول بھی اُن کے تہذیبی، فکری، تاریخی و معاشرتی شعور کی گہرائی کی عکاسی کرتے ہیں۔

سفینہ غم دل ۱۹۵۲ء میں سامنے آیا۔ اس ناول کو میرے بھی صنم خانے کی توسیع کہا گیا۔ وہ اس لیے کہ اس ناول میں بھی ویسی ہی سوچ کے حامل کردار انہی رویوں اور فکر کے ساتھ، وہی مشاغل اپناتے اور ویسی ہی گفتگو کرتے دکھائے گئے ہیں۔ اس میں ہندوستان کے بٹوارے کے بعد کے خاندان موضوع ہیں۔ اس میں جاگیر دار طبقے کے تقسیم ہندوستان کے بعد ذہنی، فکری، معاشی اور معاشرتی زوال کو بیان کیا گیا۔ یہ طبقہ نئے زمانے کے قدم کے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل پا رہا اور نہ ہی نیا زمانہ انہیں قبول کرنے کو تیار ہے۔ ایسے میں ایک عجیب سی شکست و ریخت کی فضا جنم لیتی نظر آتی ہے۔ قرۃ العین حیدر مورخ کی سی نظر رکھتے ہوئے، اپنے شعور کی گہرائی کی آمیزش کے ساتھ ایک بہترین ناول نگار کے روپ میں سامنے آتی ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اس ناول کو مصنفہ کی اپنی آپ بیتی کہا کہ وہ کرداروں کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس بھی دلاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کا بہترین ناول آگ کا دریا ۱۹۵۹ء میں سامنے آیا۔ یہ ناول قرۃ العین کے بہترین تاریخی شعور کا عکاس اور اُن کے فن کی معراج ہے۔ اس ناول کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے فنی بصیرت، تاریخی شعور اور سماجی آگہی سے ہندوستان کی ڈھائی ہزار سال کی تاریخ کو بہت کامیابی کے ساتھ ناول میں بیان کیا ہے۔ اس کے دو اہم کردار "گوتم نیلمبر" اور "ہری شنکر" کے مکالمے پورے ناول میں ایسے سوالات اٹھاتے ہیں، جن سے مزید سوالات نکلتے چلے جاتے ہیں۔ جس میں موجود بصیرت افروز نکتے، قاری کو زندگی، موت، ازل، ابد، تہذیب، روح، خدا، وجود اور عدم وجود کے حوالے سے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس ناول میں تقریباً گوتم بدھ کے دور کے ایک سو سال بعد سے لے کر پاکستان کے قیام کے پہلے عشرے تک کے عہد کا ذکر سمیٹا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے تاریخی شعور کا سرچشمہ "وقت" ہے اور اس ناول میں اس کا بہترین اظہار ملتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ہاں تاریخ کا تصور، تمام تاریخی ناول نگاروں کے تاریخ کے تصور سے مختلف ہے۔ اس حوالے سے قرۃ العین اپنے ایک انٹرویو میں کہتی ہیں: "میرا اپنا خیال ہے کہ آگ کا دریا کے ذریعے تاریخیت کا رجحان پیدا ہوا کہ لوگ تاریخ کو سمجھیں۔" (۵۵) تاریخ کو جب ہم فکری طور پر سمجھنے لگتے ہیں تو وہ "تاریخیت" بن کر ابھرتی

ہے اور اسی تاریخیت کا اظہار، قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نظر آتا ہے۔ قرۃ العین کے باقی ناول بھی اُن کے بصیرت افروز تاریخی شعور یا تاریخیت کو واضح کرتے ہیں۔

احسن فاروقی

احسن فاروقی (۱۹۱۳۔۱۹۷۸) کا نام ناول نگار سے زیادہ اردو ناول کے نقاد کی حیثیت سے اہم ہے۔ احسن فاروقی کا ناول شامِ اودھ ۱۹۴۸ء میں سامنے آیا۔ قیام پاکستان کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں شام اودھ کی حیثیت تاریخی ہے۔ اس ناول کا موضوع اودھ کی تہذیب کا زوال ہے۔ جب انگریز کی لکھنو پر حکومت قائم ہوئی۔ اس وقت واجد علی شاہ کو قید کر لیا گیا۔ لکھنو اور اس کے گرد نواح میں نوابین کے خاندان وظیفوں پر عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے، زوال کے باوجود نہ ہی اُن نوابوں کے مشاغل میں کچھ فرق آیا نہ اخراجات میں۔ ایسے میں سارا نظام کھوکھلا ہوتا چلا جاتا ہے مگر جھوٹی امارت، شان و شوکت اور دکھاوے کیلئے خالی ہوتے خزانے کی پرواہ نہیں کی جاتی اور بالا آخر بالکل تہی دامانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ احسن فاروقی نے مُحرم کی شام غریباں کے اختتام کے ساتھ اودھ کی شام غریباں کو بہت خوبی سے جوڑا ہے۔

احسن فاروقی کا دوسرا ناول سنگم بھی تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ اس میں مسلمانوں کی تاریخ کو بہت خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ تاریخ ۱۰۲۲ء سے ۱۹۶۲ء تک مُحیط ہے۔ ناول میں مسلمانوں کی تاریخ کو پانچ حصّوں میں تقسیم کر کے ہر دور کے مسلمان حکمرانوں کی خصوصیات کو احسن فاروقی نے بہت خوبی سے رقم کیا ہے۔ ناول میں ہندوستان کی تاریخ کے عروج و زوال دکھائے گئے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کا بیان بھی موجود ہے۔ لکھنو کی پر تکلف تہذیب اور معاشرے کا زوال بھی دکھایا گیا ہے۔ ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کے ساتھ ساتھ سیاست کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ تاریخی نوعیت کے اعتبار سے احسن فاروقی کا یہ ناول اردو ادب میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

فضل کریم فضلی

فضل کریم فضلی (۱۹۰۶۔۱۹۸۱) نے ایک اہم تاریخی واقعہ اور صورتحال پر خون جگر ہونے تک کے عنوان سے تاریخی ناول تحریر کیا۔ جو ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں فضلی نے قحط بنگال کو موضوع بنایا ہے۔ آپ ضلع فرید پور میں سرکاری طور پر تعینات تھے۔ لہٰذا بنگال میں پھیلنے والے شدید اور جان لیوا قحط کو فضلی نے بہت قریب سے دیکھا۔ اور اُس اذیت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ غریبوں کو قحط کے ہاتھوں مرتے دیکھا۔ غریب کسانوں، مزدوروں کو تباہ ہوتے دیکھا۔ قحط میں لوگوں نے ذخیرہ اندوزی شروع کر دی اور بے حسی و خود غرضی نے ہر ایک کے دل میں گھر کر لیا۔ ایسی غیر انسانی صورتحال کا احاطہ خون جگر ہونے تک میں کیا گیا ہے۔ اس ناول میں فضل کریم فضلی نے تاریخ کے ایک اہم واقعے اور اُس سے جڑے بے حسی و خود غرضی سے بھرپور انسانی رویے کو

موضوع بنایا ہے۔ ان دونوں ناولوں میں فضل کریم فضلی کا تاریخی شعور واضح طور پر سامنے آتا ہے۔

عبداللہ حسین

عبداللہ حسین (۱۹۳۱۔۲۰۱۵) اردو ناول نگاری میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد عبداللہ حسین کا ناول اداس نسلیں ۱۹۶۳ء میں سامنے آیا۔ اس میں ابتدا میں پہلی جنگ عظیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر قیام پاکستان اور اُس کے بعد کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں سیاست اور سماج کے ساتھ ساتھ وقت کے مختلف دھاروں اور تاریخی حقائق و شواہد کو عبداللہ حسین نے بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس میں ہندوستان کی شہری زندگی اور باشعور طبقے کو پیش کیا گیا ہے۔ جنگوں میں بھرتی کرنے کیلئے زبردستی لوگوں کو سرکار نے مجبور کیا۔ اور عام لوگوں کو جانیں دینے کیلئے محاذ پر بھیجا گیا۔ عبداللہ حسین نے بہت باریکی کے ساتھ تاریخی حقائق کو بیان کیا ہے۔ اداس نسلیں مجبور و بے بس عوام، کسانوں اور مزدوروں کیلئے بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ ناول کے بیان و منظر نگاری میں حقیقت کا عکس موجود ہے۔ عبداللہ حسین کے دیگر ناولوں میں باگھ، قید اور نادار لوگ شامل ہیں جن میں ہمیں تاریخ اور حقیقت کا عکس بہت خوبی کے ساتھ ملتا ہے۔ معاشرتی عکاسی بہترین کی گئی ہے۔ نیز سماجی، سیاسی اور معاشرتی حقائق کا نوحہ عبداللہ حسین کے ناولوں میں موجود ہے۔ عبداللہ حسین کا تاریخی شعور ان کے ناولوں میں ابھر کے سامنے آتا ہے۔ جو تخیل و جذباتیت کی بجائے حقیقت پر مشتمل ہے۔

خدیجہ مستور

اردو ناول نگاری میں خدیجہ مستور (۱۹۲۷۔۱۹۸۲) کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ خدیجہ مستور کا معروف ناول آنگن ۱۹۶۳ء میں سامنے آیا۔ یہ ناول تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے فسادات کو براہِ راست موضوع نہیں بنایا بلکہ قیام پاکستان سے قبل تحریک پاکستان اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال کی بہترین عکاسی کی ہے۔ ناول میں پاکستان بننے سے پہلے اور بعد کے واقعات، گھروں کا حال، معاشرے اور لوگوں کا حال بیان کیا ہے۔ مہاجر کیمپوں کا حال بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ خدیجہ مستور نے ناول میں ایسے مسلم گھرانے کا ذکر کیا ہے جس کے مرکزی کردار دو مخالف سیاسی جماعتوں کے حامی ہیں۔ باہر کی سیاست نے گھر کی فضا میں بھی ایک سیاست اور بدمزگی کا ماحول پیدا کیا ہوا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ گھرانا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ رشتوں میں ضد اور ٹکراؤ کی کیفیت موجود ہے۔ خدیجہ مستور نے آنگن میں قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے حالات اور سیاسی تاریخ کو بہت خوبی سے خانگی حالات اور افرادِ خانہ کے ذہنی و فکری رویوں کے ساتھ مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ خدیجہ مستور نے دوسرا ناول زمین ۱۹۸۳ء میں تحریر کیا۔ یہ ناول آنگن ناول کی توسیع ہے۔ اس میں ہجرت کے بعد کے حالات رقم ہیں۔ فنی، فکری اور تاریخی شعور کے اعتبار سے اس کا درجہ آنگن سے کم ہے۔

جمیلہ ہاشمی

جمیلہ ہاشمی(۱۹۲۹۔۱۹۸۸)ایک بہترین تاریخی ناول نگار ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کاناول تلاش بہاراں ۱۹۶۱ء میں طبع ہوا۔ اس میں فسادات کے نتیجے میں ہونے والے نقصان پر غم و غصہ کا اظہار ملتا ہے۔ جس میں انسان سے زیادہ انسانیت مجروح ہوئی۔ ناول میں تقسیم ہندوستان کے نتیجے میں ہونیوالی خون ریزی کی مذمت کی گئی ہے۔ تاریخی اعتبار سے جمیلہ ہاشمی کے ناول دشت سوس اور چہرہ بہ چہرہ رو برو کے نام اہم ہیں۔ چہرہ بہ چہرہ رو برو کا موضوع قرۃ العین طاہرہ کی زندگی کے بارے میں ہے۔ قرۃ العین طاہرہ، جو ایران کا ایک مذہبی و تاریخی کردار ہے، اُس کی شاعری کی دھوم ہر طرف ہے۔ حضرت امام مہدی کے ظہور کے حوالے سے قرۃ العین طاہرہ کے خواب کا ذکر اور اُس سے جڑے واقعات کو بخوبی قلم بند کیا گیا ہے۔ دشتِ سوس ۱۹۸۳ء میں سامنے آیا۔ اس کی نوعیت بھی تاریخی ہے۔ اسلوب شاعرانہ اور دلکش ہے۔ اس ناول میں "منصور بن حلاج" کے کردار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دشت سوس تاریخی اعتبار سے بہترین ناول ہے۔ اس میں منصور بن حلاج کے بچپن سے جوانی اور پھر موت تک کا سفر دکھایا گیا ہے۔ منصور بن حلاج نے محبوب حقیقی کی تلاش میں عشق کے کٹھن درجے پار کیے اور جب اپنی تلاش کے اختتام پر، اپنی منزل پر پہنچ کر "اناالحق" کا نعرہ لگایا تو اسے باغی قرار دیا گیا اور اُس کیلئے انصاف پسند دنیا نے موت تجویز کی۔ جمیلہ ہاشمی کے ناول بہترین تاریخی کرداروں سے مزین، فکری و فنی اعتبار سے تاریخی شعور کے حامل ہیں۔

حیات اللہ انصاری

حیات اللہ انصاری(۱۹۱۲۔۱۹۹۹)کا ناول لہو کے پھول ۱۹۶۹ء میں سامنے آیا۔ تاریخی دائرہ کار اور پھیلاؤ کے اعتبار سے یہ ایک وسیع ناول ہے۔ یہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں برصغیر کی زندگی، سیاست ، معاشرت اور تاریخ کا بیان بہت خوبی و خوبصورتی سے ملتا ہے۔ اس ناول میں ۱۹۱۱ء سے قیام پاکستان کے بعد سیاسی، سماجی، معاشرتی و معاشی حالات و واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں حیات اللہ انصاری نے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے کرداروں کو ایک جگہ لا کر جمع کر دیا ہے۔ مختلف تحریکوں کا ذکر بھی اس ناول میں موجود ہے۔ تاریخ کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ ضخامت کے اعتبار سے بھی یہ ناول اہمیت کا حامل ہے۔

الطاف فاطمہ

اردو ادب کی خواتین ناول نگاروں میں الطاف فاطمہ (۱۹۲۷) کا نام قابلِ ذکر ہے۔ الطاف فاطمہ کا ناول نشانِ منزل فسادات اور قیام پاکستان کے موضوع پر لکھا گیا۔ تاریخی شعور کے حوالے سے الطاف فاطمہ کا ناول چلتا مسافر کا تذکرہ ضروری ہے۔ ۱۹۸۱ء میں شائع ہونے والے اس ناول کا موضوع بنگال اور اُس کی تہذیب و

معاشرت ہے۔ قیام پاکستان سے قبل ہر طرف امن کی صورتحال تھی۔ تقسیم ملک نے ہر طرف فسادات اور قتل وغارت گری مچادی۔ تقسیم ملک میں کچھ علاقے پاکستان اور کچھ ہندوستان میں شامل ہوئے جس کی وجہ سے خونی رشتے سرحدوں کی لپیٹ میں آکر ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے۔ ہر طرف ایک بے سرو سامانی کی کیفیت کا اظہار ملتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کو بھی اس ناول میں شامل کیا گیا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے حوالے سے بھی یہ ناول تاریخی شعور فراہم کرنے کا باعث بنتا ہے۔ جس سے الطاف فاطمہ کی تاریخی فکر کا پتہ چلتا ہے۔

رشیدہ رضویہ

رشیدہ رضویہ تاریخی ناولوں کے حوالے سے اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں۔ ان کا ناول لڑکی ایک دل کے ویرانے میں ۱۹۶۷ء، اسی شمع کے آخری پروانے ۱۹۷۰ء، جبکہ گھر میرا راستے غم کے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ لڑکی ایک دل کے ویرانے میں کا موضوع عراق، عراق کی سیاست اور تاریخ کو بنایا گیا ہے۔ ناول کے دائرہ میں لندن کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ناول کے پس منظر میں دوسری جنگ عظیم کے واقعات اور عراق کی جدوجہد آزادی کو موضوع بنایا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کا حوالہ بھی موجود ہے۔ اسی شمع کے آخری پروانے میں پاکستانی سیاسیت اور تاریخ کو موضوع بناتے ہوئے ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۹ء تک کے سیاسی وسماجی حالات اور تاریخی واقعات کو پیش کیا ہے۔ گھر میرا راستے غم کے میں دوبارہ سے عراق اور پاکستان کی تاریخ اور سیاست کے واقعات وسیع تناظر میں چلتے ہیں۔ اس میں عرب، اسرائیل جنگ کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ تاریخی ناول نگاری کے ضمن میں رشیدہ رضویہ ایک اہم ناول نگار کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ جن کا تاریخی شعور ہمیں تاریخ کے حقائق سے روشناس کراتا ہے۔ اردو ناول میں تاریخی شعور اور تاریخ نگاری کا جائزہ لینے سے یہ امر سامنے آتا ہے کہ قدیم دور سے لے کر دورِ حاضر تک بے شمار تاریخی نوعیت کے ناول لکھے گئے۔ جن میں اسلامی تہذیب کے ساتھ ساتھ دیگر تہذیبوں، ممالک اور معاشروں سے وابستہ تاریخ کو موضوع بنایا گیا۔ ناول نگاروں نے تاریخی حقائق کو بیان کرنے کیلئے انتھک کوششیں کیں کہ لوگوں کا اپنی تہذیب اور تاریخ سے ادب کے دلکش پیرائے میں رشتہ استوار ہو سکے اور اسی کوشش کا ایک اہم نام انیس ناگی (۱۹۳۹ء-۲۰۱۰ء) ہے۔ انیس ناگی نے مختلف ادوار اور معاشروں کی تاریخ کو اپنے ناولوں میں بہت خوبصورتی سے پیش کیا اور قارئین کیلئے فکر انگیز نکتے منظر عام پر لائے ہیں۔

زیر تحقیق عنوان "انیس ناگی کے ناولوں میں تاریخی شعور بحوالہ خصوصی: فصیلیں تحقیقی و تنقیدی جائزہ" ہے۔ اس میں انیس ناگی کے چار ناول ایک گرم موسم کی کہانی، قلعہ، چوہوں کی کہانی، اور کیمپ (مشمولہ: فصیلیں) شامل ہیں۔ اگلے ابواب میں ان ناولوں میں انیس ناگی کے تاریخی نظریات کا جائزہ

لینے کے بعد رابرٹ تھارپ(Robert Thorp) کے پیش کردہ تاریخی شعور کے تجزیاتی فریم ورک کے مطابق انیس ناگی کا تاریخی شعور اخذ کیا جائے گا۔ رابرٹ تھارپ(Robert Thorp) نے ۲۰۱۴ء میں جارن روسن (Jorn Rusen)، کلاس گورن کارلسن(Klas Goran Karlsson) اور پیٹر سی سائیکس(Peter C.Seixas) کی تاریخی شعور کے حوالے سے کی گئی تحقیقات کی روشنی میں تاریخی شعور کا تجزیاتی فریم ورک پیش کیا۔ اور یہ بتایا کہ یہ تجزیاتی فریم ورک افراد کے تاریخی شعور کو معلوم کرنے کے ضمن میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ تجزیاتی فریم ورک کی تفصیل کچھ یوں ہے:

"تاریخی شعور کم از کم تین صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ بیان / حکایت(Narration)

۲۔ تاریخ کا استعمال / تاریخی حوالے(Use of History)

۳۔ تاریخی ثقافت (Historical Culture)

بیان / حکایت(Narration)

ابتدائی سطح پر انسان کے تاریخی شعور کا ادراک اُس کے بیان اور تحریر سے کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ کا استعمال / تاریخی حوالے(Use of History)

جب انسان اپنی تحریر میں تاریخ کے حوالوں کو استعمال کرتا ہے تو اس کے ذریعے اُس شخص کے تاریخی شعور تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ تاریخی حوالوں کی پہلی سمت "کیا" کہلاتی ہے۔ اس میں وجودیت، سیاست اور سائنس وغیرہ کے حوالے ہیں۔ اس سمت میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ تحریر میں تاریخ کے کون سے حوالے بیان ہوئے ہیں۔ تاریخی حوالوں کی دوسری سمت "کیسے" کہلاتی ہے۔ اس سمت میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ تحریر میں تاریخ کے حوالوں کو کیسے استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں اس بات کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ کیا تاریخ کو روایتی انداز میں بیان کیا گیا ہے یا مثالی انداز میں، تنقیدی انداز میں یا وراثتی انداز میں۔ ان سمتوں سے کسی تحریر میں تاریخی حوالوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ دیکھا جاتا ہے کہ فرد روایتی تاریخی شعور کا حامل ہے یا مثالی تاریخی شعور رکھتا ہے، تنقیدی تاریخی شعور کا حامل ہے یا وراثتی تاریخی شعور کا۔ روایتی تاریخی شعور کے حامل فرد کے تاریخ کے حوالے سے نظریات اٹل ہوتے ہیں جنھیں وہ بغیر تحقیق کے اپنی تحریر میں استعمال کرتا ہے۔ مثالی تاریخی شعور کے حامل فرد کے تاریخ کے حوالے سے نظریات اٹل ہونے کے باوجود وہ تاریخی حقائق میں سچائی کے معیار کا لحاظ رکھتا ہے۔ تنقیدی تاریخی شعور رکھنے والا فرد تاریخ کے حوالوں میں ہر حالت میں سچائی کو مقدم رکھتا ہے۔ نیز تاریخی حوالوں کے بیان میں اصل سیاق و سباق کا خیال رکھتا ہے۔ وراثتی تاریخی شعور کا حامل فرد تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے ان حوالوں کا تجزیہ تاریخ کے

درست سیاق و سباق میں کرتا ہے۔"(۵۶)(تاریخی ثقافت کے حوالے مجوزہ تحقیق میں زیرِ بحث نہیں آئیں گے)اگلے ابواب میں انیس ناگی کے ناولوں میں بیان کردہ تاریخی حوالوں کو جانچنے کے بعد مندرجہ بالا فریم ورک کے ذریعے انیس ناگی کا تاریخی شعور معلوم کیا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ Encyclopedia of Britannica Vol.II, P.558.

۲۔ MubarakAli,The age of the sage."*DAWN*(2014).
https://www.age-of-the-sage.

۳۔ What is History[online].last modified April
4,2018.https:// en.m.wikipedia.org>wiki>History.

۴۔ صادق علی گل،سرگزشتِ تاریخ(لاہور:عزیز بک ڈپو،س ن)،ص۱۸۔

۵۔ علی احمد فاطمی،تاریخی ناول اور اُصول(الٰہ آباد:تہذیب نو پبلی کیشنز،۱۹۸۰ء)،ص۱۹۔

۶۔ What is History[online].last modified April 4,2018.
https://en.m.wikipedia.org>wiki>History

۷۔ ایضاً

۸۔ مبارک علی(مرتب)،تاریخ اور مورخ(لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۰۲ء)،ص۲۴۔

۹۔ What is History[online].last modified April
4,2018.https:// en.m.wikipedia.org>wiki>History.

۱۰۔ رشید احمد گوریجہ،اردو میں تاریخی ناول(لاہور:ابلاغ،۱۹۹۴ء)،ص۱۶،۱۷۔

۱۱۔ Inge, William,Art and practice of historical fiction. (Washington: Library of Congress,1976).p.12.https://books.google.com.

۱۲۔ Andrew Glencross ,*Historical Consciousness in International Relations theory: A hidden disciplinary dialogue* (UK:University of Aberdeen,2010),accessed 16-17 October,2010.

۱۳۔ Gadamer, Hans-Georg,"The problem of Historical consciousness", special issue, Graduate Faculty Philosophy Journal 5:1(1975).
https://doi.org/10.5840/gfpj1975512

۱۴۔ Robert Thorp,*Historical Consciousness and Historical Media-A History Didactical_Approach_to_Educational_Media.* 08,2014.https://doi.org/10.3402/edui.v5.24282.

۱۵۔ Jurgen Straub,*Telling Stories Making history: Toward a Narrative psychology of the historical construction of Meaning, [in:] Narration, identity and Historical Consciousness* ed.J.Straub(New York:Oxford,2005),p.48-49,https://books.google.com.pk/books/about/Narration_Identity_and_Historical_Consciousness.html.

۱۶۔ Peter C.Seixas,*Theorizing Historical Consciousness*(Canada:University of Toronto Press, 2004),https://books.google.com.pk.

۱۷۔ قاضی قیصر الاسلام،فلسفے کے جدید نظریات(لاہور:اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۹۸ء)،ص۲۹۰۔

۱۸۔ J.Straub,*Telling Stories Making history:Toward a Narrative psychology of the historical construction of Meaning, [in:] Narration, identity and Historical Consciousness*.P.49.

۱۹۔ Karl-Ernst Jeismann,*Geschichtsbewusstsein*, in Hand buch Dar Geschichtsdidaktik, ed Klaus Bergmann et al., VOL. 1, p. 42-44. https://de.m.wikipedia.org/wiki/Historical_thinking.

۲۰۔ Thorp, Robert."Historical Consciousness and Historical Media-A History Didactical Approach to Educational Media"*Education_Inquiry_Vol 5, (2014)* https://doi.org/10.3402/edui.v5.24282

۲۱۔ خورشید انور،قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور (نئی دہلی:انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۳ء)،ص۴۳۔

۲۲۔ ایضاً،ص۴۴۔

۲۳۔ Peter Lee. "Historical Consciousness and Understanding history." *The International Journal* Volume 4, no 1. (2004). Access January, 2009.https://www.google.com/amp/embedded? v=7.25.17.

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ What is Historical Consciousness [online]. last modified February 29,2018.http://teachinghistory.org/ historiconsciousness.

۲۶۔ Historical Fiction ,"Encyclopedia Britannica", Retrieved 2013-10-12.

۲۷۔ خورشید انور،قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور، ص۷۳۔

۲۸۔ ایضاً، ص۷۶۔

۲۹۔ ایضاً، ص۷۷۔

۳۰ Richard Lee, "Defining the Genre."*Historical Novel Society*. (1997-2018) https://historicalnovelsociety.org

۳۱۔ Lynda G.Adamson,*World Historical Fiction*(US: Phoenix, AZ Orxy Press,1999).P.Xi.https://www.amazon.com.

۳۲۔ Margaret Anne Doody,*The True Story of the Novel*(New Brunswick, NJ: Rutgers University Press, 1996).P.27.https://books.google.com.

۳۳۔ Jane Chance,*Women Medievalists and the Academy*(University of Wisconsin Press,2005). PP.501. https://books.google.com.

۳۴۔ کرم حیدری،مسلمانانِ برصغیر کی جدو جہد آزادی میں مسلم لیگ کا کردار (اسلام آباد: نیشنل پریس ٹرسٹ،۱۹۸۶ء)، ص۳۸۔

۳۵۔ احمد سعید،حصول پاکستان(لاہور:نیو کریسنٹ پبلشرز،۱۹۷۲ء)، ص۹۔

۳۶۔ عبدالقیوم،حالی کی اردو نثر نگاری، ص۵۸۔

۳۷۔ محمد احسن فاروقی،ناول کیا ہے (لکھنو: نسیم بک ڈپو،۱۹۶۴ء)، ص۱۴۳۔

۳۸۔ رشید احمد گوریجہ،اردو میں تاریخی ناول، ص۱۴۴۔

۳۹۔ انیس ناگی،ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری(لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ ۱۹۸۸ء)، ص ۵۱۔

۴۰۔ رام بابو سکسینہ،تاریخ ادب اردو (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۴۱۶۔

۴۱۔ رشید احمد گوریجہ،اردو میں تاریخی ناول، ص ۱۳۹۔

۴۲۔ اشتیاق طالب، پروفیسر،تمہید (کراچی: مشتاق بک ڈپو، ۱۹۸۳ء)، ص ۶۶۔

۴۳۔ عبدالحلیم شرر، ''آپ بیتی'' مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر (لاہور: ادارہ فروغ اردو، س ن)، ص ۵۶۵۔

۴۴۔ صلاح الدین احمد، ''شرر کی ناول نگاری'' مشمولہ صریر خامہ، جلد دوم (دہلی: پی۔کے پبلی کیشنز، ۱۹۶۹ء)، ص ۲۶۲۔

۴۵۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر،اردو ناول نگاری (دہلی: الحمرا پبلشر، ۱۹۷۲ء)، ص ۱۶۷۔

۴۶۔ محمد علی طیب،مرقع عالم، شمارہ ستمبر، (۱۸۹۰ء)، ص ۳۲۔

۴۷۔ رشید احمد گوریجہ،اردو میں تاریخی ناول، ص ۳۵۰۔

۴۸۔ ممتاز منگلوری، ''افسانہ نگار و ناول نگار'' مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند (س ن)، ص ۴۳۷۔

۴۹۔ علی احمد فاطمی،پریم چند نئے تناظر میں (دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۰۶ء)، ص ۴۰۔

۵۰۔ ممتاز احمد خاں،آزادی کے بعد اردو ناول (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۵۶، ۱۵۵۔

۵۱۔ ایس ایم زمان،نسیم حجازی ایک مطالعہ (س ن)، ص ۱۴۳۔

۵۲۔ حسن عسکری، ''انسان اور آدمی'' مشمولہ ادب اور انقلاب (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۶ء)، ص ۱۵۱۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۲۳۔

۵۴۔ قدوس جاوید، ''قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ'' مشمولہ قومی زبان (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۰ء)، ص ۴۱۔

۵۵۔ شہریار، ابوالکلام قاسمی، ''قرۃ العین حیدر سے ایک غیر رسمی گفتگو'' مشمولہ کتاب نما (دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جنوری ۱۹۸۹ء)، ص ۱۴۔

٥٦- Thorp, Robert."Historical Consciousness and Historical Media-A History Didactical Approach to Educational Media" *Education Inquiry* Vol 5,(2014) https://doi.org/10.3402/edui.v5.24282

باب دوم

انیس ناگی کا تاریخی شعور: ایک گرم موسم کی کہانی کے تناظر میں

انیس ناگی (۱۹۳۹۔۲۰۱۰) کا شمار اُردو ادب کے جدید ادبا میں ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اپنی جدید سوچ کو اپنے فن کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے ادب میں اس طرح سے بیان کیا گیا کہ اُن کا تخلیق کردہ ادب، اُن کے دور میں معاشرتی سطح پر جاری و ساری سیاسی و سماجی اضطراب اور تاریخی منظر نامہ کا آئینہ دار بن کر سامنے آیا۔ انیس ناگی کی تخلیقات نے نہ صرف اُن کے دور بلکہ ماضی کی سیاسی و سماجی کشمکش، افراد کی معاشرے کے تانوں بانوں میں اُلجھی نفسیاتی گتھیوں کو بہت خوبی سے پیش کیا۔ انیس ناگی تاریخ کے بیان میں محض تاریخ دان کا فرض ہی نہیں نبھاتے بلکہ اُس دور کے نباض کی صورت میں سامنے آتے ہیں، تاریخ کے بیان میں داخلی اور خارجی دونوں پیمانوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں، تاریخ کا تجزیہ خارجی سطح کے ساتھ ساتھ داخلی سطح پر وضاحت کے ساتھ انیس ناگی کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔

انیس ناگی کے ادبی سفر میں بارہ ناول سامنے آئے ہیں۔ انیس ناگی کا پہلا ناول دیـــــوار کـــــے پـــیچھے ۱۹۸۰ جبکہ آخری ناول 313 بریگیـــڈ ۲۰۰۷ء میں سامنے آیا، اس سارے عرصے میں انیس ناگی نے وقت کے بدلتے ہوئے دھاروں کو دیکھا، معاشرے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا، اپنے مُلک اور دُنیا کے سماجی، سیاسی حالات کے انتشار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی گُھٹن کو اپنے داخل میں محسوس کیا، تاریخ کے مختلف ادوار، ماضی کے اہم واقعات و سانحات کے گھاؤ اپنی روح پر جھیلے، پاکستان کے مختلف ادوار میں لگنے والے مارشل لاء سے جُڑی صعوبتوں کو باطنی سطح پر محسوس کیا۔ اور پھر ان تمام حالات و واقعات کو اپنی مخصوص فکر اور داخلی کیفیت کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ انیس ناگی کی ناول نگاری کے حوالے سے زاہد مسعود لکھتے ہیں:

> "اردو ناول کی تاریخ انیس ناگی کے بغیر ادھوری رہے گی۔ اُنہوں نے جو ناول تحریر کیے۔ اس میں سے ہر ناول ایک نیا موضوع ہے۔ یہ ناول اپنے کرداروں اور موضوعات کے اعتبار سے وجودی فلسفہ کو پاکستانی صورتحال کے حوالے سے ایک نئی فکری جہت دیتے ہیں۔ ان کے ناول اُردو ناول کی روایت سے ایک انحراف ہیں کہ ان کے موضوعات عشق و محبت سے جنم لیتے ہیں اور نہ ہی امیروں رئیسوں کی زندگیوں کے ترجمان ہیں۔ ان کا موضوع آج کے دور کی انسانی حقیقت ہے۔ وہ عام آدمی کیلئے احترام کا تقاضا کرتے ہیں۔"(۱)

انیس ناگی نے مندرجہ ذیل ناول تحریر کیے:

۱۔	دیوار کے پیچھے	۱۹۸۰
۲۔	میں اور وہ	۱۹۸۳
۳۔	زوال	۱۹۸۹
۴۔	ایک گرم موسم کی کہانی	۱۹۹۰
۵۔	ایک لمحہ سوچ کا	۱۹۹۱
۶۔	محاصرہ	۱۹۹۲
۷۔	قلعہ	۱۹۹۴
۸۔	چوہوں کی کہانی	۱۹۹۵
۹۔	کیمپ	۱۹۹۸
۱۰۔	پُتلیاں	۲۰۰۳
۱۱۔	ناراض عورتیں	۲۰۰۴
۱۲۔	313بریگیڈ	۲۰۰۷

انیس ناگی نے فصیلیں کے عنوان سے اپنے چار ناولوں، ایک گرم موسم کی کہانی(۱۹۹۰) ،قلعہ،(۱۹۹۴)،چوہوں کی کہانی(۱۹۹۵)اور کیمپ(۱۹۹۸) کو ایک مجموعے کی شکل دی، جسے جمالیات نے ۲۰۰۵ میں شائع کیا۔ دیباچہ میں سلیم شہزاد تحریر کرتے ہیں: ”انیس ناگی ایک غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کے حامل دانشور ہیں۔ ان کے تمام ناولوں کو مربوط کر کے پڑھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ ناول تیسری دُنیا کے ایک بہت بڑے ایپک کو سامنے لاتے ہیں۔“(۲) ایک گرم موسم کی کہانی انیس ناگی کا چوتھا ناول ہے جسے ۱۹۹۰ء میں روہتاس بکس نے لاہور سے شائع کیا۔ اس کے صفحات کی کُل تعداد ۱۴۷ ہے۔ اس ناول میں ۱۸ مُختصر ابواب شامل ہیں۔ناول میں تاریخی حوالوں کا جائزہ لے کر انیس ناگی کے تاریخی شعور تک رسائی حاصل کی جائے گی۔

تاریخ کے حوالے:

اس ناول میں انیس ناگی نے ۱۸۵۷ ء کی جنگِ آزادی کے اسباب و واقعات کو ادب کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ محمد علی صدیقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ”انیس ناگی کا یہ تاریخی ناول ایک گرم موسم کی کہانی ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بارے میں ایک نقطہ نظر کو پیش کرتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اگر ایک معاشرہ سیاسی طور پر مغلوب ہو جائے تو اس مُردنی کے باوجود اس میں

ایسے باحوصلہ افراد بھی موجود ہوتے ہیں، جو اجتماعی وجود کی بقا کیلئے انفرادی وجود کی قربانی دیتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی انتخاب ہوتا ہے، جو اس ناول کا موضوع ہے۔"(۳)

ناول کی کہانی، مرکزی کردار بہادر علی کے گرد گھومتی ہے۔ جو انگریز کی فوج میں بھرتی ہے۔ ناول میں بہادر علی نے اجتماعی وجود کی بقا کیلئے، اپنے وجود کی قربانی دے کر ایک مثال قائم کی۔ انیس ناگی نے ۱۸۵۷ء کے تاریخی واقعات کو کہانی کی صورت میں پیش کرتے ہوئے حقیقی کرداروں کے ساتھ ساتھ فرضی کرداروں کی بھی مدد لی ہے۔ ناول کا ہیرو جاوید، جس نے تاریخ کے مضمون میں ایم۔اے کیا ہُوا ہے اور گولڈ میڈل یافتہ ہے، ایک ایمان دار اور باضمیر آفیسر ہے اور یہی ایمانداری اُس کے لیے سزا بن جاتی ہے۔ اُسے گھر بیٹھنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اُس کی بیوی شیزوفرینیا کی مریض ہے۔ اُس کی دیکھ بھال کے لیے ملازمہ کی تنخواہ کا بوجھ اُٹھانے کے ساتھ اپنی اکلوتی بیٹی کی اسراف کی طرف مائل طبعیت نے اُس کے مسائل میں اضافہ کر دیا ہے۔ چار ماہ کے بعد اُسے ملازمت پر واپس بلا کر ایک عمارت میں تعینات کر دیا جاتا ہے جو ایک مقبرہ ہے، جہاں ۱۸۵۷ء سے متعلق تاریخ کا ریکارڈ موجود ہے۔

انیس ناگی کے ناول کے کرداروں کی پیشہ ورانہ زندگی کی اُلجھنوں میں ہمیں انیس ناگی کی پیشہ ورانہ زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ حالات کی سختی نے اُنہیں مغربی مُصنفین کی نگارشات کی طرف مائل کیا۔ انیس ناگی نے شعر و شاعری میں اپنے حالات اور پُر آشوب دور کا نوحہ بیان کیا۔ پاک ٹی ہاؤس میں آمد و رفت کے باعث اُن پر سوشلسٹ ہونے کا الزام لگا۔ بالآخر گورنمنٹ کالج لاہور، جہاں انیس ناگی عارضی طور پر لیکچرار کے فرائض سرانجام دے رہے تھے، کے پرنسپل نے انیس ناگی کو بلوا کر اُن سے استعفیٰ لکھوا کر ملازمت سے برطرف کر دیا۔ اس حوالے سے انیس ناگی نے پرنسپل کے الفاظ اپنی سرگزشت میں اس طرح سے تحریر کیے ہیں: "ملک میں مارشل لاء لگا ہُوا ہے۔ ہر لیکچرار کی مُستقل تعیناتی سے پہلے اُس کے بارے میں خفیہ رپورٹ حاصل کی جاتی ہے اور تمھاری رپورٹ اچھی نہیں ہے۔" (۴) جاوید کو اُس کی ایمانداری کے نتیجے میں مقبرے میں موجود تاریخی ریکارڈ کی حفاظت کی ذمہ داری، افسرِ بالا کی طرف سے یہ کہہ کر سونپ دی جاتی ہے۔

> "تمھاری بریفنگ یہ ہے کہ تمھیں اس گنبد میں تعینات کیا جارہا ہے، جہاں تمھارا کام تاریخ کی حفاظت کرنا ہے۔" "سر" "کس تاریخی کی؟ جو لکھی جاچکی ہے یا لکھی جانے والی ہے؟۔۔۔" "تم۔۔۔جُغد ہو، تاریخ بدلنے کی کوشش نہ کرنا، خواہ وہ کیلنڈر ہی کیوں نہ ہو۔" اس کے دبلے پتلے کربہی المنظر افسر نے فائلوں پر سر جھکا لیا۔ وہ بہت کچھ جوابًا کہنا چاہتا تھا لیکن سنتے ہوئے بھی کچھ نہ کہنا اس کی ملازمتی تربیت کا حصّہ تھا۔"(۵)

اس اقتباس میں افسر کے کردار کے ذریعے انیس ناگی نے ایسے عناصر کی طرف اشارہ کیا ہے جو تاریخ کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ تاریخ کے صرف اُن ہی پہلوؤں کو اہم گردانتے ہیں جو اُن کی خامیوں کو چھُپائیں اور حقائق کو سامنے نہ آنے دیں۔ ایسے میں جو تاریخ لکھی جاچکی ہے، اُس میں حقائق کی جانچ پڑتال

یاردوبدل بہت سی پوشیدہ حقیقتوں کو سامنے لانے کا باعث ہو سکتا ہے۔ ایسے حالات میں ماضی کے وہ حقائق ہی سامنے لائے جاتے ہیں جن کا فائدہ سیاسی سطح پر اُٹھایا جاسکتا ہو۔ تبھی جب جاوید ایک بوڑھے انچارج سے بے شمار خستہ فائلوں اور کاغذوں کے ڈھیر کے بارے میں استفسار کرتا ہے، تو اُس کو کچھ یوں جواب ملتا ہے۔

> ”سر ہمارا کام قدیم کو جدید سے جُدا کرنا ہے، اس ہال کے بوڑھے انچارج نے کہا“۔ ”کیا مطلب ہے؟“ جاوید نے تنگ کر پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے، سر قدیم کو جدید سے جُدا تو نہیں کیا جاسکتا، یہ بہت پرانا اور غیر ضروری ریکارڈ ہے، ہم ضروری کو غیر ضروری سے الگ کرتے ہیں۔ لیکن یہ فیصلہ کون کرتا ہے؟ سر یہ تو وقت کے ہاتھ میں ہے۔“(۶)

یہاں انیس ناگی ایک الم ناک حقیقت سے قاری کو آگاہ کرتے ہیں کہ جو حقائق وقت کے ساتھ ساتھ غیر ضروری لگنے لگیں، جن کو غیر ضروری بنا دینے میں بااثر طبقے کا اپنا ہاتھ ہوتا ہے، اُن حقائق کو تاریخ سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں معاشرے کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ تاریخ کی بازیافت ہمیں اپنی غلطیوں پر نظر ثانی کا موضوع فراہم کرتی ہے۔ ایرک ہُوبس باؤم اپنے مضمون ماضی کا شعور میں تاریخی میں کی جانے والی تبدیلی کی توجیح اس طرح سے پیش کرتا ہے:

> ”اگر تبدیلی کے عمل کا جائزہ لیا جائے تو یہ دو طرح سے ہوتی ہے: اول تو اس حوالے سے کہ جس میں ماضی کو سرکاری نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے ماضی کے واقعات کا انتخاب کیا جاتا ہے کہ کون سی چیز کو یاد رکھا جائے اور کس کو بھُلا دیا جائے۔ لہذا جب ماضی کے حوالے سے معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے تو صرف ان تبدیلیوں کو قبول کیا جاتا ہے کہ جو مستحکم شدہ نظام کو برقرار رکھتے ہوئے ہوتی ہیں اور اس کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتی۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تبدیلی کا یہ عمل ابتداء میں مُستحکم شدہ نظام کیلئے خطرہ معلوم نہیں ہوتا مگر وقت کے ساتھ تبدیلی اس نظام کے استحکام میں دراڑیں ڈالنا شروع کر دیتی ہے۔“(۷)

ماضی کے واقعات جنہیں سرکاری نقطہ نظر سے غیر ضروری خیال کرتے ہوئے بھلا دیا جاتا ہے، وہ مستقبل میں معاشرتی نظام میں دراڑیں ڈالنے کا باعث بن سکتے ہیں۔ ناول کا ہیرو جاوید اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ تاریخ میں تبدیلی بااثر طبقے کی سرپرستی کے بغیر ممکن نہیں۔ اُس کی نظر میں عمارت میں تعینات عملہ سازشی ہے۔ کوئی کسی کے بارے میں کچھ بھی بتانے کو تیار نہیں، سارا نظام بگاڑ کا شکار ہے۔ تبھی جاوید کے ایک نائب آر او۔ا کے زبان کھولنے پر دوسرا نائب آر او۔ ۲ فوراً مداخلت کرتے ہوئے کہتا ہے: ”اس کے بولنے سے بات بین الاقوامی سطح پر چلی جائے گی۔“(۸)

تاریخ کی ”حفاظت“ کرنے والے عملے کی پُشت پناہی کرنے والے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ محکمے کے ملازمین کے مطابق پشت پناہی کرنے والوں میں بین الاقوامی عناصر کار فرما ہیں۔ تبھی عملے کے وہ لوگ جو اپنی مدت ملازمت پوری

کر چکے ہیں۔ وہ ابھی تک نئی نسل کیلئے راستہ روکے بیٹھے ہیں۔ ایسے میں جاوید کی آمد سب کو کھلتی ہے۔ افسر بالا سے لے کر اُس کے دونوں نائب اُس کے آنے اور اُن کے جاری و ساری معاملات میں دخل اندازی سے ناخوش دکھائی دیتے ہیں۔" یہ انچارج گڑ بڑ ہے، یہ تاریخ بدلنا چاہتا ہے، اوپر اطلاع دینی ضروری ہے۔"(۹)اور حقیقت بھی یہی ہے۔ جاوید کے نزدیک ۱۸۵۷ کا تاریخی ریکارڈ حقیقت پر مبنی نہیں۔ اس میں سچائی کا معیار ناقص ہے۔ جاوید کا خیال ہے کہ" یہ سب کاغذات یک طرفہ ہیں، لوگوں کو جھوٹی وفاداریوں پر مجبور کیا گیا تھا، اصل حقیقت اس سے مختلف تھی،"(۱۰)جاوید کے نزدیک یہاں موجود تاریخی ریکارڈ ایسے ہی ہے جیسے قبر میں مردے، بے جان، بے حرکت، جن کے ہونے یا نہ ہونے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ سوچتا ہے۔" یہ دفتر نہیں، مُردہ خانہ ہے۔"(۱۱)" مُجھے اس گنبد میں کیوں بھیجا گیا؟ یہ مُردوں کی جگہ ہے یا سیاسی اسیروں کی؟"(۱۲) تاریخ اس عمارت میں بے جان مردے کی طرح دفن کر دی گئی ہے۔ اور اسی مُردہ اور فراموش شدہ تاریخ کی جاوید کو شدت سے تلاش ہے۔ جاوید کا یہ ماننا ہے کہ ہماری بقا ہمارے ماضی سے جڑے رہنے میں ہے۔ وہ ماضی، جس کے ذریعے ہم اپنے حال اور مستقبل کی بنیادوں کو مضبوط اور مُستحکم بنا سکتے ہیں۔ جاوید کے نزدیک:" زندہ رہنے کیلئے ہمیں اپنی جڑیں تلاش کرنی چاہیں۔"(۱۳)انیس ناگی نے پاکستان کے سیاسی، معاشی و معاشرتی نظام کے ضمن میں ماضی اور تاریخ کی تلاش و بازیافت کو اس ناول میں موضوع بنایا۔ انیس ناگی ماضی میں اپنی جڑیں تلاش کرنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ اُس تاریخ کے متلاشی ہیں، جس نے پاکستان کو موجودہ صورتحال کا وارث بنایا ہے۔ انیس ناگی اُس تاریخ کو " جاوید" کے ذریعے تلاش کرنے کی سعی میں مصروف ہیں، جس نے پاکستان کو ایسے حالات سے دوچار کیا، جس نے انیس ناگی کیلئے جبریت سے بھرپور زندگی کا انتخاب کیا۔ ایسی زندگی جو انیس ناگی کو کسی صورت گوارا نہیں۔ جس میں سیاسی چال بازیاں، عوام کی زندگی کو اجیرن بنا دیتی ہیں، جس میں مارشل لاء کی صعوبتیں فرد کے آزادی رائے کے حق کو سلب کر لیتی ہیں۔

تاریخ کے واقعات کو بغیر جانچ پڑتال کے حقائق کا درجہ دے دینا انیس ناگی کے نزدیک قطعی غلط ہے۔ جاوید اپنے دونوں نائبوں سے تاریخ کے ریکارڈ کی جانچ کے حوالے سے استفسار کرتے ہوئے خود ہی حقیقت بیان کر دیتا ہے۔" ان دستاویزات پر کیا تحقیق کی ہے؟ اپنی تاریخ کی کتنی کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے؟ ہاں کل چار بجے تک اس ہال میں جتنی تصاویر آویزاں ہیں، ان پر کپڑے کے غلاف چڑھا دو۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ان فریموں میں سجے ہوئے ہماری حرکات کو دیکھیں کہ ہم ابھی تک وہی ہیں۔ صرف مفاد کے اُصول۔۔۔"(۱۴)

دورِ حاضر کی کوتاہیاں ہوں یا تاریخ کی لغزشیں، انیس ناگی ان پر بے لاگ چوٹ کئے بغیر نہیں رہتے۔ ایسے میں ان کے لہجے کی کڑواہٹ قاری کو واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ انیس ناگی نالاں ہیں کہ ہم نے اپنی کوتاہیوں سے کوئی سبق حاصل نہ کیا، تاریخ میں ہونے والی غلطیوں پر ہمیں کوئی افسوس اور پچھتاوا نہیں، بلکہ ہم تو ان سے آنکھ ہی

نہیں ملانا چاہتے، ندامت تو دور کی بات ہے۔ مگر انیس ناگی کے ہاں حال اور مستقبل کے حوالے ماضی کا اعادہ کیے بغیر بے معنی ہیں۔ معاشرے کی بے حسی پر گہرا طنز کرتے ہوئے انیس ناگی فریموں میں سجی عظیم شخصیات کی تصاویر پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ افسر بالا کی سختی سے کی گئی تنبیہ کے باوجود جاوید اپنے ضمیر اور ایمانداری کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اُس کا ذہن ۱۸۵۷ء کی جنگ کے تانوں بانوں میں ایسا اٹکا ہے کہ جب وہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر دوڑاتا ہے تو وہاں تاریخ کا ہندسہ ۱۲ اور ۱۳ کے درمیان اٹکا ہوا ہے۔ "جاوید نے اپنے نئے افسر کے دفتر میں جانے سے پہلے اپنے آپ سے کہا اور جلدی سے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی تو گیارہ بجے تھے اور گھڑی میں تاریخ کا ہندسہ ۱۲ اور ۱۳ کے درمیان رُکا ہوا تھا۔ "(۱۵) ۱۲ اور ۱۳ کی تواریخ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے حوالے سے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ جنگ کا آغاز ۱۰ مئی ۱۸۵۷ کو ہو گیا تھا۔ ۱۲ اور ۱۳ مئی کو جنگ کے ہنگامے اپنے عروج پہ تھے۔ جنگ بندی یکم نومبر ۱۸۵۸ کو ہوئی۔ میاں محمد شفیع اس حوالے سے لکھتے ہیں: "۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کا دن وہ دن تھا کہ وطنی غیرت، دینی تحفّظ اور آزادی کی پہلی تلوار میرٹھ کی زمین پر بُلند ہوئی اور اسے تاریخی شہر بنا دیا۔ "(۱۶) سید خورشید مصطفٰی رضوی نے جنگ کے آغاز کے بارے میں بیان کیا ہے: "۱۰ مئی کی شام کے پانچ بجے اچانک بغاوت شروع ہو گئی۔ "(۱۷) جاوید کا ذہن ماضی میں ایسا اُلجھا ہے کہ وہ درست تاریخ کا اندازہ نہیں کر پا رہا۔ اُس دن کی تاریخ ۱۸ ستمبر ہے، ۱۳ مئی نہیں۔ اس کا احساس اُسے کچھ یوں ہوتا ہے۔ "اُس نے پھر کلائی کی گھڑی غور سے دیکھی۔ دونوں سوئیاں ۱۲ کے ہندسے پر ٹکی ہوئی تھیں لیکن تاریخ کے خانے میں ۱۸ ستمبر کے حرف اور ہندسے رُکے ہوئے تھے۔ "(۱۸) وہ خود سے سوال کرتا ہے۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کچھ گھنٹے پہلے میں ۸ بجے صبح ۱۳ مئی کو یہ ریکارڈ دیکھ رہا تھا۔ "---" سر تاریخ میں ایسے مُغالطے ہو جاتے ہیں۔ آج ۱۸ ستمبر ہے۔ "(۱۹)

انیس ناگی کے ناول کے کردار خارجی کشمکش کے ساتھ ساتھ باطنی کشمکش سے بھی بر سر پیکار نظر آتے ہیں۔ اُن کی کیفیت ایک ایسے شخص کی سی ہوتی ہے جو ہر لمحہ خود کو بھنور میں پھنسا ہوا محسوس کرتا ہے۔ جاوید کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی دکھائی گئی ہے۔ وہ اپنے ارد گرد موجود حالات کے بھنور میں پھنسا ہُوا ہے۔ اُسے تاریخ کے حقائق کی تلاش ہے۔ اور وہاں موجود عملے کو اُس کی یہ تلاش ایک آنکھ نہیں بھا رہی۔ اُس کا ماتحت عملہ اُس کے ہر عمل پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

> "عمارت کا نگہبان، جس نے اُس کے لیے دروازہ کھولا تھا سائے کی طرح اس کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ "تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟" "سر، مُجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں ہر اندر آنے والے کے ساتھ ساتھ رہوں" "ڈیم اٹ، اس لیے کہ وہ تاریخ چوری نہ کر لے، گدھے یہاں سب کچھ چوری ہو چکا ہے اور کسی حکمران کو آج تک اس کا علم نہیں ہے "(۲۰)

انیس ناگی نے مُلکی و غیر ملکی سطح کے سیاسی و سماجی معاملات پر کھل کر اظہار خیال کرنے میں کبھی پس و پیش سے کام نہیں لیا۔ وہ ایک ایسے ادیب کے طور پر سامنے آتے ہیں، جنہوں نے جو حالات اپنی ذات پر جھیلے، اُن کا اظہار اپنی تحریروں میں ببانگِ دہل کیا۔ انیس ناگی نے حکمران طبقے کی مفاد پرست طبیعت پر کڑا طنز کیا ہے۔ حکمرانوں نے ہر دور میں اپنی بقا و سالمیت کے لیے عوام کی بقا و سالمیت کو داؤ پر لگایا ہے۔ پاکستان میں نفرت، تعصّب، فرقہ واریت و دہشت گردی کے علاوہ کچھ نہ چھوڑا اور ہم محض ان تاریخی ریکارڈز کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ جبکہ ہمارا مُلک جڑوں سے کھوکھلا ہو چکا ہے اور کسی حکمران کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔ جاوید تاریخی ریکارڈ میں درج حقائق کی جانچ پڑتال چاہتا ہے کیونکہ وہ ۱۸۵۷ء کے تاریخی ریکارڈ میں درج حقائق کی صحت سے مطمئن نہیں۔ اُس کے نزدیک ان کاغذات میں حقائق سے زیادہ مبالغہ آرائی ہے۔ اُس کے لیے ایسا ریکارڈ محض ردی اور بے کار ہے۔ اسی مقصد کے لیے وہ ۱۸۵۷ء کا تاریخی ریکارڈ اپنے دفتر میں طلب کر لیتا ہے۔ مگر اتنے بڑے ریکارڈ کی جانچ پڑتال کے حوالے سے اُس کا ماتحت عملہ اُس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں۔ کسی کو حقائق سے نہ کوئی غرض ہے نہ دلچسپی۔

> "ہم نے یہ کام کب شروع کرنا ہے؟" جاوید نے اپنے ارد گرد کاغذات اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔ "کون سا کام؟" آر او۔ اے نے کسی تحیر کے اظہار کے بغیر پوچھا۔ "تو کیا میں نے جھک مارنے کیلئے اتنی دستاویزات اپنے ارد گرد جمع کی ہیں؟" "سر ہمیں ابھی تک کسی نے کام کرنے کے لیے نہیں کہا، ہمارا کام صرف حفاظت کرنا ہے۔" (۲۱)

ماتحت عملے کی کام چور طبیعت اور بے زار رویہ، جاوید کے ارادے کو متزلزل نہیں کر پاتا اور وہ خود ہی حقائق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اور ایسا کرنے کے پیچھے اُس کا صرف ایک ہی مقصد ہے۔

> "اتنے کاغذات کے ڈھیر میں،۔۔۔ میں بھی ایک کہانی، نہیں اصل واقعات۔۔۔۔۔ جو کچھ اس شہر میں بیتا، کاغذات پر لکھ کر ان کاغذات کے ڈھیر میں شامل کر دیتا ہوں، کسی کو کیا پتہ چلے گا کہ یہ کاغذات کس نے کب لکھے تھے۔۔۔ میں تاریخ کو بدلنا نہیں چاہتا۔۔۔۔ یہ کام تو حکمران کر سکتے ہیں۔۔۔۔ میں چند ہی دنوں میں ان کاغذات کی مدد سے نئے کاغذ تیار کر لوں گا تاکہ آنے والی نسلیں سچ اور جھوٹ میں فاصلہ جان سکیں۔" (۲۲)

یہیں سے جاوید حال سے ماضی کی طرف سفر شروع کر دیتا ہے۔ ناول فلیش بیک میں چلنا شروع ہو جاتا ہے ناول میں ۱۸۵۷ء کے لاہور کا منظر نامہ پیش کیا جاتا ہے جب انگریز کا پورے ہندوستان پر راج تھا۔ محمد علی صدیقی لکھتے ہیں: "جاوید ان سے اُلجھتا ہوا تاریخ کے دھندلکوں کا سفر کرتا ہوا ۱۸۵۷ء کے زمانے میں جا پہنچتا ہے اور آخر کار اسی دفتر میں واپس آ جاتا ہے۔" (۲۳) ماضی کا دریچہ شہرِ لاہور میں کھلتا ہے۔ انیس ناگی نے بغاوت سے قبل لاہور کی سیاسی و سماجی زندگی کا بغور مُطالعہ کرنے کے بعد اپنے ناول کا حصّہ بنایا۔ لاہور کے تیرہ تاریخی دروازے، جو لاہور کی

پہچان ہیں،لاہور کی اہم شاہراہیں اور ان پر صبح سے رات تک دوڑتی بھاگتی زندگی،۱۸۵۷ کے تاریخی شہر لاہور کی تاریخ کی جھلک واضح طور پر ناول میں دیکھی جا سکتی ہے۔انیس ناگی محض مطالعہ کے ذریعے معلومات ہی اکٹھی نہیں کرتے بلکہ انہیں تحقیق کی کسوٹی پہ پرکھ کر حقیقت کا جامہ اوڑھانے میں بھی کمال رکھتے ہیں۔بقول محمد علی صدیقی:" انیس ناگی نے اس ناول میں گذشتہ صدی کے لاہور کی زندگی کو بڑے موثر طریقے سے پیش کیا ہے۔"(۲۴)۱۸۵۷ء میں لاہور میں چونکہ انگریزی عمل داری تھی لہذا گورے سپاہی روزانہ رات کو شہر میں گشت کرتے، مقامی لوگوں کی نقل و حرکت پر انگریز فوج کی کڑی نظر رہتی،اس قید و بند کی کیفیت اور سخت نگرانی میں لاہور شہر کے مکین کیسی زندگی گزارنے پر مجبور تھے،اُس زندگی کو انیس ناگی نے جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔" سر شام ہی شہر کے تیرہ دروازے بند کر دیئے جاتے اور ان دروازوں کے اندر اور باہر کالی پلٹن نمبر ۸۱ کے سپاہی اور تھانے کی پولیس کا ایک آدمی متعین ہوتا۔رات کو باہر نکلنے کیلئے تھانے سے پرمٹ لینا ضروری تھا۔مُغلوں کے شہر کے مکینوں کی زندگی کا محور مُغلوں کے شہر کے اندر ہی تھا۔"(۲۵)

عوام کو انگریز حکومت کے سامنے کچھ بھی بولنے کی جرأت نہیں تھی۔انہیں جو حکم دے دیا جاتا وہ اُس پر کاربند ہو جاتے۔ناول میں انیس ناگی نے لوگوں کے جذبات کی شدت اور اُن کی نفسیات کو بخوبی بیان کیا ہے۔وہ عوام جسے احساس ہے کہ اُن کی قسمت، حکومت کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔حکمرانوں کے غلط اور لاپرواہی میں کئے گئے فیصلے، عوام کی زندگی کے رُخ متعین کرتے ہیں۔صوبیدار میجر بہادر علی کا بیٹا دلاور علی جو ایک بہادر اور پر جوش نوجوان ہے،وہ انگریزی عملداری کے سخت خلاف ہے،وہ ہمہ وقت خوف کے سائے میں سانس لیتے لوگوں کے درمیان روشنی کی کرن معلوم ہوتا ہے،یہ بہادری اسے اپنے والد سے ورثے میں ملی ہے،بے شک بہادر علی انگریزی فوج میں ملازم ہے مگر اس کے دل میں بھی انگریز کے لیے غصے اور نفرت کے جذبات ہیں،اس کا وجود تو انگریز کے حکم کا غلام ہے مگر دل آزادی کا متلاشی ہے،وہ اس گھٹے ہوئے ماحول سے چھٹکارا چاہتا ہے۔دلاور علی انگریز کی حاکمیت سے شاکی تو ضرور ہے مگر مغل حکمرانوں کی خود غرضی کا اسے زیادہ افسوس ہے،وہ ان کی اسی بے حسی کا نالہ کرتا نظر آتا ہے۔"یہ ہماری حالت تاریخ کا وہ فیصلہ ہے جو ہم نے نہیں کیا، فیصلے حکمران کرتے ہیں اور جنتا ان کا نتیجہ بھگتنے کیلئے بنی ہے۔"(۲۶)

انیس ناگی نے اپنی زندگی کے ہر دور میں پابندیوں اور بندشوں کا سامنا کیا۔دور طالب علمی، پیشہ ورانہ زندگی نیز ادبی زندگی، ہر دور میں اُنہیں حکومتی پابندیوں ، سازشوں اور جبریت کا سامنا کرنا پڑا۔ انیس ناگی اپنے دور اور حکمرانوں کے رویوں سے شدید خائف رہے۔جنھوں نے اُن سے اُن کی ذہنی و قلبی آزادی چھینی۔۔۔۔۔ حکومتوں کے فیصلے، عوام کی زندگیوں کو کیسے مُتاثر کرتے ہیں، اس کا بہترین اظہار مختلف کرداروں بالخصوص بہادر علی کی زبانی

ہوتا ہے۔ "ہم اس تاریخ کے ذمہ دار نہیں جو ہم نے نہیں لکھی۔ رعایا تو صرف برداشت کرنا جانتی ہے۔ ہم نہیں، ہمارے بزرگوں نے گوروں کو یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔"(۲۷) انگریز کو مغل بادشاہوں نے ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت دی جس کا انگریز نے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے، تجارت کے پردے میں ہندوستان میں اپنا اثر و نفوذ پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ اپنی تیزی و چالاکی کی بنا پر اُس نے ہندوستان کے مختلف خطوں میں اپنا تسلط جمایا۔ میاں محمد شفیع نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ لندن سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے نائبوں کو پیغام بھیجا کہ سونے کی چڑیا پر جال پھیلاؤ، یعنی ہندوستان پر اپنا قبضہ اور جال پھیلانا شروع کرو۔ "ہمیں ہندوستان میں بحیثیت ایک قوم کے اپنا مقام بنانا ہے۔ اس کے بغیر ہماری حیثیت محض ناخواندہ مہمان کی سی رہے گی۔ دوسروں ہی کے رحم و کرم پر زندہ رہنا پڑے گا۔"(۲۸) پھر انگریز ہندوستان کے ہر شعبہ زندگی پر چھاتا چلا گیا۔ مگر ہمارے حکمران خاموش تماشائی بنے رہے۔ اور انگریز کی حکومت قائم ہو گئی۔ تخت و تاج ہمارے حکمرانوں سے چھن گیا اور وہ اپنی ہی سرزمین پر محکوم بنا دیئے گئے۔ پر افسوس صد افسوس انہیں پھر بھی ہوش نہ آیا۔

انیس ناگی مغل حکمرانوں اور بااثر افراد کی کم ہمتی اور بے حسی پر نوحہ کناں ہیں جنہوں نے کبھی کسی بیرونی حملے اور سازش کا مردانہ وار مقابلہ نہ کیا۔ ہر حملہ آور کے آگے سر جھکا دیا۔ جاوید حکمرانوں کے بزدلانہ رویے پر چوٹ کرتا ہے۔ "یہ تاجروں کا شہر ہے، اس شہر نے کبھی مقابلہ نہیں کیا، ہر فاتح اور حکمران کا ساتھ دیا ہے۔ نہیں یقین آتا تو تاریخ کی کوئی کتاب دیکھ لو۔"(۲۹) ایک اور مقام پر جاوید کہتا ہے۔ "یہ شہر شروع ہی سے اس طرح رہا ہے، اس نے کبھی ظالموں اور فاتحوں کا مقابلہ نہیں کیا۔"(۳۰) لاہور تاریخی اعتبار سے حملوں کی زد میں رہا ہے۔ لاہور پر ماضی میں پے در پے حملے ہوتے رہے۔ مختلف ادوار میں جنگجو آتے اور لاہور کو تاراج کر کے نکل جاتے، کچھ لاہور ہی میں اپنی حکومت بنا کے برسوں کے لیے قابض ہو کے بیٹھ جاتے۔ کنہیا لال نے تاریخ لاہور میں لاہور پر ہونے والے حملوں کی تفصیل بیان کی ہے، اُس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

> "پہلا صدمہ شہر لاہور پر سلطان محمود غزنوی کی یورش میں پہنچا۔ دوسرا خسرو ملک کے عہد میں سہنا پڑا، تیسرا حملہ تاج الدین یلدوز بادشاہ کیچ مکران اور سندھ ملتان کے ہاتھوں ہُوا۔ چوتھا صدمہ سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے دور میں لاہور کو برداشت کرنا پڑا، پانچواں حملہ سلطان محمد تغلق کے دور میں جبکہ چھٹا حملہ فیروز شاہ باربک تغلق کے وقت میں تاتاریوں نے کیا۔ ساتواں حملہ سلطان محمد شاہ بن فیروز باربک کے وقت میں مسمی سیکھا قوم ککھڑ کے ہاتھوں ہُوا۔ آٹھواں صدمہ لاہور پر سلطان مبارک شاہ بن خضر خان کے دور میں آیا۔ نواں صدمہ لاہور پر بابر یہ حملوں کے وقت آیا۔ دسواں حملہ روشن اختر محمد شاہ کے دور میں نادر شاہ نے کیا۔ گیارہواں حملہ احمد بادشاہ دُرانی کے عہد میں ہُوا۔ بارہواں اور تیرہواں حملہ لاہور پر سکھوں نے کیا۔"(۳۱)

لاہور ماضی میں بیرونی حملہ آوروں کا اولین مرکز رہا۔ لاہور ہمیشہ سے بادشاہوں اور حکمرانوں کا پایہ تخت ہونے کی بنا پر فسادات کی زد میں رہا ہے۔ سید محمد لطیف تـــــاریخ لاہـــــور میں لکھتے ہیں: "رچرڈ سٹل اور جان کروتھر، دو انگریز ۱۶۲۶ء میں جہانگیر کے دور حکومت میں تجارت کے غرض سے لاہور آئے۔ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ لاہور ہندوستان کے شہروں میں سب سے اچھا شہر ہے۔ یہاں ہر چیز باافراط دستیاب ہے۔" (۳۲) مُغلیہ دور میں لاہور پر خصوصی توجہ دی گئی۔ خوبصورت محلات، بارہ دریاں، باغ، مساجد اور کشادہ سڑکوں کی تعمیر کی گئی۔ لاہور کو ان خصوصیات کی بنا پر ہندوستان کے باقی شہروں پر فوقیت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت لاہور میں ہونے کے باعث اس کی اہمیت زیادہ تھی۔ لاہور میں ہر چیز کی افراط ہونے کی بنا پر بیرونی حملہ آور لاہور کا رخ ضرور کرتے اور کبھی مایوس نہ لوٹتے تھے۔ ان حملہ آوروں میں سب سے بڑی آزمائش لاہور کے باسیوں کے لیے سکھ بنے ہوئے تھے۔

سکھوں کی لوٹ مار، غارت گری و فسادات نے لاہور کی عوام کا جینا دو بھر کر رکھا تھا۔ سکھوں کی آئے دن کی چڑھائی و لوٹ مار نے لوگوں کا ذہنی و قلبی سکون تباہ کر دیا تھا۔ لوگ ہر دم سکھوں کی یلغار کے خوف سے کانپتے۔ سکھ آتے اور اُن کے گھر، کاروبار سب لوٹ کر چلے جاتے لیکن لوگ بے بس تھے اور اُن سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ ناول میں "بہادر علی" شہر کے لوگوں کو سکھوں کی یلغار اور شہر لاہور کے محاصرے کے بارے میں بتاتا ہے کہ کس طرح لوگ شہر میں محصور خالصوں کے خوف سے کانپ رہے تھے۔ "مہنگا سنگھ، گوجر سنگھ اور سوبھا سنگھ کی مثلیں شہر کو حصار میں لے چکی تھیں۔ ان کا مُطالبہ تھا کہ شہر میں جتنے قصاب گائے کا گوشت فروخت کرتے ہیں، ان کے ناک اور کان کاٹ کر خالصہ فوج کے حوالے کیے جائیں، دو دن سے شہر محاصرے میں تھا۔" (۳۳)

بہادر علی کے باپ شمشیر علی نے اُس وقت خالصوں کا بے جگری سے مقابلہ کیا تھا اور اسی مقابلے میں اپنی جان قربان کر کے بہادر و نڈر سپاہی کا خطاب پایا تھا۔ لاہور میں رنجیت سنگھ کا دور انیس ناگی کے مُطابق امن و امان کا دور تھا۔ اُس نے سکھوں کی غارت گری و لوٹ مار کو ختم کر کے لوگوں کو پر امن زندگی دی۔ انیس ناگی نے رنجیت سنگھ کے پر امن دورِ حکومت کا بیان کیا ہے۔ "رنجیت سنگھ نے جب سوبھا سنگھ، گوجر سنگھ اور مہنگا سنگھ کو فصیلوں کے شہر سے بھگا کر امن قائم کیا تو۔۔ بہادر علی کو خالصہ فوج میں سپاہی کی ملازمت مل گئی۔" (۳۴) رنجیت سنگھ خود سکھ تھا مگر وہ سکھوں کی دست درازیوں کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ خطے میں امن و سکون چاہتا تھا۔ ایسے میں مہاراجہ بننے کے بعد سب سے پہلے اُس نے سکھوں کا زور توڑا۔ پرویز عزیز الدین احمد نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت کو "سنہری دور" کہا ہے۔ لکھتے ہیں: "رنجیت سنگھ کے دورِ اقتدار میں تاریخ میں پہلی بار پنجاب ایک ایسا خود مختار علاقہ بن گیا جس کی باگ ڈور پنجاب کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے ایک مایہ ناز فرزند کے ہاتھ میں تھی۔ رنجیت سنگھ نے پنجاب کو متحد کیا،

اسے مضبوط بنایا۔"(۳۵)پنجاب میں سکھ حکومت کا خاتمہ انگریز کے ہاتھوں ہُوا۔ انگریز جو چالاکی سے ہندوستان پر قابض ہوتا چلا گیا تھا۔ اُس نے اپنی فوج بھی تشکیل دی اور اُسے جدید اسلحے سے لیس کیا اور طاقت کے زور پر ہندوستان کی بڑی بڑی طاقتوں سے ٹکرایا اور اُنہیں شکست فاش دی۔ انگریزوں اور سکھوں کے مابین جنگ کے نتیجے میں سکھوں کی شکست اور انگریز کے لاہور پر تسلط کے حوالے سے سید محمد لطیف تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں:"لاہور پر برطانوی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ برطانوی فوج ۲۰ فروری ۱۸۴۶ء کو سکھوں کے دار لحکومت میں آئی اور قلعہ میں انگریز فوجوں نے چھاؤنی قائم کر لی۔"(۳۶) سکھوں کے زوال اور پنجاب کے الحاق کے بعد انگریز کی سلطنت بلا شرکت غیرے قائم ہو گئی۔ سکھوں کے زوال کے بعد بہادُر علی کو انگریزی فوج میں شمولیت کا پروانہ جاری ہو جاتا ہے اور وہ اپنی خدمات انگریز فوج کیلئے وقف کر دیتا ہے۔ انیس ناگی نے ناول میں خالصہ فوج اور حکومت کے زوال کے بعد انگریزی حکومت کے ربط ضبط کو بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ پنجاب کے الحاق کے بعد انگریزوں کی برصغیر پاک و ہند کے نظام میں تبدیلی قابلِ ذکر ہے۔ انگریز نے ہر شعبہ زندگی میں تغیر و تبدل سے کام لیا۔ نئی اصلاحات نافذ کیں۔ ریلوے لائنیں بچھائی گئیں۔ انیس ناگی بیان کرتے ہیں۔"ہاتھوے نے چیف کمشنر پنجاب کو اطلاع دی تھی کہ لندن سے ایک دو ماہر انجینئر بلانا ضروری تھا۔ شہر کے باہر ریلوے لائنیں بچھانی تھی۔ پنجاب کے الحاق کے بعد انگریز حکمرانوں نے اپنی عملداری کو موثر بنانے کیلئے اس علاقے کے ہر ضلع اور ہر ڈویژن میں انتظامی ڈھانچوں کو بڑی سُرعت سے قائم کیا۔"(۳۷)

اس کے ساتھ ساتھ انگریز کے ہاں سے لوگوں کو نوکری اور وظیفے ملنے لگے۔"انگریزوں کی انتظامیہ کے نئے ڈھانچے اور عمارتوں کی تعمیر سے شہر کے کھتری، نوابوں کے ایک دو خاندان اور بہت سے جاگیر دار پنجاب کے الحاق کے ساتھ ہی انتظامیہ کے وظیفہ خوار بن گئے تھے۔"(۳۸)لوگوں کو اپنے جال میں پھانسنے کے لیے انگریز کی مہربانیوں کا احاطہ انیس ناگی نے بہت وضاحت سے کیا ہے۔ انگریز کی یہ تمام مہربانیاں ہندوستان کی بہتری کیلئے ہرگز نہ تھیں بلکہ اُن کا مقصد ہندوستان کے انتظامی ڈھانچے میں اپنے مُطابق تبدیلیاں لا کر، اپنی حکومت کا اثر و رسوخ جمانا تھا۔ تبھی انگریز زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلی کے ذریعے اجنبیت کی ساری دیواروں کو گرا کر ہندوستانی نظام کی جڑوں میں اُتر گئے اور اُسے اپنے نوکیلے ہتھکنڈوں سے کاٹ کے رکھ دیا۔ یہاں یہ امر بھی بجا ہے کہ انگریزوں کی نئی اصلاحات سے لوگوں کو بہر حال فائدہ پہنچا اور نظام زندگی میں بہتری نظر آنے لگی۔ اس حوالے سے سر سید احمد خان اسباب بغاوت ہند میں لکھتے ہیں:

"امن اور آسائش اور آزادی رستوں کا صاف ہونا۔ ڈاکوؤں، رہزنوں، ٹھگوں کا نیست و نابود ہونا، سڑکوں کا آراستہ ہونا، مُسافروں کی آسائش، بیوپاریوں کا مال دور دور بھیجنا، غریب اعلیٰ ادنیٰ کے خطوط کا دور دوست

ملکوں میں برابر پہنچنا، خونریزی اور خانہ جنگی کا بند ہونا، زبردست سے زبردست کا زور اُٹھنا اور اسی قسم کی بہت سی باتیں ایسی اچھی ہیں کہ کسی عملداری میں نہ ہوئی ہیں نہ ہوں گی۔"(۳۹)

انگریز نے ہر زبردست کو عقل اور طاقت کا استعمال کرتے ہوئے زیردست بنا لیا تھا۔ سماجی نظام میں بہتری آئی۔ لوگوں کے کام سہولت سے ہونے لگے۔ انگریزی حکومت سے پہلے لاہور کے گلی کوچے گندگی و غلاظت سے اٹے رہتے۔ صفائی کا نظام انتہائی ناقص تھا۔ نکاسی آب کا نظام تباہی کا شکار تھا۔ عوام کوڑا کرکٹ گلی محلوں میں ڈالتے جس کی بنا پر گندگی اور کیچڑ رہتی، انگریز نے صفائی کے محکمے کا اجرا کیا۔ لاہور کے گلی کوچے، محلے و بازار صاف ستھرے ہو کر الگ نقشہ پیش کرنے لگے تھے۔ کنہیالال لکھتے ہیں:"انگریزی عہد میں شہر کی غلاظت پاک ہوئی۔۔۔ کوڑا اُٹھوایا گیا۔ ہر ایک طرح کی صفائی و دُرستی عمل میں آئی، محکمہ صفائی مقرر ہوا۔"(۴۰) عوام کیلئے صاف پانی کا بندوبست کیا گیا، مدرسوں کا قیام عمل میں آیا۔ انگریز نے ہندوستان کو چھاپہ خانے سے متعارف کروایا۔ امن و امان کے قیام کا بھرپور اہتمام کیا گیا۔ پولیس کا محکمہ تشکیل دیا گیا۔ خطے میں اصلاح و بہتری کیلئے انتظامی بورڈ بنایا گیا جس کا کام مختلف شعبہ جات کے معاملات کو سنبھالنا تھا۔ ہسپتال قائم ہوئے۔ ضعیفوں کو وظائف دیئے گئے۔ غرض ہر طرح سے انگریز نے ہندوستان کے نظام پر اپنے اثرات مُرتب کیے۔ انگریز کی اصلاحات نے لوگوں کو فائدہ دیا۔ لوگ امن و امان کے قیام سے خوش تھے۔

انیس ناگی نے انگریزی نظام سے خوش، ہندوستانی عوام کی نفسیات کو بہت خوبی سے پیش کیا ہے کہ ہر شخص اپنا فائدہ سوچ رہا تھا، چاہے غلامی ہی کیوں نہ سہنی پڑے۔ "ظاہری طور پر لوگ نئی انتظامیہ کے خیر خواہ تھے یا بننے کی کوشش میں مصروف تھے کہ انہیں ایک بہتر زندگی کا اسلوب نظر آرہا تھا۔"(۴۱) انگریز نے جہاں مختلف شعبہ ہائے جات میں تبدیلیاں کیں وہیں ایسے اقدامات بھی سامنے آئے جس سے لوگوں میں بے چینی و اضطراب نے جنم لینا شروع کر دیا۔ انیس ناگی نے تاریخ سے ۱۸۵۷ء کے دور کے اہم حکومتی اراکین، فوج کے اہم افسران و پادریوں کے ذریعے ناول کی کہانی کا تانا بانا بُنا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حقائق، اسباب اور پس منظر کو بیان کرتے ہوئے دورِ قدیم سے ماضی کے اہم واقعات کو کرداروں کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔ انیس ناگی کا مشاہدہ اور معلومات قابلِ تحسین ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے تاریخی دور کی سیاسی و سماجی زندگی کا عکس حقائق کے التزام کے ساتھ ناول میں نظر آتا ہے۔ پنجاب کے الحاق کے بعد انگریز کی نئی اصلاحات نافذ کرنا اور لوگوں کا انگریزی حکومت سے خوش ہو کر غلامی میں زندگی گزارنا انیس ناگی کے تخلیق کردہ باہمت کرداروں کیلئے نہایت تکلیف کا باعث تھا۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ بہادر علی، دلاور علی، پرکاش سنگھ یا مولوی حسام الدین اس امن و امان اور نظامِ زندگی کی بہتری سے ناخوش تھے یا وہ لوگوں کا سکون نہیں چاہتے تھے۔ اس سارے آرام و آسائش کے پردے کے پیچھے اصل وجہ کچھ اور تھی۔

انگریز کے پیش نظر ہندوستانیوں کی بہتر وآرام دہ زندگی اور سکون نہ تھا بلکہ اس سب کے پیچھے انگریز کے سیاسی، مذہبی و معاشرتی مقاصد تھے۔ لوگوں کو جہاں سہولیات کا لالچ دے کر رام کیا گیا وہیں انگریز نے عیسائیت کا پرچار بھی شروع کر دیا۔ انیس ناگی نے اس نکتے کو ناول میں بار بار اُٹھایا ہے کہ انگریز لوگوں کو عیسائیت کی طرف راغب کرنے کی پوری سعی کر رہا تھا۔ ایسے میں معاشرے کا محدود طبقہ تشویش اور اضطراب کا شکار تھا۔ باقی معاشرہ بے حسی میں مبتلا تھا۔ انگریز نے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی مذہبی رسومات کو شدید ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ انگریز مذہب کے حوالے سے مسلمانوں کو شدت پسند سمجھتے تھے۔ اُنہیں مسلمان قوم کے جہاد اور مذہب کے حوالے سے تحفظات سے خطرہ لاحق تھا۔ اس کا اظہار ناول میں بخوبی ملتا ہے۔ "فوجیوں کے مُسلسل اصرار کے باوجود جنرل کورے نے چھاؤنی کی حدود میں کسی عبادت گاہ کی تعمیر کی اجازت نہیں دی تھی۔۔۔ "نونو" مسلمان بہت ڈینجرس ہیں۔ وہ مسجد میں سیاست کرتے ہیں، مُجھے ہسٹری دُہرانے کی ضرورت نہیں۔" (۴۲)

تاریخ گواہ ہے کہ انگریز قوم کے دل میں مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ نفرت انگیز جذبات رہے ہیں۔ انگریز مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں پر ہمیشہ شک کرتا آیا ہے۔ انیس ناگی نے مسلمانوں کے حوالے سے انگریزوں کی متعصبانہ سوچ کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ انگریز نے ہندوستان میں اپنے قدم جماتے ہی عیسائیت کی تبلیغ کرنا شروع کر دی تھی۔ ایسے میں مسلمان چپ نہ رہ سکے۔ انیس ناگی نے مسلمانوں کی دلی وجذباتی کیفیت کا اظہار بخوبی کیا ہے۔ ناول کا ایک اور جانباز کردار، مولوی حسام الدین، انگریزوں کے اس اقدام کے ردِ عمل میں لوگوں کو آواز اُٹھانے اور انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کا درس دیتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ عمل جہاد ہے۔ دین کی حفاظت اور بچاؤ ہم مسلمانوں کا فرض ہے۔ "یہ جہاد ہے، فرنگیوں کو یہاں سے نکالنا ضروری ہے، تمام لوگوں کو عیسائی بنا رہے ہیں۔" (۴۳) عیسائیت کی تبلیغ کے حوالے سے ناول میں انگریزوں کی حکمت عملی سے پردہ اُٹھایا گیا ہے کہ انگریز نے اپنے اس مشن کو پورا کرنے کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے اپنائے۔ "میگڈن چرچ کا پادری ولیمز۔۔ یہاں ایک خاص مشن کے تحت بھیجا گیا تھا کہ وہ نہ صرف میاں میر چھاؤنی میں نئے عظیم الشان چرچ کا بندوبست کرے بلکہ وہاں مشنری سکول کھولے، اور مفت تعلیم کے ذریعے علاقے کے غریب غربا کو ملازمت کا وعدہ دے کر مقامی لوگوں کو عیسائیت کی طرف راغب کرے۔" (۴۴) انگریز نے مشنری سکول کھولے جہاں عیسائیت کی تعلیم ضروری قرار دی گئی تھی۔

غربت کے ستائے ہندوستانی اسی بات پر خوش تھے کہ اُن کے بچوں کو مفت تعلیم دی جا رہی ہے۔ ایسے میں انگریز نے اُن کو ملازمت کا لالچ بھی دیا، جس سے اُنہیں اپنے معاشی حالات میں بہتری کے امکانات نظر آنے لگے۔ لوگوں کے پیش نظر وقتی طور پر حالات کی بہتری اور ضروریات زندگی کے پورا ہونے کی سبیل کا حصول تھا۔ اس کے دیرپا اثرات سے لوگوں کو غرض نہ تھی۔ پادریوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے طریقہ کار کو

بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا۔ پادریوں کی کثیر تعداد ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیل کر اپنے مشن پر لگ گئی۔ اس حوالے سے سید خورشید مصطفیٰ رضوی لکھتے ہیں:

"ملک میں ہر جگہ عیسائی مشنری اور پادری اس کثرت سے نظر آنے لگے کہ نہ صرف ہر اسکول، ہسپتال، جیل خانہ بلکہ بازاروں میں بھی نمایاں ہونے لگے۔ اُنہوں نے پبلک مقامات پر وعظ شروع کیے۔ صرف عیسائیت کے پرچار پر بھی بس نہیں کیا بلکہ ہندو مسلمانوں کے مذہبوں، رسم ورواج اور عقائد کا کھلے عام مذاق اُڑایا۔"(۴۵)

ہندوستان کا وہ طبقہ جو اس تبلیغ سے ناخوش تھا، اُس طبقے کی نمائندگی ناول میں بخوبی کی گئی ہے۔ انیس ناگی نے کرداروں کے ذریعے اُس دور کی مخدوش حالت کا نوحہ بیان کیا ہے۔ سر سید نے بھی اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ لوگوں کو کس طرح سے لالچ کے ذریعے عیسائیت کی طرف راغب کیا گیا۔ سر سید لکھتے ہیں۔

""سب کو یقین تھا کہ ہمارے گورنمنٹ اعلانیہ جبراً مذہب بدلنے پر نہیں کریں گے بلکہ خفیہ تدبیریں مثل نابود کر دینے علم عربی و سنسکرت کے اور مفلس اور محتاج کر دینے ملک کے اور لوگوں کو جو اُن کا مذہب ہے اس کے مسائل سے ناواقف کر کر اور اپنے دین و مذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کر دیں گے۔"(۴۶)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگریز کا ایشیائیوں کے ساتھ رویہ اور طرزِ عمل بدلنے لگا تھا۔ انگریز کے رویے میں طاقت اور گھمنڈ الحاق پنجاب کے بعد ہی آ گیا تھا مگر اب اُس کا اظہار کھُل کر ہونے لگا تھا۔ انگریز نے فوج میں جبری بھرتی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انیس ناگی کے ناول کا کردار بشن لال، جو ایک وکیل ہے۔ وہ انگریز کے طرزِ عمل پر شدید غصّے کا اظہار کرتا ہے۔" دن بدن نئے قانون بنائے جارہے ہیں۔ ادھر لگان بڑھا دیا ہے، جبری بھرتی سارا سال رہتی ہے۔ ہر گھر سے ایک جوان لیا جاتا ہے، جو انکار کرتا ہے، اس کا پانی بند، لگان میں اضافہ، چوری کے مقدمات۔۔"(۴۷)

جو لوگ اپنے حقوق کا ادراک رکھتے تھے وہ انگریز کے ظلم کے خلاف بول رہے تھے۔ آواز اُٹھا رہے تھے۔ انگریز کے نئے نئے اقدامات لوگوں کے معاشی حالات تباہ کر رہے تھے۔ غربت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ لوگوں کے پاس کھانے کو، اپنے بچوں کو کھلانے کو کچھ نہ بچتا۔ کسان سارا سال فصل پر محنت کرتے اور انگریز اُن کی محنت پر ہاتھ صاف کر جاتا۔ مگر عوام کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے کیونکہ اُن کے اپنے زمیندار اور جاگیر دار اُن کی زندگیوں کے مالک بن بیٹھے تھے اور خود ہی انگریزوں سے بالا بالا سب معاملات طے کر لیتے جس کی غریب کو کانوں کان خبر نہ ہوتی اور وہ کنگال ہو جاتا۔ زمیندار، مزارعوں کو فوج میں جبری طور پر بھرتی کروا دیتے اور خود انگریز سے فائدہ وصول کر لیتے۔ عام آدمی کی حیثیت جانور جیسی ہو کر رہ گئی تھی۔

انیس ناگی نے ان تمام حالات کو ناول میں خوب سمیٹا ہے۔"اکثر لوگ بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کے مزارعے تھے، ان کے مالک سرکار سے اپنا معاملہ خود ہی طے کرتے تھے۔ بڑے زمیندار اپنے مزاروں کو جبری بھرتی کراتے۔"(۴۸)انگریز نے برصغیر پاک وہند پر حکومت کی اور اُسے خوشحال سے بدحال کر دیا اور خود ہر چیز کا مالک بن بیٹھا۔ لوگوں کی خون پسینے کی کمائیوں پر ہاتھ صاف کیا گیا، صنعت و حرفت میں قدم جمائے تو صرف اور صرف اپنا فائدہ پیش نظر رکھا۔ مزدور، کسان سبھی دہائی دے رہے تھے۔ انگریز کی نئی نئی اصلاحات نے جہاں لوگوں کو سہولتیں دیں وہیں اُس کے نتائج اُن کی زندگیوں پر منفی اثرات بھی مُرتب کرتے گئے۔ میاں محمد شفیع لکھتے ہیں:"نئی حکومت کی برکتوں میں کال اور وبائیں ٹوٹ پڑیں۔۔۔ کسانوں، پیشہ وروں اور مزدوروں پر خاص طور پر اثر پڑا۔ غریب طبقے تھے، جان بھی گئی، فاقے بھی کیئیے۔"(۴۹)دلاور علی، انگریز کے ظلم پر کڑھتا رہتا۔ اندر ہی اندر اُس کے دل میں انگریز سے نفرت کے شدید جذبات پروان چڑھ رہے تھے۔ وہ اکیلا ان حالات کو نہیں بدل سکتا تھا۔ اُس کی انگریز سے نفرت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ جس پر اُس کا باپ بہادر علی پریشان ہو جاتا۔ وہ خود تو فوج میں کسی بڑے عہدے پر نہیں پہنچ پایا تھا مگر بہادر علی کو وہ فوج میں کمیشن دلوانا چاہتا تھا۔ اُس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ اپنے انگریز افسر سے دلاور علی کے لیے بات کرے گا مگر دلاور کسی صورت انگریز کی نوکری کے حق میں نہ تھا۔ دلاور علی، باپ سے بحث کرتا۔"نہیں ابا میں گورا فوج میں نہیں جاؤں گا۔ اگر تم مان جاؤ تو میں مناواں میں مُربعے پر چلا جاتا ہوں۔ اپنے ہاتھ سے اپنی زمین کاشت کروں گا، نہ کسی کا خوف نہ کسی کا حکم۔"(۵۰)

انیس ناگی نے دلاور علی کے ذریعے اُس دور کی نوجوان نسل کی نفسیات اور سوچ کو واضح کیا ہے جو پُرجوش اور پرعزم تھی۔ جو ڈر ڈر کے جینے کی بجائے اپنے زور بازو پر کچھ کر دکھانا چاہتی تھی۔ دلاور علی جوش، ولولے، جذبے و اُمید سے بھرپور نوجوان ہے جو غلامی میں زندگی بسر نہیں کرنا چاہتا۔ اپنے دم پر اپنے حالات سے لڑنے اور انہیں بدل دینے کا خواہاں ہے۔ دلاور علی کی انگریز مخالف سوچ بجا تھی۔ کیونکہ انگریز کا ہندوستانیوں کے ساتھ رویہ روز بروز ہتک آمیز و نفرت انگیز ہوتا جا رہا تھا۔ انیس ناگی اپنی تحریروں میں عام آدمی کی عزت نفس کے حق میں آواز اُٹھاتے آئے ہیں۔ امیر طبقہ کے ہاتھوں غریب و متوسط طبقے کی عزت کی دھجیاں اُڑتے دیکھ کر خاموش نہیں رہ پاتے اور اُس کی کڑے الفاظ میں مذمت کرتے ہیں۔ ناول میں انیس ناگی نے انگریز کے ہاتھوں ایشیائیوں کی ہتک اور بے عزتی کی المناک صورتحال کو دکھایا ہے۔

مسلمان، سکھ اور ہندو کس طرح ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل، انگریز کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے اور اسی چیز نے اُن کے دلوں میں بغاوت کی آگ کو بھڑکایا اور پورے ہندوستان میں انگریز کو ہلا کر رکھ دیا۔ انیس ناگی نے بغاوت کے اسباب و انقلابی جدوجہد کی بہت خوبی سے منظر کشی کی ہے۔ انگریز ایشیائیوں کو انتہائی حقارت کی نظر

سے دیکھتے اور اُنہیں کمتر سمجھتے تھے۔ انگریز افسران کے اجلاس میں شہر کے رئیس اور سربراہ بھی شریک تھے۔ ڈپٹی کمشنر ایجرٹن، ملٹری سیکرٹری کرنل میکفرسن سے بات چیت کے دوران ایشائیوں کا تمسخر اُڑاتے ہوئے کہتا ہے۔"طاقت کا استعمال اس وقت کیا جائے جب مضبوطی ہو، دیکھتے ہو تم ان لوگوں کو"اُس نے شامیانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں شہر کے رئیس اور سربراہ کچھ گھبرائے ہوئے۔۔ بیٹھے سرگوشیوں میں لب ہلا رہے تھے۔"(۵۱)انگریز کی نظر میں ایشیائیوں کی کوئی وقعت و حیثیت نہ تھی۔ انگریز کا بے رحمانہ سلوک اور رویہ مسلمان، ہندو و سکھ سب سے ایک جیسا تھا۔ انگریز کا سلوک ایشیائیوں کے ساتھ انتہائی ظالمانہ ہوتا جارہا تھا۔"میجر سپنسر گورا فوج میں ڈسپلن اور سفاکی کیلئے مشہور تھا۔ جلیانوالہ جنگ میں اس نے کافی نام پیدا کیا تھا۔ وہ جنگی قیدیوں کو توپ کے ساتھ باندھ کر اُڑانے میں ماہر تھا"۔(۵۲)میجر سپنسر کی بیوی ماریا اُسے خبردار کرتی کہ ہم یہاں غیر ملک میں ہیں۔ ہمیں زیادہ سختی کا نقصان اُٹھانا پڑ سکتا ہے۔ مگر میجر سپنسر اپنی طاقت کے نشے میں مبتلا، انگریز کی طاقت کا اظہار گھمنڈ اور غرور سے یوں کرتا ہے۔"بلڈی نیگرز۔۔یہ بے حد کمزور قوم ہے۔ خوف ان کی زندگی ہے۔ اگر ان میں ردِ عمل کی صلاحیت ہوتی تو آج ہم کلکتہ سے پنجاب تک سب کو روندتے ہوئے نہ پہنچتے۔"(۵۳)

انگریز ابتدا میں نہایت چالاکی و چالبازی کے ساتھ برصغیر پاک و ہند میں داخل ہُوا اور حکمرانوں اور بادشاہوں کی لاپرواہیوں اور مفاد پرستوں کی وجہ سے اُس کے قدم جمتے چلے گئے۔ یہاں تک کے بادشاہ محض کٹھ پُتلی بادشاہ بن کے رہ گئے جنہیں انگریز وظائف دے کر خاموش رکھتے اور خود ملک اور عوام پر اپنے قوانین لاگو کرتے۔ انگریز کی نظر میں بادشاہ کی حیثیت محض وظیفہ خوار کی تھی۔ ناول میں انیس ناگی نے بہادر شاہ ظفر کا انگریز کے ساتھ ساتھ ایشائیوں کی نظر میں کردار اور اہمیت کا اظہار فکر انگیز جملوں کے ذریعے بہت خوبی سے کیا ہے۔ دو انگریز فوجی افسران بادشاہ کے حوالے سے گفتگو کے دوران اُس کا تمسخر اُڑاتے ہیں۔"ینگ مین کون سا کنگ آف دہلی، وہ ۱۸۰۴ء سے ہمارا پنشن خوار ہے۔ اس کی تو دلی میں بھی حکومت نہیں ہے۔ اس کا سارا عملہ ہمارے لیے کام کرتا ہے۔"(۵۴)

سراج الدین بہادر شاہ ظفرؔ، تیموری خاندان کے آخری بادشاہ جن کی عمر، انگریز کی آمد کے وقت لگ بھگ ۸۲ برس تھی، کو انگریز نے مکمل طور پر اپنے بس میں کر لیا تھا۔ بہاذر شاہ ظفرؔ ایسے بدنصیب شاعر تھے کہ جنہیں ڈھنگ سے بادشاہت و حکومت کا موقع نہ مل پایا۔ جن کے بزرگوں سے برصغیر پاک وہند کا چپہ چپہ لرزتا تھا، جن کی عظمت و دھاک ایک عالم میں تھی، وہ بادشاہ انگریز کے زیر نگیں ہو کر رہ گیا تھا۔ بہاذر شاہ ظفر کی حیثیت کٹھ پتلی و قیدی بادشاہ کی سی تھی جن کے نہ تو کسی حکم کی اہمیت تھی نہ کسی فرمان کی۔ سید محمد لطیف تـاریخ پنجـاب میں لکھتے ہیں:"دہلی کا بوڑھا بادشاہ، جو محض کٹھ پتلی اور تیموری نسل کا واحد نمائندہ تھا، حکومت برطانیہ نے فیاضی سے کام لیتے ہوئے اسے ایک فیاضانہ وظیفہ فراہم کیا تھا اور جو ایک موروثی دعویدار کے طور پر نہیں بلکہ تاج برطانیہ کے تابعدار

کی حیثیت سے مغل اعظم کے محل میں پر امن طور پر رہ رہا تھا۔"(۵۵)بادشاہ انگریز کے سامنے کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا، انگریز نے اُس کے تمام پر نوچ کر اسے معذور کر دیا تھا۔ میاں محمد شفیع لکھتے ہیں:"سطوت تیموری کا آخری نام لیوا مرحوم بہادر شاہ ہے۔ جس کی سطوت لال قلعے میں بھی پورے طور پر اثر انداز نہ تھی۔"(۵۶)جو جاہ و ثروت و جلال بہادر شاہ ظفر کے بزرگوں کو نصیب ہوا وہ ان کو نہ مل سکا اور اس بادشاہ میں وہ چالا کی وعیاری نہ تھی جو انگریز کی چالوں اور پیش قدمیوں کو سمجھ پاتی۔ وہ بادشاہ جو خود اپنے حق کی حفاظت کرنے سے معذور تھا، وہ اپنی عوام ورعایا کے حقوق کی حفاظت کیا کرتا۔ انگریز نے ایشیائیوں پر ظلم وستم کے بازار گرم کیے ہوتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ بدترین سلوک ہو رہا تھا۔ اُنھیں ذرا سی غلطی کی عبرت ناک سزائیں دی جارہی تھیں مگر بادشاہ کے ہاتھ کٹے ہوئے تھے۔ اسی بنا پر بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی حیثیت صرف انگریز کی نظر ہی میں نہیں بلکہ عوام کی نظر میں بھی بے کارِ محض کی سی تھی۔ اس کا اظہار انیس ناگی نے واضح الفاظ میں کیا ہے۔ دلاور علی اپنے دوست کشن لال سے حالات کی ابتری اور مظلوم ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کے ناروا سلوک پر کڑھتے ہوئے کہتا ہے۔

"یہ کہاں کا قانون تھا کہ گپتا اور معراج کو پرانی چھاؤنی انار کلی کے باہر ڈپٹی کمشنر ایجرٹن نے توپوں سے باندھ کر اُڑا دیا تھا۔ سزا عبرتناک سزا، کہ سب خاموش رہیں، ان کے اوپر دہشت کا غلبہ رہے۔ آدھے شہر نے فصیلوں سے باہر نکل کے یہ منظر دیکھا اور پھر سر جھکا کر انہی فصیلوں کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔۔ ہمارا بادشاہ خاموش کیوں ہے؟ اس لیے کہ وہ پنجرے میں ہے، پنشن خوار ہے، وہ ضعیف ہے، بے عمل ہے۔"(۵۷)

انیس ناگی نے لوگوں کی بے حسی وخود غرضی سے زیادہ کم ہمتی پر طنز کیا ہے کہ جب انگریز کسی کو ذرا سی غلطی پر توپ سے باندھ کر اُڑا کر خاک کر دیتے تھے تو باقی لوگ خاموشی سے یہ ظلم وستم دیکھتے اور پھر خاموشی سے ہی سر جھکا کر سب کچھ سہہ جاتے اور اپنے حالات پر صبر کرتے گویا یہ سب اُن کی تقدیر میں لکھا ہے۔ جبکہ کچھ لوگ جو اگرچہ کر کچھ نہیں سکتے تھے مگر ان حالات کو قبول کرنا بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ اُن کے دلوں میں بغاوت کا شعلہ بھڑک رہا تھا۔ انہیں ایک ایسی چنگاری کی تلاش تھی جس میں ضم ہو کر وہ سارے دشمن وفتنہ پرور عناصر کو جلا کر راکھ کر دیں۔ بہادُر علی، پرکاش سنگھ سے بادشاہ کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔"بادشاہ کیا کر سکتا ہے وہ فرنگیوں کا نہیں اپنی کمزوریوں کا قیدی ہے، جو شخص ساری عمر شاعری، زنانخانے اور ہیجڑوں میں بسر کر دے وہ ایک بڑی طاقت کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے۔"(۵۸)

انیس ناگی نے بہادر شاہ ظفر کی انگریز کے سامنے پسپائی وشکست کے حوالے سے انتہائی کڑا طنز کیا ہے۔ بادشاہ کو شعر وشاعری و دیگر خرافات سے فرصت ملتی تو وہ مملکت کو دیکھتا اور اُس کی باگ ڈور سنبھالتا۔ اُس میں وہ قائدانہ صلاحیتیں ناپید تھیں جو ایک بادشاہ کو عوام کی نظر میں قابل ادب بناتی ہیں۔ سرسید کے خیالات انیس ناگی کی معلومات کو سند فراہم کرتے ہیں۔ سرسید اس ضمن میں لکھتے ہیں:"دلی کے بادشاہ کو کوئی شخص ولی اور مقدس نہیں

سمجھتا تھا۔اس کے منہ پر لوگ اس کی خوشامد کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے ہنستے تھے۔"(۵۹) انیس ناگی نے انگریز کے ہاتھوں فوج میں کالے سپاہیوں پر ہونے والی زیادتیوں سے بھی پردہ اُٹھایا ہے۔ناول میں اس کا اظہار مختلف پیرایوں میں ملتا ہے۔ انگریز نے ہندوستان میں اپنی جڑیں گہری کرنے کے لیے جو فوج تشکیل دی اُس میں انگریز سپاہیوں کے ساتھ ساتھ مسلمان، ہندو اور سکھ سبھی شامل تھے۔ انگریز فوج گورے سپاہی جبکہ دیسی فوج کالے سپاہی کہلائے جاتے تھے۔رنگ و نسل کی بنیاد پر فوج کے ساتھ اچھا اور بُرا رویہ اپنایا جاتا تھا۔کالے سپاہیوں کی حیثیت غلام سے بڑھ کر نہ تھی۔ انگریز نے اُن کی ترقی کی راہیں مسدود کی ہوئی تھیں۔اُن سے کام زیادہ لیا جاتا جبکہ صلہ بہت کم دیا جاتا تھا۔فوج میں بڑے عہدے صرف انگریز فوجیوں کیلئے مخصوص تھے۔ دیسی فوج کے بیشتر سپاہیوں کے دل میں اس امتیاز نے بغاوت کے جذبات کو اُبھارا۔انیس ناگی بیان کرتے ہیں۔"ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں اگر مقامی سپاہیوں کی ترقی کے مواقع ہوتے تو بہادر علی اس وقت میجر یا کرنل کے عہدے پر ہوتا۔لیکن کمپنی کے فوجی ضوابط کے مُطابق مقامی فوجی کی ترقی کا آخری زینہ صوبیدار میجر ہوتا تھا، فوج کی کمان یا افسری صرف گوروں کیلئے وقف تھی۔"(۶۰)

انگریز کو مقامی سپاہیوں کی قربانیوں سے، جنگوں میں اپنی جانیں دینے سے، اُن کی کارکردگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ فوج میں ترقی مقامی سپاہیوں کا مقدر نہ تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ رنگ و نسل کا امتیاز تھا۔ انگریز خود کو برتر اور ایشیائیوں کو کمتر سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز کو کسی صورت ایشیائیوں پر اعتبار اور بھروسہ نہیں تھا۔ انگریز کے نزدیک ہندو، مسلمان اور سکھ ناقابل اعتبار قومیں تھیں۔لہذا فوج میں اُنہیں بڑا عہدہ دینا اُنہیں کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ ڈپٹی کمشنر ایجرٹن ایشیائیوں کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔"میں ایشیائیوں پر اعتبار نہیں کرتا، وہ بظاہر غلاموں کی طرح اطاعت کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے اندر خاموشی کا غصہ کھولتا رہتا ہے۔"(۶۱)

انگریز کو پوربی سپاہیوں کے بغاوت و غصہ کے جذبات کا ادراک تھا۔ تبھی وہ اُن سے خبردار رہتے تھے۔ اور کسی صورت اُن پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ انگریز کو اس چیز کا احساس تھا کہ جیسے جیسے اُس کی برصغیر پاک و ہند کے مختلف خطوں میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے ویسے ویسے مقامی لوگوں کے دلوں میں اُس کے خلاف نفرت کا دائرہ بھی وسیع تر ہو رہا ہے۔ انگریز کو ہندوستان کی اقوام میں سب سے زیادہ خطرہ مسلمانوں سے محسوس ہوتا۔ فوج میں مسلمان فوجیوں پر بھی انگریز کو اعتبار باقی فوجیوں کی نسبت بہت کم تھا۔ انگریز آفیسر جان لارنس مسلمان فوجیوں پر بے اعتباری کا کھُل کے اظہار کرتا ہے۔"مجھے مسلمان سپاہیوں پر زیادہ اعتماد نہیں ہے۔"(۶۲) کیپٹن سکاٹ، اسسٹنٹ کمشنر ایلیٹ کو ایشیائیوں اور مقامی سپاہیوں کی فطرت پر تبصرہ کرتے ہوئے اُن سے محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہے۔وہ ایلیٹ کو سمجھاتا ہے کہ ان پر اعتبار کرنا دُرست نہیں۔ ایسا کہتے ہوئے مقامی سپاہیوں کے لیے اُس کے لہجے اور

انداز کی کڑواہٹ کو انیس ناگی نے خوب بیان کیا ہے۔ ''اسسٹنٹ کمشنر ایلیٹ، آپ ان کالوں کو نہیں جانتے، میں پانچ سالوں سے مختلف محاذوں پر لڑا ہوں، یہ لوگ دغاباز، عیار اور بظاہر بڑے مسکین ہوتے ہیں۔''(۶۳) اِسی بے اعتباری و نفرت و کینہ کے نتیجے میں بہادر علی فوج میں افسر نہ بن پایا تھا۔ جس کا اُسے شدید قلق تھا اور وہ اپنی اگلی نسلوں کو اس استحصال سے بچانے کا خواہاں تھا اور صرف وہی نہیں بہت سے ذہن ان خطوط پر سوچ رہے تھے، لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ انگریز معاشی طور پر مقامی سپاہیوں کا جس طرح سے استحصال کر رہا تھا، اُس کا اظہار ناول میں حقائق کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مقامی سپاہیوں کی تنخواہ، انگریز سپاہیوں سے کم اور اُن کی ضروریات زندگی کو پوری کرنے کیلئے انتہائی قلیل اور ناکافی تھی۔ انگریز نے یہ فرق روا رکھ کے ایشیائیوں کو احساس دلایا کہ وہ صرف اور صرف غلام ہیں۔ انگریز کو اُن کے مسائل اور تکلیفوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ ''گورے سپاہی کو چالیس روپے ماہوار مع وردی، کھانا اور سال میں ایک مرتبہ سمندری جہاز کا ولایت جانے کا مفت ٹکٹ بھی ملتا جبکہ مقامی سپاہیوں کو صرف بیس روپے، کھانا اور وردی ملتی۔''(۶۴) کالے سپاہیوں کے ساتھ تنخواہ کے معاملے میں انگریز کا امتیازی و ناروا سلوک اور غیر منصفانہ رویہ کا اظہار سید خورشید مصطفیٰ رضوی نے یوں کیا ہے۔

> ''پیادہ فوج کے دیسی سپاہی کو سات روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ جس میں سے اُسے وردی اور ڈرل (فوجی پریڈ) وغیرہ کیلئے روپیہ دینا پڑتا تھا۔ ڈرل کی فیس سولہ روپے تھی۔ سوار کو ستائیس روپے ملتے تھے۔ اُسے گھوڑا وغیرہ خود خریدنا پڑتا تھا۔ اس کے برعکس انگریز سپاہی کے رہن سہن، غذا اور دوسرے لوازمات کیلئے پوری فراخ دلی سے دیا جاتا تھا۔''(۶۵)

انگریز کی طرف سے دی جانے والی تنخواہ ویسے ہی قلیل تھی اور اُس میں سے بھی ایک سپاہی کو اپنی گھریلو ضروریات اور اخراجات کے ساتھ ساتھ فوجی ضروریات اور پیشہ ورانہ مشقوں کے اخراجات بھی خود اُٹھانے پڑتے تھے۔ ایسے میں اُس کی گزر اوقات انتہائی مشکل سے ہوتی تھی۔ مقامی سپاہیوں کے نصیب میں محض دال روٹی تھی بلکہ کئی مرتبہ وہ بھی نصیب نہ ہوتی تھی مگر کام اُن سے سب سے بڑھ کر لیا جاتا تھا۔ میاں محمد شفیع نے، مقامی سپاہی کے ساتھ انگریزوں کے ناروا اور بدتر سلوک کو، بغاوت کی ایک بڑی وجہ قرار دیا ہے کہ فوج کے ساتھ جو برتاؤ رکھا جا رہا تھا اُس نے بغاوت کے جذبات کو اُبھارا، بھڑکایا اور بالآخر آتش فشاں پھٹ پڑا۔ میاں محمد شفیع لکھتے ہیں:

> ''برصغیر ہند میں زیادہ تعداد دیسی فوج کی تھی۔ جنہیں انگریزی کمانڈر بہت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہندوستانی سپاہیوں کی ترقی کے راستے محدود تھے۔ ان کی تنخواہ کم اور ناکافی تھی۔ انگریز جرنیل اور کمانڈر فرعون خصلت تھے۔ اور معمولی سی بات پر انہیں گالیاں دیتے اور سزائیں سناتے۔ اس چیز نے ہندوستانیوں کے دل میں انگریز کے خلاف نفرت کی آگ اور بھڑکا دی۔''(۶۶)

مقامی فوجی اس امتیازی سلوک کو دیکھتے اور آپس میں بیٹھ کر انگریز کے خلاف نفرت کا اظہار کرتے۔ سب انگریز سے ڈرتے اور ان کے خلاف کوئی بھی قدم اُٹھانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ دلی غلامی کی اس کیفیت نے اُن سے آزادی کی سوچ بھی چھین لی تھی۔ وہ صرف باتوں کے ذریعے اپنا غصہ نکالتے رہتے۔ انیس ناگی نے مقامی فوج کے جذبات کی عکاسی خوب کی ہے۔ ”کمپنی کے دور میں سب کٹی ہیں۔ ترقی صرف گورے کو ملتی ہے۔ تین تین مہینے تنخواہیں نہیں ملتیں۔ سب گورے افسروں کے بنگلے ہیں لیکن ہم لوگوں کے لیے ٹوٹی پھوٹی بیر کیں۔“(٦٧)انیس ناگی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے لیے لمحہ بہ لمحہ بنتے ہوئے حالات کو بڑی چابکدستی اور حقائق کے التزام کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مقامی فوج کی حالت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان حالات میں فوج کا پُرسانِ حال کوئی نہ تھا۔ بادشاہ کو کسی سے کچھ سروکار نہ تھا چاہے عوام ہو یا فوج، اُس کو اپنے وظیفے سے غرض تھی کیونکہ وہ خود انگریز کا محتاج تھا۔ ملکی خزانے پر سے بادشاہ کا اختیار ختم ہو چکا تھا۔

مقامی فوج کے دل میں سلگتی چنگاری بھڑکتی ہوئی آگ میں اُس وقت تبدیل ہو گئی جب فوج میں چربی کے کارتوس آئے اور فوج کو اُنہیں استعمال کرنے کا حکم نامہ جاری ہُوا۔ چربی کے کارتوسوں نے مقامی سپاہیوں میں شدید بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ یہ بات پوری فوج میں گردش کر رہی تھی کہ فوج کو جن کارتوسوں کے استعمال کا حکم جاری ہُوا ہے اُن پر گائے اور سور کی چربی استعمال کی گئی ہے۔ کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹ کر استعمال کرنا تھا۔ اس سے مقامی فوج کے مذہبی جذبات کو شدید ٹھیس پہنچی۔ مقامی فوجیوں میں اس فتنے نے شدید اشتعال پیدا کر دیا۔ فوج میں چربی کے کارتوسوں کے حوالے سے چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ بہادر علی اور پرکاش سنگھ چربی کے کارتوس کے حوالے سے اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے ایک دوسرے کو آنے والے خطرے سے آگاہ کرتے ہیں۔ ”بہادر علی نے سنجیدگی سے کہا:“ چھاؤنی کی سب رجمنٹوں کو پتہ چل گیا ہے کہ چربی کے کارتوس میگزین میں پہنچ گئے ہیں۔ کیپٹن لارنس کل گورے سپاہیوں اور افسروں کو ہدایت کر رہا تھا کہ ایک دو دن میں ان کے چلانے کی تربیت دی جائے گی۔“ پرکاش سنگھ نے کہا۔ ”ہرے رام گاؤ ماتا۔“(٦٨)مقامی فوج اس صورت حال سے شدید غم وغصے کا شکار تھی۔ کارتوس چھاؤنیوں میں پہنچ گئے تھے۔ اگلا مرحلہ اُنہیں استعمال کرنے کی تربیت کا تھا۔ جس کے بعد یہ ضروری ہو جاتا کہ اُنہیں ہر صورت میں استعمال بھی جائے۔ یہ عمل مقامی فوج کے لیے قابل قبول نہ تھا۔ وہ ساری زندگی مختلف محاذوں پر لڑتے اور اپنی جانیں قربان کرتے آئے تھے۔ ہر حکمران کا حکم سر جھکا کر قبول کیا تھا۔ انگریز کی حقارت، نفرت اور ہر طرح کی ناانصافی واستحصال کو برداشت کرتے آئے تھے۔ مگر اب انگریز کے اس اقدام نے اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا۔ اب معاملہ مذہب اور اُن کی مذہبی اقدار کے پامال ہونے کا تھا جو ہمیشہ سے ہر دور میں حساس معاملہ رہا ہے۔ اسی لیے مقامی سپاہیوں کا خون بار بار جوش مارتا اور اُنہیں بغاوت پر آمادہ کر رہا تھا۔ ہر حکم کو سر جھکا کر برداشت کرنے

والے سپاہیوں کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔"ہم نے اُس کا ہر حکم مانا ہے لیکن دھرم کے معاملے میں ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔۔۔۔کارتوس کو ہم منہ سے نہیں کاٹیں گے۔"(۶۹)

فوج اور رعایا کو احساس تھا کہ بادشاہ کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔وہ اُنہیں اس آزمائش سے نجات دلانے سے قاصر ہے۔بادشاہ خود معذور ہے تو اپنی رعایا اور فوج کو کیا سہارا دے گا۔جو کرنا ہے اُنہیں خود ہی کرنا ہو گا۔اس چیز نے اُن میں بغاوت کی آگ کو اور بھڑکا دیا تھا۔لہذا مقامی فوج نے تہیہ کیا کہ وہ کارتوس کو منہ سے نہیں کاٹیں گے چاہے کچھ ہو جائے۔فوج کے اس اٹل فیصلے کے بارے میں سر سید لکھتے ہیں۔"اُس زمانہ میں جبکہ پنجاب میں قواعد جدید سکھانے کو متعدد رپلٹنوں کے آدمی جمع کیے گئے۔آپس میں یہ صلاح ٹھہری اور اس پر اتفاق ہوا کہ جدید کارتوس کبھی استعمال میں نہ لائیں گے۔"(۷۰)اس حوالے سے سر سید، اسبابِ بغاوتِ ہند میں مزید بیان کرتے ہیں۔"اُن کو نئے کارتوس دیئے گئے جس میں وہ یقین سمجھتے تھے کہ چربی کا میل ہے اور اس کے استعمال سے ہمارا دھرم جاتا رہے گا۔انہوں نے اس کے کاٹنے سے انکار کیا۔"(۷۱)

فوج کے پاس چربی کے کارتوس کو استعمال کرنے سے انکار کرنے کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔سب کچھ گنوا کے ایک مذہب بچا تھا۔جو اُن کی عزت نفس کی عمارت کی آخری اینٹ تھا۔انگریز اُسے بھی گرا کر ایشائیوں کی عزت نفس کو ملیا میٹ کر دینا چاہتے تھے۔اُن کا مقصد ایشیائیوں کا سیاسی، سماجی اور مذہبی زوال تھا۔مشتاق احمد علوی اپنے مضمون جنگ آزادی کے اسباب میں بیان کرتے ہیں۔"۱۸۵۷ء کے شروع میں سپاہیوں کو بندوق میں استعمال کرنے کے لیے ایسے کارتوس مہیا کیے گئے جنھیں دانتوں سے کُترنا پڑتا تھا۔اور یہ مشہور ہو گیا تھا کہ ان کارتوسوں پر گائے اور سور کی چربی لگائی گئی ہے۔اس چیز نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے جذبات کو اُبھارا۔" (۷۲)چربی کے کارتوس کی وجہ سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بغاوت کا آغاز ہو گیا۔وہ غصہ جو برس ہا برس سے سینوں میں دفن تھا وہ آتش فشاں بن کے نکلا۔تمام ہندوستانیوں کو متحد کرنے کی غرض سے ۱۸۵۷ء میں چپاتیاں تقسیم ہوئیں۔ان چپاتیوں کا مقصد انگریز کو تنبیہ کرنے کے ساتھ ساتھ تمام لوگوں میں بغاوت کے پیغام کو پھیلانا تھا۔یہ چپاتیاں بطور پیغامِ انقلاب تقسیم ہوئیں جن کے ذریعے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنا نیز باغیوں کا ساتھ دینے کا درس دینا تھا۔

ناول میں انقلابیوں نے ان چپاتیوں کے ذریعے اپنے حامیوں اور مخالفوں کو اپنے ارادے سے خبردار کیا۔میجر سپنسر کے بنگلے کے باہر سے کاغذ میں لپٹی کوئی چیز اندر لان میں آ گری۔میجر سپنسر جب کاغذ کو کھولتا ہے تو اُسے کاغذ میں روٹیاں لپٹی ملتی ہیں۔"اوہ مائی گاڈ دو روٹیاں"میجر سپنسر نے اطمینان کا سانس لیا۔"(۷۳)میجر نے ان روٹیوں کو بے کار سمجھا۔اُس کے نزدیک یہ ہندوستانیوں کے جادو شگون وغیرہ کے طریقے ہیں۔اُس کا سائیس اُسے حالات کی

نزاکت کا احساس دلاتا ہے۔ ''سر یہ ہمارے میس کی روٹیاں نہیں ہیں۔ میجر صاحب جھانسی سے کل میرا بھائی آیا ہے۔ اُس نے بھی بتایا ہے کہ دیہاتیوں میں اس قسم کی روٹیاں گھروں میں پھینکی جارہی ہیں۔''، ''اس کا مطلب کیا ہے؟''، ''صاحب مطلب تو ہمیں بھی نہیں پتہ، لیکن شگون اچھا نہیں ہے۔''(۷۴)ہندوستان میں چپاتیوں کا بٹنا اچھا شگون نہیں سمجھا جاتا رہا۔ انگریز آفیسر ز اس چیز کو ہندوستانیوں کی جادو ٹونے اور توہم پرستی سے منسوب کر رہے تھے۔ جبکہ لوگوں تک انقلاب کی لہر پہنچانے کے لیے روٹیاں تقسیم کی گئیں۔ اس حوالے سے سر سید احمد خان لکھتے ہیں۔'' وہ سنہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے اکثر ضلعوں میں دیہہ بدیہہ چپاتی بٹی اور اس کے قریب زمانہ میں سرکشی ہوئی۔ ''(۷۵)پھر سر سید بیان کرتے ہیں:''اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ چپاتی کسی سازش کی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ یہ قاعدہ ہے کہ اس قسم کی چیز البتہ ایک نشانی ہوتی ہے واسطے تصدیق زبانی پیغام کے ۔ ''(۷۶)انگریز جس چیز کو ہندوستانیوں کی توہم پرستی سے تعبیر کر رہا تھا۔ وہ چیز انگریز کے خبر ہونے تک پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔ ہر شخص چپاتیوں سے منسلک جذبہ ءانقلاب سے واقف تھا۔ خورشید مصطفیٰ رضوی، فرانسیسی خاتون ہورسٹ انگلیسی کا بیان نقل کرتے ہیں:''جب یہ کلچہ دست بدست ایک سپاہی سے دوسرے سپاہی کو ملتا ہے تو اُس پر نظر کرنے سے ہر سپاہی کا چہرہ متغیر ہو جاتا ہے۔ غیظ و غضب کے آثار بشرے سے ہویدا ہونے لگتے ہیں۔ اگرچہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے مگر دل ہی دل میں انگریزوں پر پیچ و تاب کھاتے ہیں۔''(۷۷) گویا ان چپاتیوں کے ذریعے ہر شخص تک انگریز کا ہندوستانیوں کے مذہب پر حملے کی کوشش، چربی کے کارتوس کی کہانی اور انقلاب کا پیغام پہنچ رہا تھا، ہر شخص چپاتیوں کو دیکھتے ہی شدید غصّے اور انتشار میں مُبتلا ہو جاتا اور انگریز کے خلاف اُس کی نفرت مزید بڑھ جاتی۔ چھاؤنیوں میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ مختلف جگہوں سے سپاہیوں کے کارتوس کو استعمال کرنے سے انکار اور باغی رویے سامنے آنے لگے۔

سب سے اہم واقعہ بارک پور میں پیش آیا۔ جب ایک انقلابی سپاہی ''منگل پانڈے'' نے انگریز آفیسر ز پر حملہ کر دیا اور باقی سپاہیوں کو بھی انقلاب اور بغاوت پر اُکسایا۔ مگر انگریز نے بر وقت اقدامات کر کے سپاہیوں پر قابو پالیا اور منگل پانڈے کی موت کے ساتھ اُسکی بغاوت کی کوشش بھی کچل دی گئی۔ مگر یہ ناکامی وقتی تھی۔ پورے مُلک کے مختلف علاقوں سے انگریزوں کو بغاوت کی خبریں ملنے لگیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بغاوت کی خبروں نے انگریز کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ انگریز کو اپنی طاقت پر زعم تھا مگر جب اُسے بغاوت کے تیزی سے پھیلنے کی اطلاعات موصول ہوئیں تو انگریز بوکھلا گئے۔ جنرل کورے جو اپنی رعونت کے حوالے سے مشہور تھا، اُسے ایشیائیوں کی پس ماندگی اور انگریزوں کی برتری، طاقت و مضبوطی کا بے حد زُعم تھا۔ اُسے ٹیلی گرام موصول ہوا، جس میں انقلابیوں کی فتوحات کا ذکر تھا۔ وہ بُری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ''انبالہ چھاؤنی مقامی فوجیوں کی بغاوت۔۔۔ پھلور

چھاؤنی، تمام یورپین فوجیوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ دہلی چھاؤنی کو آگ لگا دی گئی ہے۔ بادشاہ کے قلعے میں موجود تمام یورپین عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ "اوہ مائی گاڈ"۔۔۔۔ یو سنز آف بچ۔"(۷۸)انقلابی اپنی فتوحات کا دائرہ بڑھاتے ہوئے، انگریزوں کو کچلتے اور قتل کرتے ہوئے، قلعے تک جا پہنچے تھے۔ اُس وقت کی صورتحال کو انیس ناگی نے انسانی نفسیات کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے کہ جن لوگوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا آج وہ بے قابو ہوئے جاتے تھے۔ کوئی چیز اُن کا راستہ نہیں روک پا رہی تھی۔ ایک جذبہ، ایک احساس تھا جو ان کی ہمت بندھائے ہوئے تھا۔ اس وقت اُن کے پیش نظر سوائے آزادی کے اور کوئی چیز نہ تھی۔ اور آزادی کا حصول انگریز کو شکست دیئے بغیر ممکن نہ تھا۔ انقلابیوں کی میرٹھ سے دہلی کی طرف پیش رفت کے حوالے سے میاں محمد شفیع بیان کرتے ہیں: "راتوں رات چل کر اور راستے میں انگریزوں اور عیسائیوں کو قتل کرتے ہوئے صبح کے وقت ۱۱ مئی کو پل سے گزر کر قلعے اور شہر کے دروازوں پر جھپٹے۔"(۷۹)انقلابیوں کی اس پیش رفت کے حوالے سے انگریزوں نے فوری اقدامات اُٹھانے شروع کر دیئے۔ انگریزی فوج نے بغاوت کے سدباب کے لیے فوری طور پر فوجی افسران کا اجلاس بُلایا، جس میں مقامی اُمرا اور رؤساء بھی شریک تھے۔ کمشنر رابرٹس نے شرکا کو حالات کی نزاکت سے آگاہ کیا کہ حالات بگڑ چکے ہیں۔ مختلف چھاؤنیوں میں چربی کے کارتوس کو لے کر بغاوت ہو چکی ہے اور میاں میر چھاؤنی کے مقامی سپاہیوں نے بھی کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ انگریز باغیوں کو کچلنے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کر رہا تھا۔ تاکہ بغاوت پورے برصغیر پاک و ہند میں نہ پھیل جائے۔ ایسے میں انگریز نے بڑی چالاکی سے لوگوں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھایا اور باغیوں کے سر کی قیمت لگا دی۔ انیس ناگی نے انگریز کے بغاوت کو کچلنے کے ضمن میں اقدامات کو، انگریزی فوج کی بے چینی و پریشانی کو بہت خوبی سے واضح کیا ہے۔ انگریز جو ہندوستانیوں کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھتے تھے، اُنہیں غریب و مسکین ہندوستانیوں سے اس جرأت کی قطعاً توقع نہ تھی۔ اب انگریز نے ایک نئی چال چلنی شروع کی۔ "دیہاتیوں میں منادی کرا دی ہے کہ جو باغی کا سر قلم کرے گا، اُسے بیس روپے انعام دیئے جائیں گے۔"(۸۰)انگریز نے انسانی جان کی قیمت بیس روپے(۲۰) لگائی۔ اُسے ایشیائیوں کی معاشی پس ماندگی و غربت کا احساس تھا کہ لوگ ایک حکم پر باغیوں کے سر کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

انگریز نے روپے پیسے، وظائف و تحائف کے بل پر اوپر سے نیچے تک ہر طبقے کو اپنے دام میں کیا ہوا تھا۔ اور اسی بل پر لوگوں کی وفاداریاں خریدیں۔ یہ پیسے ہی کی طاقت تھی کہ اپنوں نے بے حسی و خود غرضی کی انتہا کر دی، باغیوں کی مخبری کے لیے جان توڑ کوششیں شروع کر دیں۔ پورے ہندوستان میں ہر طرف مخبروں کا جال پھیلا دیا، جو انگریز کو پل پل کی خبریں دے رہے تھے۔ ایسے میں ناول کا کردار بدر دین، وکیل، جب انگریز کے خلاف بات کرتا ہے، جسے سُن کر کرشن لال، وکیل، کے جذبات بھی اُمڈ پڑتے ہیں۔ وہ انگریز کے خلاف شدید غصے کا اظہار کرتا ہے کہ

آخر ہم کب تک انگریز کے ظلم و ستم برداشت کریں گے؟ اُس وقت بدر دین جوش کی بجائے ہوش سے کام لے کر اُسے خبردار کرتا ہے کہ زیادہ جذباتیت نقصان کا باعث ہو سکتی ہے۔ ذرا احتیاط سے بات کرے، انگریز نے ہر طرف مخبروں کا جال پھیلایا ہُوا ہے۔ ”کشن لال، احتیاط سے بات کیا کرو محلّے محلّے گاؤں گاؤں مخبر پھیلے ہوئے ہیں۔ ذرا سی بات پر گورے طیش میں آجاتے ہیں۔“(۸۱) انگریز نے پیسے کر زور پر بے ضمیر لاگوں کو خریدا اور ان لوگوں نے باغیوں کی مخبری کا کام کیا۔ انگریز کو لمحہ لمحہ انقلابیوں کی خبریں مل رہی تھیں۔ انگریز افسران نے اعلیٰ سطح کے اجلاس میں شہر کے ممتاز شہریوں کو اُن کی اور اُن کے بادشاہ کی کمزوریوں سے آگاہ کرتے ہوئے تہذیب کے پیرائے میں انگریز کا وفادار رہنے کی دھمکی آمیز تلقین کی۔ وفاداری نہ کرنے کی صورت میں اُن کو آئندہ کے حالات کی سنگینی کا احساس دلایا کہ اُن کے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ انیس ناگی نے اس صورتحال کا بیان بہت خوبی سے کیا ہے کہ کس طرح چالاکی سے انگریز نے لوگوں کی وفاداریاں قبضے میں لیں۔ ”رابرٹس نے ۔۔ کہا، ۔۔ ”جنٹلمین! شہر میں باغی آئیں، اُنہیں کچل دیں۔ شہریوں کو یہ بھی بتائیں کہ کمپنی بہادر سارے ہندوستان کو فتح کر چکی ہے۔ آپ کا بادشاہ بھی ہمارا وظیفہ خوار ہے۔“(۸۲)

انگریز نے بڑی چالاکی سے ایشیائیوں کے درمیان تفرقہ کی بنیاد ڈال دی۔ اعلیٰ طبقہ کو اس لیے نوازا گیا کہ وہ انگریز کے کام آسکتے تھے۔ ملک پر قبضہ کیلئے امراء و روساء مددگار ثابت ہو رہے تھے۔ اس لیے انگریز اُنہیں اور اُن کی نسلوں کو نواز رہا تھا۔ جبکہ غریب طبقے کو انگریز نے ہر طرح سے استحصال کا نشانہ بنایا کیونکہ اُن کو انگریز بے کار اور فالتو چیز سمجھتے تھے، اُن سے انگریز کو بڑے پیمانے پر فائدہ حال نہیں ہو سکتا تھا۔ لہذا اُن کی حیثیت ردی کی سی تھی۔ امراء اور روساء نے انگریز کا ساتھ اپنی غرض اور لالچ کے لیے دیا۔ جبکہ دوسری طرف انگریز بھی اُن سے صلہ چاہتا تھا۔ کنہیا لال بیان کرتے ہیں: ”لاہور میں فی زمانہ بڑا خاندان نواب علی رضا خان بن ہدایت خان بن علی خان ۔۔۔ کا ہے۔ یہ بزرگ خیر خواہ نمک حلال دوست سرکار انگریزی کا تھا۔“(۸۳)

ایسے لوگوں نے اپنوں کو دغا دی اور انگریز کا ساتھ دل و جان سے دیا، کیونکہ ان سب کے پیشِ نظر اپنا مفاد اور لالچ تھا۔ جس کے ذریعے نہ صرف وہ بلکہ اُن کا پورا خاندان، آل اولاد سبھی فیض یاب ہو رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ایسے خود غرض لوگوں نے انگریز کی کھلے عام وفاداری کی۔ اور فوائد حاصل کیے۔ کنہیالال کے مطابق:

> ”غرض کہ بعوض ان خدمات کے روز افزوں عنایت سرکار کی اس کے حال پر ہوئی۔ کابل سے آنے کے وقت آٹھ سو روپیہ ماہوار اس کو پنشن ملتی تھی۔ مفسدہ ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۴۷ دیہات کی تعلقہ داری بھڑائچ ملک اودھ میں اس کو ملی۔ دو ہزار روپیہ نقد پینشن قرار پائی۔ عہدہ آنریری میجسٹریٹی لاہور کا ملا۔ ۱۸۶۴ء میں نوابی کا خطاب مرحمت ہُوا۔“(۸۴)

ایسے ہی خود غرض اور انگریز کے وفادار میاں میر چھاؤنی میں بھی تھے۔ ایسے لوگوں کے کردار بھی ناول میں کھُل کے سامنے آتے ہیں جنھوں نے فوج میں رہتے ہوئے اپنوں کے خلاف اقدامات اُٹھائے اور انگریز کا ساتھ دیا۔ بہادُر علی، پرکاش سنگھ اور جسونت لال کے میاں میر چھاؤنی میں بغاوت کے منصوبہ کی خبر انگریز کو کہیں باہر سے نہ ملی تھی۔ بلکہ غدار انقلابیوں کے درمیان ہی موجود تھا۔ انیس ناگی نے ایسے غداروں کی حقیقت جسونت لال کے کردار کے ذریعے واضح کی ہے۔ جو اپنے مفاد کے لیے اپنوں سے غداری کرتا ہے۔ ناول میں جسونت کا کردار اپنے قول و فعل سے مشکوک نظر آتا ہے۔ بہادُر علی کو کئی مرتبہ جسونت لال کی باتوں سے غداری کی بُو آئی مگر اُس نے اپنے خیال کو میلا نہ ہونے دیا۔ اُس کے نزدیک یہ جنگ محض بہادُر علی یا پرکاش کی نہ تھی بلکہ تمام لوگوں کی بقا کی جنگ تھی۔ جسونت لال کی باتوں سے بہادُر علی اور پرکاش سنگھ کو اُس کی انگریز کے ساتھ وفاداری کا احساس ہوتا ہے۔

"بد امنی، قتل و غارت ختم ہو چکی ہے، ٹھگوں کے خاتمے کے لیے کمپنی کی فوجیں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہیں۔ پُل بن رہے ہیں۔ چند سالوں کے بعد یہاں ریل بھی چلنے لگے گی، کارخانے قائم کئے جائیں گے، کیا ہم ترقی نہیں چاہتے؟" جسونت لال نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔ پرکاش سنگھ کچھ دیر سوچتا رہا اور اپنے مخصوص دیہاتی لہجے میں کہنے لگا۔ "لالہ تم تو فرنگی کے آدمی لگتے ہو۔"(۸۵)

بہادُر علی اور پرکاش کا جسونت پر شک دُرست ثابت ہوا وہ واقعی میں انگریز کے ہاتھوں بکا ہوا تھا۔ اُس نے پیسوں کے عوض اپنی وفاداریاں انگریز کو بیچ دی تھیں۔ جسونت کے ذریعے انگریز فوجی افسروں کو میاں میر چھاؤنی میں بغاوت کے منصوبہ کا علم ہوا اور اس نے فوری طور پر مقامی فوج پر ہلا بول دیا۔ بغاوت کے منصوبے کی خبر ہوتے ہی انگریز نے فوری اقدامات کے ذریعے بغاوت کو کچلنے کی سعی کی۔ مئی کی شدید گرمی میں تین بجے سہ پہر جب فوج اپنی بیرکوں میں ڈیوٹی ختم کر کے پہنچی تو اُسی لمحے بگل بجنا شروع ہو گیا، جو اس بات کا اعلان تھا کہ تمام رجمنٹس میدان میں جمع ہو جائیں اور قطار بندی کر لیں۔ اچانک بگل بجنا اور فوج کو میدان میں جمع کرنا، بہادر علی کو چونکا گیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ میدان میں توپیں نصب تھیں جن کا رُخ مقامی فوجیوں کی طرف تھا۔ کمانڈنگ افسر میجر سپنسر، کیپٹن لارنس، کیپٹن ہیچوسن اور کوارٹر ماسٹر جنرل کرنل فریزر بھی میدان میں پہنچ گئے۔ چربی کے کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار اور جسونت لال کی مُخبری کا نتیجہ سامنے تھا۔ انگریز افسران شدید مُشتعل تھے۔ تبھی چھاؤنی کے کمانڈر بریگیڈیئر کوربے کی پر تمکنت آمد ہوئی اور پھر تمام فوج کو حکم ملا کہ وہ ہتھیار نیچے رکھ دیں۔ مزاحمت کا انجام عبرت ناک ہو گا۔ گورا فوج توپیں داغنے کے لیے بالکل تیار تھی۔

۱۸۵۷ کی تاریخ کے اُس یادگار دن کو انیس ناگی نے اس خوبی و مہارت سے بیان کیا ہے کہ وہ تاریخی دور ہمارے سامنے زندہ ہو جاتا ہے۔ "تیسرے پہر کا سورج زردی مائل ہو چُکا تھا اور پریڈ گراؤنڈ میں رجمنٹ نمبر ۱۶، ۲۶ اور ۴۹ کے سپاہیوں نے بریگیڈیئر کوربے کے ایک حکم پر اپنی بندوقوں اور مسکٹوں کا جھنڈے کے نیچے ڈھیر لگا دیا تھا۔

گورا فوج کے تیرہ توپچی توپیں داغنے کے لیے بالکل تیار تھے۔"(۸۶)انگریز نے فوری طور پر فوج کو غیر مُسلح کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ ایسا کر کے انگریز نے گویا بغاوت کا راستہ میاں میر چھاؤنی میں مکمل طور پر بند کر دیا تھا۔ مگر یہ اُن کی خام خیالی تھی۔ بغاوت کی آگ اتنی جلدی بجھنے والی نہ تھی۔ سید محمد لطیف تاریخ پنجاب میں ۱۳ مئی ۱۸۵۷ کی یاد تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۱۳ تاریخ کو اعلیٰ الصبح تمام افواج نے میاں میر میں پریڈ کی۔ جن دیسی پلٹونوں کو غیر مُسلح کیا جانا تھا، ان کی تعداد چار تھی۔ اور وہ تین ہزار پانچ سو جوانوں پر مشتمل تھی۔ جب کہ اس فرض کی ادائیگی کے لیے تین سو انگریز سپاہی ۱۳ توپوں کے ساتھ موجود تھے۔ چالاکی سے ان افواج کو آمنے سامنے لایا گیا۔ انگریزوں کی توپیں اور بندوقیں بھری ہوئی تھیں۔ سپاہیوں کو اس کی خبر نہیں تھی۔ یہ چال مکمل ہونے پر سپاہیوں کو ہتھیار جمع کرنے کا حکم دیا گیا۔"(۸۷)

بغاوت کے منصوبے کا علم ہوتے ہی انگریز نے بغاوت کو کچلنے کے اقدامات شروع کر دیئے تھے۔ مقامی سپاہی نڈر، بے خوف اور بہت ماہر جنگجو تھے۔ کئی جنگوں میں شجاعت کا بہترین مظاہرہ کر چکے تھے ایسے میں انگریز کا اُنہیں چالاکی سے غیر مسلح کرنا اور جن سپاہیوں نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ انہیں عبرت ناک سزائیں دینا، اولین ترجیح تھی۔ محمد دین کلیم قادری اپنے مضمون جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں لاہور کا کردار میں اُس وقت کی صورتحال اور فوج کو غیر مُسلح کرنے کی روداد کے حوالے سے لکھتے ہیں:"۱۴ مئی کو فیصلہ کر لیا گیا کہ میاں میر کی دیسی فوج سے ہتھیار رکھوا لیے جائیں۔۔۔ راتوں رات گورا پلٹن کو پریڈ کے میدان میں پہنچایا گیا۔ توپیں جا بجا نصب کر دی گئیں اور پھر دیسی افواج سے ہتھیار کھوا لیے گئے۔"(۸۸)وہ فوج جو انگریزی حکومت کے حکم بجالاتی آئی تھی۔ جنہوں نے جنگ کے میدانوں میں کبھی پشت نہ دکھائی تھی، اُن سے ہتھیار چھین کر، اُنہیں نہتہ کر کے یوں تیار کر کے ذلیل کیا جائے گا ایسا بہادر علی کے گمان میں بھی نہ تھا۔

ساری فوج ہتھیار ڈال کے پیچھے ہٹ گئی تھی سوائے بہادر، پرکاش اور جسونت کے، جن کے لیے اُن کے ہتھیار تمغوں سے بڑھ کر تھے، جنہیں وہ مرتے دم تک خود سے الگ کرنا خلاف شان سمجھتے تھے۔ وہ ہتھیار وہ کیسے ڈال سکتے تھے اور اسی جرم کی پاداش میں اُن کے کورٹ مارشل کا پروانہ جاری ہُوا۔"میجر سپنسر کا اشارہ پاتے ہی گورے سپاہیوں نے ان تین صوبیداروں کے ہتھیار چھین لئے اور ان کی وردیوں سے سارے فوجی نشان بھی اُتار دیئے۔"بلڈی نیگرز" کیپٹن لارنس نے چیخ کر کہا۔"ان کا حکم عدولی اور بغاوت کے الزام میں کورٹ مارشل ہو گا۔"(۸۹)مقامی فوج سے ہتھیار رکھوا لینے میں فوج کی ہتک تھی۔ انگریز نے اُنہیں جتلا دیا تھا کہ وہ محض حکم کے غلام ہیں۔ اس سے زیادہ اُن کی کوئی حیثیت نہیں۔ بہادر علی، پرکاش اور جسونت نے ہتھیار نہ ڈالے۔ جس کی پاداش میں اُن کا کورٹ مارشل ہُوا۔ جسونت لال کے مقدمے کا فیصلہ محفوظ کر لیا گیا تھا۔ جبکہ بہادر علی اور پرکاش کو دس

سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی تھی۔ اُس لمحے بہادُر علی کا شک جسونت لال کے حوالے سے دُرست ثابت ہو جاتا ہے کہ جسونت نے بہادُر اور پرکاش کی مُخبری کی تھی۔ اُس نے اپنی وفاداری انگریز کے ہاتھوں بیچ دی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے اسباب و واقعات کو انیس ناگی کہانی کے تانوں بانوں میں اس خوبی سے بنتے ہیں، تاریخی المیوں کو کرداروں کے ساتھ ایسے بیان کرتے ہیں جس سے ایک تو ماضی ہمارے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے، دوسرا انیس ناگی کے تاریخی شعور کو سمجھنے میں بھی خاطر خواہ مدد ملتی ہے۔ اس ناول میں انیس ناگی نے سچائیاں سمیٹی ہیں۔ انیس ناگی، جسونت جیسے میر جعفر صفت کرداروں کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں لوگوں نے اپنوں کے مقابلے میں غیروں کا ساتھ دیا۔ آزادی بیچی، غلامی خریدی۔ انگریز نے بغاوت کو چھاؤنیوں سے شہروں کی طرف جانے سے روکنے کی بھرپور سعی کرتے ہوئے لاہور شہر کا محاصرہ کروادیا۔ عوام پر پہلے سے زیادہ سختی ہونے لگی۔ لوگوں کو شہر کے باہر سے اندر اور اندر سے باہر جانا دُشوار ہو گیا۔ انگریز نے لاہور کے تمام دروازے بند کروادیئے سوائے ایک دروازے کے جو آمدورفت کے لیے کھُلا تھا۔ مگر اُس پر سخت پہرہ تھا۔ لوگوں کی زندگیاں پہلے ہی انگریز نے اجیرن بنائی ہوئی تھیں، اُس پر محاصرے نے لوگوں کی مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا۔ انیس ناگی بیان کرتے ہیں۔ ”شہر کے بارہ دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ تیرہویں دروازے پر جو شاہی قلعہ اور شہر کے درمیان تھا اور جسے روشنائی دروازہ کہا جاتا تھا، گورا فوج کا زبردست پہرہ تھا۔“(۹۰)

انگریز کا شہر کے محاصرے کا مقصد یہی تھا کہ چھاؤنیوں میں فوج نے جو چربی کے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر کے کی حکم عدولی کی تھی۔ انگریز نہیں چاہتے تھے کہ خبر شہروں میں پہنچے اور مزید لوگوں کو انگریز کے خالف اُٹھ کھڑے ہونے کا حوصلہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ شہروں میں اس خبر کو بھی پھیلنے سے روکنا تھا کہ فوج نے بغاوت کا آغاز کر دیا ہے۔ لاہور کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے بہت سے شہروں میں بغاوت کا سر اُٹھانا انگریز کو بوکھلائے دیتا تھا ۔لہذا شہر کے دروازوں کو بند کر دیا گیا۔ کاروبار زندگی شدید متاثر ہوا۔ عدلیہ کے معاملات تاخیر کا شکار ہونے لگے۔ قلعے کو انگریزوں نے محفوظ جائے پناہ لیا اور اُس میں کئی ماہ کی خوراک جمع کر دی گئی۔ قلعے کی بھرپور حفاظت کی جا رہی تھی۔ محمد دین کلیم قادری کے مطابق: ”حکم دے دیا گیا کہ قلعہ میں اس قدر خوراک اسٹور کر لی جائے جو چار ہزار آدمیوں کے لیے چھ ماہ تک کافی ہو۔ اور اس کے سب دروازے بند کیے گئے۔ آمدورفت کے لیے صرف ایک دروازے سے اجازت تھی۔“(۹۱) انگریز بغاوت اور باغیوں کو کچلنے کے لیے ہر ممکن اقدامات کر رہے تھے۔ انیس ناگی، محاصرے کی وجہ سے لاہور کی ابتر صورتحال کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں کہ کس طرح شہر کے دروازے بند ہونے کی وجہ سے لاہور کی گلیاں، کوچے اور محلے گندگی و غلاظت سے بھر گئے۔ کوڑا کرکٹ شہر سے باہر مُنتقل نہیں ہو رہا تھا، کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو شہر سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ایسے میں شہر کی حالت ابتر ہوتی چلی

گئی۔ ناول میں لاہور کی اُس دور کی نہ گفتہ بہ حالت کا تذکرہ بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ "شہر کے دروازے بند ہیں، گلی محلے غلاظت سے بھر گئے ہیں، دکانوں پر اناج ختم ہو رہا ہے۔" (۹۲) شہر کی گلیوں میں جگہ جگہ کوڑے اور غلاظت کے ڈھیر تھے۔ گرمی اور بدبو سے گلیوں میں چلنا دُشوار تھا۔ شہر میں بدبو اور گھٹن بڑھتی جارہی تھی۔ گلیوں بازاروں میں ہر طرف چوہوں کی قطاریں نظر آنے لگی تھیں۔ لوگ اس صورتحال سے، بیماریوں کے پھیلنے سے بے حد پریشان تھے۔ "شہر میں اتنا گند جمع ہو چکا ہے کہ بیماریاں پھیل رہی ہیں، گلیوں میں چاروں طرف چوہے پھُدک رہے ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو طاعون پھیل جائے گی، جہانگیر بادشاہ کے زمانے میں بھی طاعون پھیلی تھی۔" (۹۳)

انیس ناگی یہاں جہانگیر بادشاہ کے دور میں طاعون پھیلنے کا ذکر کرتے ہیں۔ جہانگیر کے دورِ حکومت میں جو وبا پھیلی وہ اتنی خوفناک اور جان لیوا تھی کہ لوگ خوف زدہ تھے کہ کہیں گندگی و غلاظت کے باعث وہی وبا نہ پھیل جائے اور سب کو اپنی لپیٹ میں لے کر موت کے گھاٹ نہ اُتار دے۔ شہنشاہ جہانگیر کے دور میں پھیلنے والی وبا کا تذکرہ سید محمد لطیف نے تاریخ لاہور میں یوں کیا ہے:

> "دورِ حکومت کے دسویں سال پنجاب میں ایک نہایت مُہلک وباء پھیل گئی اور لاہور بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ سارے کا سارا سرہند اور دہلی تک دوآبہ کا علاقہ اس بیماری کی وجہ سے اُجڑ گیا اور ہزاروں گاؤں برباد ہو گئے۔ جہانگیر نے اسے دو سال کی خشک سالی یا قحط سے منسوب کیا ہے، جس سے علاقہ بری طرح مُتاثر ہوا اور یہ کوئی خاص قسم کا زہر تھا جسکی وجہ سے فضا میں بیماری پھیل گئی۔" (۹۴)

جب شہر میں گندگی کی صورتحال اور طاعون کے پھیلنے کے خوف کا اظہار ایک بزرگ نے اپنی عمر اور تجربے کی روشنی میں کیا، تو دلاور علی، جو بہادر علی کے ساتھ کیے گئے ناروا سلوک کی بنا پر اپنے دل میں جوار بھاٹا لیئے بیٹھا تھا، پھٹ پڑا۔ "بابا یہ طاعون شہر میں نہیں ہمارے اندر ہے جو نسلوں سے ہمارے ساتھ چلی آ رہی ہے۔ یہ طاعون ہمارا خوف ہے، ہمارا لالچ ہے کہ ہم نے ہر حاکم کی خدمت کی ہے اور ہر ایک کیلئے کرائے کی سپاہی کے طور پر لڑنا منظور کیا ہے۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔" (۹۵)

"طاعون" انیس ناگی کے ہاں ایک خطرناک بیماری سے بڑھ کر وسیع معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ جیسے طاعون کی وبا لوگوں کی جان لینے کا سبب بنتی ہے، بالکل اُسی طرح انیس ناگی کے مطابق ہمارے ذہنوں اور دلوں میں موجود طاعون، ہمارے رشتوں، لوگوں، معاشرے، اقدار اور سب سے بڑھ کر انسانیت کو قتل کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔ دلاور علی، لوگوں کو اسی چیز کا احساس دلاتا ہے، اُنہیں اُن کی اخلاقی کمزوری کا احساس دلاتا ہے۔ اُنہیں اُن کی اُس کم ہمتی اور خوف کا احساس دلاتا ہے جو طاعون کی طرح اُن کو کھوکھلا اور بحیثیت قوم اُن کو جڑوں سے کمزور بنا چکی ہے۔ انیس ناگی ایسے لوگوں کے خلاف آواز اُٹھاتے ہیں، جنہوں نے اپنی اس دلی بیماری کے سبب معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔ ایسے لوگ ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ خواہ وہ ۱۸۵۷ء کا دور ہو یا انیس ناگی کا اپنا دور۔ انیس

ناگی نے ایسے لوگوں کے لالچ، خود غرضی و مُنافقت کو جان لیوا طاعون سے تعبیر کیا ہے۔ دلاور علی لوگوں کو انقلابیوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کرنے کے لیے بار بار جذباتی ہو جاتا ہے مگر لوگوں پر اُس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور اُسے کم عُمر ہونے کے باعث جھڑک کر چپ کروا دیا جاتا ہے۔ دلاور علی اپنے طور پر عوامی سطح پر جہاد کا آغاز کرتا ہے۔ اپنے قریبی دوستوں کو ساتھ ملا کر انگریزوں کے ٹھکانوں اور مخبروں تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے۔ اپنے باپ بہادُر علی کے لیے وہ سخت پریشان ہے، وہ اپنے باپ کی خبر لینے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ انیس ناگی یہاں انفرادی سطح پر لوگوں کی ہمت اور جہاد کے جذبے کی قدر کرتے نظر آتے ہیں کہ جنہوں نے اجتماعی بقا کی خاطر، انفرادی سطح پر قربانیاں دیں۔ انیس ناگی کے نزدیک ایسے ہی لوگ نئی راہیں متعین کرتے ہیں اور جینے کا حوصلہ دیتے ہیں۔

انیس ناگی دورِ حاضر میں لوگوں میں ایسا ہی جذبۂ جہاد چاہتے تھے، جو باطل کے خلاف آواز بلند کرنے کی طاقت اور اُنہیں پسپا کرنے کی ہمت دے۔ اسی لیے تاریخ کے حوالوں کے ساتھ انیس ناگی اپنے دور کا تجزیہ بھی بین السطور پیش کرتے جاتے ہیں، جس سے انیس ناگی کے نظریہ تاریخ پر کھُل کر روشنی پڑتی ہے۔ انیس ناگی ۱۸۵۷ء کے حوالے سے ایسے بھی لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں سے کچھ نے اپنے خوف، جو اُنہیں انگریزوں کے حوالے سے تھا، کی بنا پر انقلابیوں کا ساتھ دیا نہ کسی قسم کا کوئی ردِ عمل ظاہر کیا۔ وہ محض اپنی زندگی کی فکروں میں مُبتلا تھے کہ کہیں یہ آگ اُن کے گھروں تک نہ پہنچ جائے۔ اور ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی غرض اور لالچ کے شکنجے میں گرفتار تھے۔ لہذا اُنہیں قطعاً پرواہ نہیں تھی کہ مُلک رہے یا جاتا رہے۔ اب لاہور شہر کے محاصرے کی بنا پر شہر میں گندگی اور چوہوں کا راج تھا۔ لوگ خوف زدہ تھے کہ اگر وبا پھیل گئی تو تمام لوگ بے موت مارے جائیں گے۔

یہاں انیس ناگی نے لوگوں کی ذہنیت و سوچ کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ لوگوں کو اپنا وقتی آرام اور مفاد نظر آرہا تھا، خواہ اس کے نتیجے میں اُنہیں عمر بھر کی ذلت اور رُسوائی برداشت کرنی پڑتی۔ مگر لوگوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ لوگ اپنی غرض، سکون، آرام کی خاطر انگریز کی حمایت اور انقلابیوں کی مخالفت کر رہے تھے۔ شہر کی ابتر صورتحال سے سب لوگ پریشان تھے۔ ہر شخص کو اپنی اور اپنے بچوں کی فکر تھی۔ چاہے مُلک بالکل ہاتھ سے چلا جائے۔ ہر کوئی اپنی خود غرضی کی غلامی میں مُبتلا تھا۔ ہر کوئی اپنے تئیں مظلوم ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ انیس ناگی نے ہندو بنیوں کی کیفیت کو خوب واضح کیا ہے۔ جنہیں اس افراتفری میں اپنے بیاج کی فکر کھائے جاتی تھی۔ ”کاروبار بند، جنہوں نے رقم اُدھار لی تھی، انہوں نے بیاج دینا بند کر دیا ہے۔ گورا سرکار کیا چاہتی ہے؟ ہم تو سدا کے مظلوم ہیں۔ ہم نے تو ہر حاکم کا کہنا مانا ہے۔“ گردھاری نے بڑی عاجزی سے کہا۔“(۹۶)

لوگوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انقلابیوں کا ساتھ دینے کی بجائے، مظلومیت کے لبادے میں اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کی۔ سب کو یہی فکر تھی کہ کہیں اُنہیں آزادی کی قیمت نہ چُکانی پڑ جائے۔ سب لوگ انگریز سے

خوف زدہ، اُن کی طاقت کے آگے گھٹنے ٹیک چکے تھے۔ انیس ناگی نے لوگوں کی نفسیات کا بخوبی اعادہ کیا ہے۔ جب انسان میدانِ جنگ میں جانے کے خوف سے کانپنے لگے، جب بغیر لڑے ہار تسلیم کر لے، اُس وقت انسان کو کوئی بھی چیز ہمت و عمل پر آمادہ نہیں کر سکتی، لوگ بغیر لڑے ہار تسلیم کر چکے تھے، وہ انگریز کا ساتھ دے کر انگریز کی نظروں میں اچھا بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ انگریز سے لڑنے اور اپنے حقوق کی جنگ کرنے کی اُن میں ہمت نہیں تھی ۔اسی سوچ کے تحت، ناول کا ایک کردار، زمیندار جمال، مولوی حسام الدین کو جہاد سے روکنے اور انقلابیوں کا ساتھ نہ دینے کا سبق دیتا ہے۔ انیس ناگی نے عوامی سطح پر جذبہ جہاد کا ایک نمائندہ "مولوی حسام الدین" کو دکھایا ہے۔ ناول کا یہ کردار، جو مولوی ہے۔ انقلابیوں کا اپنے طور پر ساتھ دیتا ہے۔ انیس ناگی یہاں اس نکتے کو کامیابی سے پیش کرتے ہیں کہ جب معاشرے کے تمام لوگ خود غرض اور بزدل ہو جائیں اور معمولی فائدے کے لیے غیروں کا ساتھ دینے لگیں تو ایسے میں چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے وجود کی قربانی دے کر ملک و ملت کی بقا کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ مولوی حسام الدین اپنے طور پر جہاد میں حصّہ لیتا ہے اور دہلی کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک دہلی کا بادشاہ خواہ کتنا ہی لاچار و بے بس ہو مگر بادشاہ عوام کی اُمیدوں کا مرکز ہوتا ہے۔

زمیندار جمال، مولوی حسام الدین کو حالات کی ابتری اور دہلی کی طرف پیش رفت سے منع کرتا ہے۔ "پیرو مُرشد میرا سب کچھ آپ کے لیے ہے۔ لیکن فرنگیوں کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ بڑے بڑے بادشاہ ہار گئے۔ رعیت کی کیا مجال ہے، گاؤں میں نمبر دار، چوکی دار، پٹواری سب اُن کی ساتھ ہیں۔"(۹۷) مگر مولوی حسام الدین کے حوصلے بلند ہیں وہ راستے میں آنے والی کسی رکاوٹ سے نہیں ڈرتا۔ جہاد میں انقلابیوں کا ساتھ دیتے ہوئے انگریزوں کے ہاتھوں سولی پر چڑھ جاتا ہے مگر ایک مثال چھوڑ جاتا ہے کہ انفرادی سطح کوشش بالا آخر اجتماعی کوششوں کا حصّہ بن کر یادگار بن جاتی ہے خواہ کوشش ناکام اور سعی لاحاصل ہی کیوں نہ ہو۔ انیس ناگی نے ایسے کرداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہندوستانیوں نے انگریز کو بڑی طاقت تسلیم کر کے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ بغیر لڑے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ رعایا کے سامنے، بادشاہوں اور حکمرانوں کی مثال سامنے تھی، جنہوں نے انگریز سے بُری طرح شکست کھائی تھی۔ اُن کا اپنا بادشاہ انگریز کا وظیفہ خوار تھا۔ اُس کی طرف سے بھی کسی حمایت کی اُمید نہ تھی۔ انگریز نے اُس دور میں سکھوں کو شکست دے کر، لوگوں کے دلوں میں خوف اور ہیبت کو بٹھادیا تھا۔ لوگوں کے نزدیک جو قوم (انگریز) سکھوں کو شکست دے سکتی ہے۔ اُن سے مقابلہ کرنے کی مجال عوام میں نہ تھی۔ اس کا اظہار انیس ناگی نے خوب کیا ہے۔ لوگ آپس میں بیٹھ کر شہر کے محاصرے کو ختم کروانے کی صورت نکال رہے تھے۔ سب ایک دوسرے کو یہی سمجھا اور سکھا رہے تھے کہ ہر صورت میں باغیوں سے لاتعلقی ظاہر کی جائے تاکہ اُن کی جان بخشی ہو۔ راجہ تیجا سنگھ لوگوں کو محاصرے سے نجات کا حل بتاتا ہے۔

"دوستو! سرکار سے تعاون کرنا ہے، سرکار کو علم ہے کہ شہریوں کا باغیوں سے رابطہ ہے۔ اس لیے شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔۔۔۔ ہمیں اپنے شہر کو بغاوت کے شعلوں سے بچانا ہے، ہم قتل و غارت نہیں چاہتے، یہ بھی پتہ چلا ہے کہ قلعے میں موجود گوروں کو قتل کرنے کا منصوبہ بھی بنایا جارہا ہے۔"(۹۸)

لوگ، مقامی سپاہیوں اور فوجیوں کی قربانیوں کو رد کر چکے تھے۔ اُنہوں نے غلامی دل سے قبول کر لی تھی ایسے میں انقلابیوں کی پیش رفت اُنہیں شدید ناگوار لگ رہی تھی۔ مقامی سپاہی محض اپنی بقا کی جنگ نہیں لڑ رہے تھے۔ یہ پورے مُلک اور خطّے کی بقا کی جنگ تھی، جس آزادی کے لیے انقلابی اپنی جانوں کی بازی لگا رہے تھے، اگر وہ اُس میں کامیاب ہوتے آزادی پوری قوم کا مقدر بنتی مگر لوگوں کو اپنے حال سے غرض تھی، مستقبل کی کوئی فکر نہ تھی۔ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو انگریز کا ساتھ دینے اور حمایت کرنے کا سبق دے رہے تھے۔ برس ہا برس کی اطاعت و غلامی نے اُن کے ذہنوں کو مفلوج و ماؤف کر دیا تھا۔ انیس ناگی نے لوگوں کی مفلوج ذہنیت کی عکاسی خوب کی ہے۔ "بھائیوں ہمیں اس وقت سب کچھ برداشت کرنا چاہیے، رعایا کبھی حکمرانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ہر دھرم اطاعت کا سبق دیتا ہے۔"(۹۹) انیس ناگی نے لوگوں کی غلامانہ سوچ پر کڑا طنز کیا ہے۔ جو لوگ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں مذہب کے ایسے اطاعت گزار نہ تھے، اپنی غرض اور جان بخشی کے لیے مذہب کا حوالہ بطور ڈھال استعمال کر رہے تھے، باغیوں کا ساتھ نہ دینے کی وجہ دھرم اور مذہب کو قرار دے کر آزادی کے لیے اپنا حصہ ڈالنے سے گریز کر رہے تھے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک حکمرانوں کے خلاف آواز اُٹھانا گناہ کا باعث ہو سکتا تھا۔ لوگوں نے انقلابیوں کی حمایت سے صاف انکار کر دیا تھا۔ لوگوں کے نزدیک وہ صرف باغی تھے جنہوں نے انگریز سے ٹکرانے کی جرأت کی تھی، جو اُن کے نزدیک اُنہیں نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لوگوں کا مشترکہ فیصلہ یہی تھا۔ "ہمیں حاکموں سے رابطہ قائم کرنا چاہیے ہمارا باغیوں سے کیا تعلق ہے، خواہ مخواہ شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ بغاوت تو چھاؤنیوں میں ہوئی ہے۔"(۱۰۰)

لوگ انگریز کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ چھاؤنیوں میں اُٹھنے والی بغاوت سے شہر والوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ شہر کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ وہ اپنے عمل سے اس بات پر تصدیق کی مُہر رہے تھے کہ اُن میں کم حوصلگی و بے ہمتی اتنی ہے کہ وہ کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کر سکتے۔ ناول میں بیشتر مقامات پر انیس ناگی نے پنجاب والوں پر طنز کیا ہے۔ پنجاب والوں نے اپنے مفادات کے لیے اپنی وفاداریاں انگریز کو بیچ دی تھیں۔ انیس ناگی نے پنجاب والوں کی مفاد پرستی اور انقلاب کی جدوجہد سے لاتعلقی کی کُھل کر وضاحت کی ہے۔ جو لوگ انقلابیوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ اُنہیں پنجاب والوں کی یہ بے حسی شدید غم و غصّے میں مُبتلا کر رہی تھی۔ آزادی کی جنگ لڑنے والوں نے پنجاب کے لوگوں کو خبردار کیا کہ اگر وہ آج اپنے حق کے لیے آواز بُلند نہیں کریں گے تو آنے والے وقت میں اُن کے جان و مال اور عزتیں بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ یہ آگ اُن کے گھروں تک بھی پہنچ جائے گی۔ ابھی پنجاب انگریزوں کی دی

ہوئی عنایات سے خوش ہے مگر یہ چاندنی چار دن کی ہے۔انیس ناگی نے انقلابیوں اور اُن کا ساتھ دینے والوں کے پنجاب کے لوگوں کے حوالے سے دلی جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔"اہلیان پنجاب کو بھی اپنی بے حسی سے بیدار ہونا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ حکومت نے ہندوستانیوں پر بھاری اور مناسب ٹیکس عائد کر کے اُنہیں تباہ کر دیا ہے۔ ہمارے مذہب کو مٹانے کے درپے ہیں۔ وہ پنجاب کے ساتھ بھی یقیناً یہی سلوک کریں گے۔"(۱۰۱)ایک بار پھر انیس ناگی پنجاب والوں کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے طنز سے کام لیتے ہیں۔"اے پنجاب کے ساکنو، چوڑیاں اُتارو اور مردانہ وار باہر نکلو۔"(۱۰۲)انیس ناگی نے پنجاب کے لوگوں پر انقلابیوں کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے شدید طنز اور چوٹ کی ہے۔ انہیں جہاد پر آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش ناول میں نظر آتی ہے۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں پنجاب کے کردار کے حوالے سے سید محمد لطیف لکھتے ہیں:"پنجاب کی آبادی انگریزوں کی حکومت سے بہت زیادہ متاثر ہو گئی۔ لہٰذا وہ یک دم انگریزوں کے گہرے دوست بن گئے۔"(۱۰۳)پنجاب کو، سکھوں سے چھٹکارا دلانے کے بعد اور وہاں حکومتی و سماجی نظام میں تبدیلی سے پنجاب کے لوگ انگریز سے بہت زیادہ خوش ہو گئے۔ وہ انگریزوں کے آگے سر جھکا چکے تھے، انہیں حکمران مان چکے تھے۔ایسے میں اور کسی قوم کا سر اُٹھانا اور اقتدار میں آنا اُنہیں گوارا نہ تھا۔ خواہ اُن کی اپنی قوم ہی کیوں نہ ہو۔پنجاب والوں نے بغاوت کو کچلنے میں انگریز کا پورا پورا ساتھ دیا۔ تبھی بغاوت کے ختم ہونے کے بعد انگریز نے پنجاب کے لوگوں کی تعریف کی۔

سید محمد لطیف کے مطابق:"پس متحمل، ثابت قدم اور تیار پنجاب نے ہندوستان کو بچا لیا۔ نہ صرف، پانچ قدیم دریاؤں کو بغاوت سے پاک کر دیا گیا بلکہ دماغ اور ہاتھ، مشرق میں برطانوی افواج کے وقار کو قائم رکھنے کی خاطر تدابیر کے لیے تیار ہو گئے۔"(۱۰۴)انگریز کا ساتھ دینے اور وفاداری کے نتیجے میں، پنجاب والوں کو انگریز نے خوب نوازا اور حمایت کا بھرپور صلہ دیا۔ سید محمد لطیف مزید لکھتے ہیں:"حکومت برطانیہ نے پنجاب کے سرداروں کی خدمات کے لیے انہیں فیاضی کے ساتھ انعام و اکرام سے نوازا۔"(۱۰۵)انگریز نے پنجاب کے لوگوں کی حمایت اور وفاداری بزورِ قوت خریدی۔ پنجاب کے باسیوں نے اپنے ہی لوگوں کو بیگانہ سمجھ کر انگریز کا پورا پورا ساتھ دیا۔پروفیسر عزیز الدین احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "انگریزوں نے پنجاب کو کنٹرول کرنے کیلئے وہ جاگیر دار بھی پیدا کیے جن کی اولاد پنجاب کی آج کی سیاست پر بھی سانپ کی طرح پھن پھیلائے بیٹھی ہے۔ ان جاگیر داروں نے جبری فوجی بھرتیاں کروائیں، آزادی کی تحریکوں کو توڑنے کے لیے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ انگریزوں کی حمایتی سیاسی پارٹیاں بنائیں اور انعام و کرام حاصل کیے۔"(۱۰۶)

پنجاب والوں کی بے حسی کا حوالہ مختلف جگہوں پر ملتا ہے کہ انہوں نے خود غرضی کی انتہا کر دی اور اپنوں کو چھوڑ کر غیروں کا ساتھ دیا۔انیس ناگی نے پنجاب والوں کے ایک مخصوص طبقے کی بے حسی و طمع کا بھرپور انداز میں

ذکر کیا ہے۔ پروفیسر عزیز الدین احمد ایک اور مقام پر پنجاب کے اُن باسیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جنھوں نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور اپنی جانیں قربان کیں۔ پروفیسر عزیز الدین احمد کے نزدیک:

> "پنجاب نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھرپور حصّہ لیا ہے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی جاسکتی جس میں پنجاب کے ان سورماؤں کا سنہری حروف میں ذکر نہ کیا گیا ہو، جنھوں نے ملک کی آزادی کی خاطر اپنے سروں کا نذرانہ پیش کیا۔ جان کی قربانیوں کی داستانیں اس قدر رنگین ہیں کہ اگر انہیں خارج کر دیا جائے تو تاریخ کا حسن ماند پڑ جائے گا۔"(۱۰۷)

لالچی و مفاد پرست طبقے کو چھوڑ کر عزیز الدین احمد کے بقول پنجاب کے لوگوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ایسے جری و بہادر لوگوں کا ذکر تاریخ سے نکال دینا سراسر زیادتی ہو گی۔ تبدیلی و انقلاب کی لہر نے انگریز کے شکنجے میں گرفتار بہادر علی و پرکاش سنگھ کو شدید بے چینی میں مُبتلا کر دیا تھا۔ اُن کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اس قید سے چھٹکارا لے کر انقلابیوں کے ساتھ جا ملیں اور دہلی روانہ ہوں جائیں۔ اُنہیں بادشاہ کے ہونے کا احساس تقویت دلاتا تھا کہ شاید اُس میں ابھی کچھ دم باقی ہو، شاید وہ کچھ کر گزرے۔ بہادر اور پرکاش موقع پاکر، انگریز افسروں کو قتل کر کے انگریز کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ جاتے جاتے وہ چھاؤنی کے باقی مقامی سپاہیوں کو ساتھ لینا اور اسلحے کے میگزین کو آگ لگانا نہیں بھولتے۔ اُن کی منزل دہلی ہے۔ راستے میں آنے والی کئی رکاوٹوں کو سر کرتے، بہادر اور پرکاش کی سربراہی میں مقامی فوج کے سپاہی سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے دہلی کی طرف چلے جا رہے تھے۔ مقامی سپاہیوں نے راستے میں آنے والے دیہاتوں میں لوٹ مار کرنے کی اجازت نہ ملنے پر غصّے اور بد دلی کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ راستے میں مختلف جگہوں پر درختوں سے لٹکتی خون میں لت پت انقلابیوں کی لاشوں نے جہاں مقامی سپاہیوں کا حوصلہ توڑا وہیں انگریز کا خوف اور مضبوط کر کے اُنہیں پسا ہونے پر بھی مجبور کر دیا۔ یہ پسپائی بنیادی طور پر اُن کے ذہن و دل کی تھی جس نے انگریز کی طاقت کا لوہا مان لیا تھا۔ جیسے جیسے سفر بڑھتا گیا، بہادر اور پرکاش کے ساتھ صرف چند سپاہی رہ گئے، اپنوں کے پشت دکھا جانے نے اگرچہ بہادر کو شدید مایوس کیا۔ مگر وہ اور پرکاش آخری دم تک ہمت نہیں ہارتے۔ تبھی آخر میں انگریز سپاہوں کے اپنے گرد تنگ ہوتے گھیرے میں بہادر اور پرکاش خود کو انگریز کے حوالے کرنے سے زیادہ بہتر اپنے ہاتھوں اپنی جان لینا پسند کرتے ہیں۔ انیس ناگی کے ناولوں کے اختتام پر مرکزی کردار، جو تمام ناول میں جبرِ مسلسل کا شکار رہتے ہیں، بالا آخر موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ خارجی حالات جب اُن کے بس سے باہر ہو جاتے ہیں تو وہ حالات سے فرار میں ہی سکون تلاش کر لیتے ہیں مگر اُن کرداروں کے رویوں میں مایوسی و بے زاری نمایاں ہے جبکہ انیس ناگی کے اس ناول کے اختتام پر بہادر علی اور پرکاش سنگھ پوری ہمت اور بہادری کے ساتھ موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ انگریز کے ہاتھوں جان گنوانے سے بہتر خود کو ہمیشہ کی غلامی سے نجات دلا کر جان، جانِ آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اُن کے اس عمل میں حوصلہ، ہمت و رجائیت کا پیغام ہے۔ جو قوم کے

ایسے لوگ جن کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں، اُن کے منہ پر طمانچہ ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے آزادی کے بدلے غلامی قبول کی۔ انیس ناگی نے پرکاش کی زبانی ایسے لوگوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ پرکاش، بہادر علی سے کہتا ہے: "بہادُر علی، ہم ان لوگوں کے لیے جانیں دے رہے ہیں جو غلامی میں ملنے والی سہولتوں کی خاطر کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے۔"(۱۰۸) پرکاش اور بہادُر ایک دوسرے کے سینوں میں تلواریں گھونپنے کو تیار ہیں۔ تبھی پرکاش کے لہجے میں مایوسی در آتی ہے۔ "یار بہادُر وقت آگیا ہے، اب تو یوں لگتا ہے کہ یہ انقلاب نہیں ہے۔ ایک فوجی بغاوت ہے، اگر انقلاب ہوتا تو اپنے دوسروں کے کہنے پر ہماری جان کے دُشمن نہ ہوتے۔"(۱۰۹) یہاں انیس ناگی بہادُر علی کے ذریعے اُمید ور جائیت کا درس دیتے ہیں، جو کسی بھی حالت میں حوصلہ ہارنا نہیں جانتا۔ "ہو سکتا ہے کہ یہ دوسروں کے لیے ایک فوجی بغاوت ہو لیکن ہم دونوں اپنے آپ کو ان کے حوالے نہیں کریں گے۔"(۱۱۰) اور یوں بہادُر علی اور پرکاش بہادُری کے ساتھ اپنی جان اپنے ہاتھوں لے کر آزادی کے ابدی راستے پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

انیس ناگی اس ناول میں اس امر کو واضح کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں کہ ہر دور میں، چاہے وہ دور ماضی کا ہو یا حال کا، جب عوام مُردہ دل و بے ضمیر ہو جائے تو اُن میں سے چند ایک لوگ ایسے باقی رہتے ہیں جو اندھیرے میں شمع روشن کا کام کرتے ہیں۔ قومی بقا کے لیے اپنے وجود کو قربان کر کے ایک مثال بن جاتے ہیں۔ جیسے بہادُر علی اور اس کا ساتھی پرکاش جیسے کردار اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

جاوید تاریخ کی تلاش کرتا ہوا ماضی سے حال میں واپس اپنے دفتر میں آجاتا ہے۔ مگر اُس کا ذہن ابھی بھی ماضی و تاریخ کے تانوں بانوں میں، بہادُر علی کی جدوجہد اور بالا آخر پسپائی میں اُلجھا ہُوا ہے۔ اُس کا عملہ اُسے حیرت سے دیکھ رہا ہے مگر جاوید کو کسی کی پرواہ نہیں۔ وہ تصور کی آنکھ سے بہادُر علی کو دیکھ رہا ہے۔ "وہ دیکھو بہادُر علی کے بدن سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ اکیلا گھوڑے پر دہلی جا رہا ہے۔ تمھیں شائد اصل واقعات کا پتہ نہیں۔ یہ کہانی کچھ ادھوری ہے۔"(۱۱۱) جاوید ۱۸۵۷ء کے تاریخی ریکارڈ کی ورق گردانی کرتے ہوئے روحانی طور پر اُس دور اور اُس کے کرداروں سے جُڑ جاتا ہے۔ وہ خود کلامی کرتا ہے۔ "یہ سارے واقعات، یہ سارے کردار کہاں سے آئے ہیں۔ یہ مرے ذہن کی تخلیق ہیں۔ نہیں ان کا حال ان مسّلوں میں بکھرا ہُوا ہے۔"(۱۱۲)

اس جُملے سے انیس ناگی کی سوچ اور نظریہ پر روشنی پڑتی ہے وہ ہر وجود، ہر فرد کی اہمیت و حیثیت کے لیے آواز اُٹھاتے ہیں۔ وہ تمام افراد جنھوں نے تاریخ میں قربانیاں دیں مگر چونکہ وہ نام اتنے معروف نہیں تھے، لہذا اُن کا تذکرہ تاریخ میں بیان کے لائق نہیں سمجھا جاتا، انیس ناگی کے نزدیک وہ تمام افراد، معاشرے کی اہم ترین اکائی ہونے کی حیثیت سے اہمیت کے حامل ہیں۔ جاوید نے ڈپٹی کمشنر ایجرٹن کی خفیہ ڈائری، جسے تاریخی ریکارڈ لکھتے وقت حوالے کے طور پر استعمال نہ کیا گیا تھا، سے میاں میر چھاؤنی کے تمام مقامی سپاہیوں کے قیدی بنائے جانے اور بہت سوں کو

عوام کے ساتھ توپوں سے اُڑا دینے نیز شہر کے محاصرے کے ختم ہونے کے حوالے سے مندرجات لکھ کر جلد ساز کو اُن پر پُرانی جلد کر کے لانے کو کہا تا کہ اُنہیں تاریخی ریکارڈ میں رکھ کر لوگوں کو سچ جھوٹ کے بارے میں بتایا جاسکے، اُنہیں حقیقت سے آگاہ کیا جاسکے، مگر جاوید کی یہ کوششیں بے سود جاتی ہے عملہ اسے اضافی کام کہہ کر پورا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ جاوید کی کوشش، سعی لاحاصل رہ جاتی ہے۔

ناول کا اختتام انیس ناگی کے بیشتر ناولوں کی طرح خودکشی و موت پر ہوتا ہے۔ جب جاوید کو اُس کی بیٹی فون پر ماں کی خودکشی کی کوشش میں عمارت کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دینے کی اطلاع دیتی ہے۔ انیس ناگی کے ناولوں کے کردار عموماً مایوسی اور حالات کی سختی کا مقابلہ کرتے کرتے حالات کی سفاکی کے آگے ہمت ہار جاتے ہیں۔ اور اپنی درد ناک زندگی سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھڑا جاتے ہیں۔

ایک گرم موسم کی کہانی میں جہاں انیس ناگی کے تاریخی نظریات واضح طور پر سامنے آتے ہیں، وہی انیس ناگی کے تاریخی شعور پر بھی خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔ انیس ناگی تاریخ، تاریخی واقعات و کرداروں کو، ماضی کے حوالوں کے ساتھ ساتھ حال، دورِ حاضر کے حالات اور مستقبل کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ماضی، حال اور مستقبل ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک ہی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ماضی کا تجزیہ کرتے ہوئے حال کے حوالوں کا تجزیہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ ناول میں جاوید کا یہ بیان کہ تاریخی ریکارڈ میں موجود حقائق یک طرفہ ہیں، لوگوں کو جھوٹی وفاداریوں پر مجبور کیا گیا۔ اس بیان کے بعد انیس ناگی قاری کو ماضی میں لیے چلتے ہیں اور باقی تمام ناول ماضی اور تاریخ کے مختلف ادوار اور پہلوؤں سے پردہ اُٹھاتا چلا جاتا ہے۔

انگریز نے لوگوں کو پیسہ دے کر اُن کی وفاداریاں خریدیں، لوگ لالچ اور انگریز کے خوف کی وجہ سے انگریزوں کا ساتھ دینے اور انقلابیوں کی مُخبری کرنے پر مجبور ہوئے۔ جاوید ۱۸۵۷ء کے تاریخی ریکارڈ کو حقیقت سے زیادہ مُبالغہ قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ سیموئل ٹیلر کہتا ہے کہ خُدا ماضی کو بدل نہیں سکتا، مورخ بدل سکتے ہیں۔ جاوید کا یہ ماننا ہے کہ سیاسی عزائم کی بنیاد پر ۱۸۵۷ء کا تاریخی ریکارڈ مُرتب کروایا گیا۔ مورخین نے وہی لکھا جو اُن سے لکھوایا گیا۔ لہٰذا یہ تاریخی ریکارڈ یک طرفہ اور محض ایک طرف کی صورتحال دکھاتے ہیں۔ لوگوں نے جھوٹی وفاداریوں کو نبھایا۔ بغاوت کے پیچھے انگریز کی اپنی کارگزاریاں تھیں۔ انگریز نے اپنے ظلم و ستم، انسانیت کش قوانین اور عبرت ناک سزاؤں سے لوگوں اس نہج پر پہنچایا۔ اور سب سے بڑھ کر ایشیائیوں کی عزت نفس پر حملہ چربی کے کارتوس آنے پر ہُوا۔ اس کے نتیجے میں جنم لینے والی بغاوت کو انگریز نے طاقت کے زور پر کچل ڈالا۔ انیس ناگی کے نزدیک تاریخ باغیوں کی سرکشی کی کہانی تو سناتی ہے مگر انگریز نے لوگوں کو جس طرح سے ذہنی و جسمانی اذیتیں دیں، اُن کی عزت نفس کو جس طرح مجروح کیا گیا، جس طرح لوگوں کا اعتبار لوٹا گیا، ایک ایک گھر، ایک ایک خاندان ایک ایک فرد

جس طرح تباہ و برباد ہُوا، نیز بہادُر علی، دلاور علی اور مولوی حسام الدین نے جس طرح انفرادی سطح پر انقلاب کے لیے کوششیں کیں، اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے، جس طرح باغیوں کو بے دردی سے پھانسیاں دی گئیں، ان سب کا احوال تاریخ کے صفحات میں کیوں نہیں ملتا۔ انیس ناگی کا یہ ناول ایسے بہت سے فکر انگیز نکتے اُٹھاتا ہے۔ انیس ناگی کا تاریخی شعور ناول کے کرداروں کو تخیل و حقیقت کی آمیزش کے ساتھ پیش کرتے ہوئے حالات کا بہترین جائزہ پیش کرتا ہے۔ جہاں بہادُر علی جیسے کردار اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے پورے معاشرے کی بقا کی ضمانت دے جاتے ہیں ،وہیں مُنافقت سے بھرپور معاشرے کے چہروں سے نقاب بھی نوچ کر پھینک ڈالتے ہیں۔ انیس ناگی کے اس ناول میں تاریخ کے جو حوالے ملتے ہیں وہ انیس ناگی کے تاریخی نظریات کو واضح کرتے ہوئے اُن کے تاریخی شعور کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ انیس ناگی تاریخی حقائق کے بیان میں تسلیم شدہ حوالوں پر آنکھ بند کر کے یقین کرنے کی بجائے تحقیق کے ذریعے اُن پر پہلے اسناد کی مُہر ثبت کرتے ہیں، اُس کے بعد ہی اپنے ناول کا حصہ بناتے ہیں۔ وہ حقائق کو تنقیدی نکتہ نظر سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں، انیس ناگی کی تحریروں سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ انیس ناگی تنقیدی تاریخی شعور کے حامل ہیں۔ یہی امر انیس ناگی کی تحریر کی بُنیاد اور اصل الاصول ہے۔ جو انہیں دیگر اُدبا سے ممتاز بناتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ زاہد مسعود(مُرتب)،انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار (لاہور:حسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء)،ص ۳۵۔

۲۔ سلیم شہزاد، دیباچہ:فصیلیں(چار ناول)،(لاہور:جمالیات،۲۰۰۵ء)،ص ۰۴۔

۳۔ زاہد مسود(مُرتب)،انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار،ص۴۹۔

۴۔ انیس ناگی،ایک ادھوری سر گزشت(لاہور:جمالیات،۲۰۰۸ء)ص ۱۶۸۔

۵۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،(لاہور:جمالیات،۲۰۰۵ء)،ص ۴۱۰۔

۶۔ ایضاً،ص۴۱۸،۴۱۷۔

۷۔ ایرک ہوبس باؤم،"ماضی کا شعور"مشمولہ جدید تاریخ،مؤلف۔مبارک علی،ڈاکٹر(لاہور:فکشن ہاؤس، ۲۰۰۱ء)،ص ۱۵۳۔

۸۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۴۱۸۔

۹۔ ایضاً،ص۴۱۶۔

۱۰۔ ایضاً،ص ۴۲۲۔

۱۱۔ ایضاً،ص ۴۱۴۔

۱۲۔ ایضاً،ص ۴۱۱۔

۱۳۔ ایضاً،ص ۴۱۳۔

۱۴۔ ایضاً،ص۴۱۶۔

۱۵۔ ایضاً،ص۴۰۹۔

۱۶۔ محمد شفیع،میاں،۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی(واقعات وحقائق)،(لاہور:مکتبہء جمال، (۲۰۰۴ء)۔ص ۱۵۶۔

۱۷۔ خورشید مصطفیٰ رضوی،سیّد،تاریخ جنگ آزادی ہند۱۸۵۷ء(لاہور:پو پبلیشرز،۲۰۰۷ء)ص ۲۳۱۔

۱۸۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص ۵۵۴۔

۱۹۔ ایضاً،ص ۵۵۴۔

۲۰۔ ایضاً،ص ۴۱۲۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۲۰۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۲۲۔

۲۳۔ زاہد مسعود (مرتب)، انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار، ص ۵۰۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۵۰۔

۲۵۔ انیس ناگی، فصیلیں (چار ناول)، ص ۴۲۳۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۴۴۹۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۴۵۰۔

۲۸۔ محمد شفیع، میاں، ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی (واقعات و حقائق)، ص ۳۳۔

۲۹۔ انیس ناگی، فصیلیں (چار ناول)، ص ۴۱۳۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۸۵۔

۳۱۔ کنہیا لال، تاریخ لاہور (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۳۶تا۳۹۔

۳۲۔ محمد لطیف، سید، تاریخ لاہور (لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۵۵۔

۳۳۔ انیس ناگی، فصیلیں (چار ناول)، ص ۴۳۱۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۴۳۲۔

۳۵۔ عزیز الدین احمد، پنجاب اور بیرونی حملہ آور (لاہور: بک ہوم، ۲۰۱۴ء)، ص ۸۵۔

۳۶۔ محمد لطیف، سید، تاریخ لاہور۔ ص ۱۳۴۔

۳۷۔ انیس ناگی، فصیلیں (چار ناول)، ص ۴۳۹، ۴۳۸۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۴۳۹۔

۳۹۔ سلیم الدین قریشی، (مدون)، اسباب بغاوت ہند: تین غیر مطبوعہ مضامین (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء)، ص ۶۲۔

۴۰۔ کنہیا لال، تاریخ لاہور، ص ۵۳۔

۴۱۔ انیس ناگی، فصیلیں (چار ناول)، ص ۴۳۹۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۴۵۷۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۴۶۳۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۴۹۲۔

۴۵۔ خورشید مصطفیٰ رضوی، سید، تاریخ جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء، ص ۱۴۳۔
۴۶۔ سلیم الدین قریشی، (مدون)، اسباب بغاوت ہند: تین غیر مطبوعہ مضامین، ص ۴۰۔۴۱۔
۴۷۔ انیس ناگی، فصیلیں (چار ناول)، ص ۴۴۸۔
۴۸۔ ایضاً، ص ۴۷۲۔
۴۹۔ محمد شفیع، میاں، ۱۸۵۷ پہلی جنگ آزادی (واقعات و حقائق)، ص ۱۲۵۔
۵۰۔ انیس ناگی، فصیلیں (چار ناول)، ص ۴۳۴۔
۵۱۔ ایضاً، ص ۴۲۸۔
۵۲۔ ایضاً، ص ۴۴۳۔
۵۳۔ ایضاً، ص ۴۴۳۔
۵۴۔ ایضاً، ص ۴۲۹۔
۵۵۔ محمد لطیف، سید، تاریخ پنجاب (لاہور: تخلیقات، س ن)، ص ۱۰۵۶۔
۵۶۔ محمد شفیع، میاں، ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی (واقعات و حقائق)، ص ۸۶۔
۵۷۔ انیس ناگی، فصیلیں (چار ناول)، ص ۴۴۹۔
۵۸۔ ایضاً، ص ۵۴۷۔
۵۹۔ سلیم الدین قریشی، (مدون)، اسباب بغاوت ہند: تین غیر مطبوعہ مضامین، ص ۳۴۔
۶۰۔ انیس ناگی، فصیلیں (چار ناول)، ص ۴۳۰۔
۶۱۔ ایضاً، ص ۴۲۸۔
۶۲۔ ایضاً، ص ۵۲۸۔
۶۳۔ ایضاً، ص ۴۴۰۔
۶۴۔ ایضاً، ص ۴۲۹۔
۶۵۔ خورشید مصطفیٰ رضوی، سید، تاریخ جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء، ص ۱۶۲۔
۶۶۔ محمد شفیع، میاں، ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی (واقعات و حقائق)، ص ۵۱۔
۶۷۔ انیس ناگی، فصیلیں (چار ناول)، ص ۴۵۹۔
۶۸۔ ایضاً، ص ۴۶۵۔
۶۹۔ ایضاً، ص ۴۷۱۔

۷۰۔ سلیم الدین قریشی،(مدون)،اسباب بغاوت ہند: تین غیر مطبوعہ مضامین،ص۳۴۔
۷۱۔ ایضاً،ص۷۸۔
۷۲۔ مشتاق احمد علوی، "جنگ آزادی کے اسباب" مشمولہ ترجمان اہلسنت(ماہنامہ)(کراچی:۱۸۵۷ء)،ص۵۱۔
۷۳۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۴۴۴۔
۷۴۔ ایضاً،ص۴۴۴۔
۷۵۔ سلیم الدین قریشی،(مدون)،اسباب بغاوت ہند: تین غیر مطبوعہ مضامین،ص۲۷۔
۷۶۔ ایضاً،ص۲۷۔
۷۷۔ خورشید مصطفیٰ رضوی،سید،تاریخ جنگ آزادی ہند۱۸۵۷ء،ص۲۱۳،۲۱۴۔
۷۸۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۵۲۶۔
۷۹۔ محمد شفیع،میاں،۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی (واقعات و حقائق)،ص۱۵۷۔
۸۰۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۴۵۵۔
۸۱۔ ایضاً،ص۴۴۹۔
۸۲۔ ایضاً،ص۴۵۶،۴۵۵۔
۸۳۔ کنہیالال،تاریخ لاہور،ص۸۰۔
۸۴۔ ایضاً،ص۸۱۔
۸۵۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۴۶۰،۴۵۹۔
۸۶۔ ایضاً،ص۴۵۶،۴۵۵۔
۸۷۔ محمد لطیف،سید،تاریخ پنجاب،ص۱۰۵۴۔
۸۸۔ محمد دین کلیم قادری، "جنگ آزادی ۱۸۵۷ میں لاہور کا کردار" مشمولہ:ترجمان اہلسنت (ماہنامہ)(کراچی:۱۸۵۷ء)،ص۱۲۷۔
۸۹۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۴۷۷،۴۷۶۔
۹۰۔ ایضاً،ص۴۷۸۔
۹۱۔ محمد دین کلیم قادری، "جنگ آزادی ۱۸۵۷ میں لاہور کا کردار" مشمولہ:ترجمان اہلسنت (ماہنامہ)،ص۱۲۶۔

۹۲۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۴۷۹۔

۹۳۔ ایضاً،ص۵۰۷۔

۹۴۔ محمد لطیف،سید،تاریخ پنجاب،ص۹۳،۹۴۔

۹۵۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۵۱۹۔

۹۶۔ ایضاً،ص۵۰۱۔

۹۷۔ ایضاً،ص۴۹۶۔

۹۸۔ ایضاً،ص۵۱۳۔

۹۹۔ ایضاً،ص۵۱۵۔

۱۰۰۔ ایضاً،ص۵۰۷۔

۱۰۱۔ ایضاً،ص۵۰۴۔

۱۰۲۔ ایضاً،ص۵۲۰۔

۱۰۳۔ محمد لطیف،سید،تاریخ پنجاب،ص۱۰۵۶۔

۱۰۴۔ ایضاً،ص۱۰۶۰۔

۱۰۵۔ ایضاً،ص۱۰۶۲،۱۰۶۱۔

۱۰۶۔ عزیز الدین احمد، پنجاب اور بیرونی حملہ آور،ص۱۳۱۔

۱۰۷۔ ایضاً،ص۱۲۹۔

۱۰۸۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۵۵۱۔

۱۰۹۔ ایضاً،ص۵۵۲۔

۱۱۰۔ ایضاً،ص۵۵۶۔

۱۱۱۔ ایضاً،ص۵۵۵۔

۱۱۲۔ ایضاً،ص۵۵۵۔

باب سوم

قلعہ: انیس ناگی کے تاریخی نظریات کا عکاس

قلعہ انیس ناگی کا ساتواں ناول ہے جو ۱۹۹۴ء میں جمالیات، لاہور سے شائع ہُوا۔ اس ناول کے کُل صفحات ۲۰۷ ہیں۔ اس میں ۲۹ مُختصر ابواب شامل ہیں۔ اس ناول میں انیس ناگی کے تاریخی تصورات کی پیش کش کا جائزہ اس ناول میں بیان کردہ تاریخی حوالوں کے ذریعے لیا جائے گا تاکہ انیس ناگی کے تاریخی شعور تک رسائی حاصل کی جاسکے۔

تاریخ کے حوالے

ناول کا آغاز انیس ناگی نے مختصر اًفصیلوں کے اندر قدیم لاہور اور فصیلوں کے باہر اُبھرتے نئے شہر لاہور کے تعارف سے کیا ہے۔ نئے شہر میں زندگی محض بوجھ اور عذاب ہے۔ جہاں زندگی اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ حملہ آور ہے۔ نئے شہر لاہور میں جدتوں اور سہولتوں کے باوجود بے چینی، بے یقینی و بے خوابی کا راج ہے۔ انیس ناگی لکھتے ہیں:

> "یہ شہر طلسماتی نہیں حقیقی ہے۔ یہ لطافت سے تہی شہر ہے۔ یہاں سر شام ہی سب کچھ بند ہو جاتا ہے۔ ۔۔ لیکن لوگ جاگتے رہتے ہیں۔ کروٹیں بدلتے ہیں اور ہر کوئی نیند کی خواہش میں آسمان کی طرف دیکھتا دیکھتا تیرگی میں صبح کو پالیتا ہے۔ شام کو چھوٹے اور بڑے علاقوں کے مطبوں میں ڈاکٹر مریضوں کا معائنہ کرتے ہیں اور ہر ایک کو بے خوابی کا مریض بتاتے ہیں۔"(۱)

پورا شہر دھوئیں، گرد اور بدبو سے اٹا ہُوا ہے۔ لاہور جہاں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہُوا وہیں وقت کے ساتھ ساتھ زندگی اور اُس کا سارا سکون مفقود ہو کر رہ گیا۔ لاہور کے باسی پُر سکون نیند کو ترسنے لگے۔ اس گرد و غبار سے اٹے ہوئے پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے انیس ناگی نئے شہر لاہور کے وسط میں واقع ایک زرد رنگ کی مدقوق اور خستہ حال عمارت دکھاتے ہیں جو طرزِ تعمیر کے لحاظ سے سکھ اور مغل کلچر کا مرکب ہے۔ اِسی بنا پر لوگوں نے اِسے قلعہ کا نام دے دیا ہے۔ "نئے شہر کے عین بیچ خستہ بجھے ہوئے زرد رنگ کی ایک قلعہ نما عمارت شہر کی قدیم عمارتوں میں واحد عمارت ہے۔ جس میں آج بھی آمد و رفت کا تانتا بندھا رہتا ہے۔"(۲) قلعہ کو زائد المیعاد ہونے کے سبب انسانی جانوں کیلئے خطرناک قرار دیا جاچکا ہے۔ قلعہ بیوروکریٹ کے دفتر کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ قلعہ کا انچارج

سول سرونٹ "دارا" ہے۔ جو ناول کا مرکزی کردار اور بہ اعتبارِ طبعیت و مزاج سب سے مختلف اور الگ دکھائی دیتا ہے۔ "دارا اس ہال میں کُرسی پر بیٹھا کسی تاثر کا اظہار کیے بغیر سائلوں کی طرح طرح کی جھوٹی سچی داستانیں سنتا اور شاذ و نادر ہی کسی بات پر اعتبار کرتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے تجزیئے نے اسے یہی بتایا ہے کہ لوگ دکھی بن کر اپنا مطلب حاصل کرتے ہیں۔۔۔ اس لیے قلعہ اور اس سے متعلقہ لوگ اس سے نالاں ہیں۔"(۳) معاشرے کے رویوں، لوگوں کے بدلتے مزاج اور بالا آخر محبت میں ناکامی نے دارا کو حالات اور لوگوں سے بد ظن کر دیا ہے۔ اب وہ کسی پر اعتبار اور بھروسہ نہیں کرتا۔ سب لوگ اُسے منافق نظر آتے ہیں۔

"دارا" اُردو ناول کا ایک مختلف اور الگ کردار ہے جو سرد مزاج اور بد دماغ ضرور ہے مگر ایک ایماندار اور مُحبِ وطن شخص ہے۔ لوگوں کی منافقت کے باعث وہ معاشرے سے نالاں نظر آتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں پر افسوس کرتا اور کڑھتا رہتا ہے جو اس ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں، قومی دولت کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں، یہ ملک جو بُرکھوں نے اتنی قربانیوں سے حاصل کیا ہے، اس ملک کی ایسے بے ضمیر لوگوں کو کوئی قدر نہیں ہے۔ اس ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والوں کو ملک کے ساتھ ساتھ اپنی آنے والی نسلوں کی بھی کوئی قدر نہیں ہے۔ انیس ناگی نے ایسے لوگوں کو ناول میں بے نقاب کیا ہے، دارا کو انیس ناگی نے ناول کے ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے جو لوگوں کی جھوٹی سچی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ قلعہ اور اُس کے انچارج دارا کے تعارف کے ضمن میں ڈاکٹر مشاہین مفتی رقمطراز ہیں:

> "اس بد مزہ پس منظر میں ہمیں ایک خستہ بُجھے ہوئے زرد رنگ کی قلعہ نما عمارت سے متعارف کرایا جاتا ہے۔ جو مغل کلچر کا نمونہ ہے۔ جہاں لوگوں کی آمد و رفت کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اور لوگ اس عمارت کو قلعہ کہتے ہیں۔ قلعہ کا ہیرو ایک سول سرونٹ ہے جسے قلعہ کا انچارج مقرر کیا گیا ہے۔ کہ وہ اس کے بگڑتے ہوئے حالات میں دُرستی کرے۔ دارا ایک لا تعلق، بیگانہ اور بد دماغ آفیسر ہے جو اپنے دفتر کی کرسی پر بیٹھا ہوا بلا کسی تاثر سائلوں کی جھوٹی سچی کہانیاں سنتا رہتا ہے۔"(۴)

دارا کی ایمان داری سب کی آنکھ میں کھٹکتی ہے۔ وہ قلعہ میں ہونے والی کرپشن و بد عنوانی کے خلاف آواز بلند کرنے والا اکیلا شخص ہے۔ لوگوں نے قلعہ کو کرپشن کا گڑھ بنایا ہُوا ہے۔ تاریخ میں قلعے تحفظ کے علمبر دار تھے، محفوظ و مضبوط جائے پناہ کی غرض سے تعمیر کیے جاتے تھے۔ دشمنوں سے بچاؤ کا ذریعہ تھے بادشاہوں کی شان و شوکت کا نشان تھے اور آج کے دور میں قلعے ہماری جڑوں کو مضبوط بنیاد فراہم کرنے کی بجائے ہماری اور سارے نظام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کیلئے کیسے استعمال ہو رہے ہیں، اس کا اظہار انیس ناگی نے اس ناول میں بخوبی کیا ہے۔ انہوں نے قلعہ کو معاشرے اور اس کے منفی عناصر کی کارگزاریوں کی آماجگاہ کیلئے بطور علامت استعمال کیا ہے۔ سلیم شہزاد اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"اس ناول میں قلعہ حفاظت اور جائے پناہ کی بجائے لوٹ کھسوٹ اور انسانی فطرت کے اسفل ہونے کی نمائش گاہ ہے۔ یہ سازشوں اور لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کی آماجگاہ ہے۔ یہ حصول زر میں مبتلا لوگوں کی علامت ہے۔ یہ معاشرے کے کرپشن کی علامت ہے۔ انیس ناگی نے اسے مختلف الجہات معانی دیئے ہیں۔"(۵)

قلعہ اپنی مدت پوری کر چکا ہے، اس کی چار دیواری منہدم ہو چکی ہے۔ گنبد اور مینار خستہ حال ہیں۔ قلعہ کو انسانوں کیلئے خطرناک قرار دیئے جانے کے سبب اُسے گرائے جانے کی افواہیں گردش میں ہیں، جس کی وجہ سے لوگوں میں بے چینی و اضطراب کی کیفیت ہے۔ جن لوگوں کے جائز و ناجائز زمینوں اور پلاٹوں کے حق ملکیت کے کاغذات قلعہ میں موجود ہیں۔ وہ اس کے گرائے جانے کی افواہ کے سبب شدید پریشانی میں مبتلا ہیں۔ سب زیادہ سے زیادہ زمین ہڑپنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک طرف قلعہ کے گرائے جانے کی خبر جبکہ دوسری طرف دارا کے سخت طرز عمل نے لوگوں کو بد حواس کیا ہُوا ہے۔ قلعے کا سارا عملہ بے ایمان ہے، عملے کے لوگ مختلف لوگوں سے رشوت وصول کر کے، دارا سے زمینوں کے ناجائز کاغذات ملکیت پر دستخط کروانے کی فکر میں مبتلا ہیں۔ جبکہ دارا کسی قسم کا ناجائز کام کرنے کو تیار نہیں۔ ناول کے دو کردار "رانا" اور "شیخ صاحب" دارا کو ملامت کرتے ہیں۔ "شیخ صاحب۔۔۔ اس طرح تو ہمارا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا، آپ کو پتہ ہی ہے کتنے بیانے پکڑے ہوئے ہیں، جب سے یہ ۔۔۔ افسر آیا ہے ملکیت کا کاغذ جاری نہیں کرتا، سب کا ناطقہ بند کیا ہُوا ہے۔"(۶)

قلعہ میں بیوروکریسی کا عملہ اپنی من مانی کرنے میں مصروف تھا۔ دارا اُن کے راستے کا کانٹا بنا ہوا تھا۔ اس کی ذات سے سب لوگ پریشان تھے کیونکہ اُنہوں نے رشوت لے کر زمینوں کی ملکیت کے کاغذات جاری کرنے کو اپنا کاروبار بنایا ہوا تھا۔ جس میں خسارہ اُنہیں برداشت نہیں تھا۔ بیوروکریسی کا ادارہ ہماری زندگی کے تمام سماجی و معاشی معاملات کے چھوٹے سے چھوٹے مرحلے کو کنٹرول کرتا ہے۔ اور اسی لیے یہ ادارہ مُلک میں اپنی من مانی کرتا آیا ہے۔ بیوروکریسی کا کردار سیاست، جمہوریت عدلیہ غرض ملک کے ہر ادارے میں کارفرما نظر آتا ہے۔ عنایت الٰہیٰ کے مطابق:

"بیوروکریسی کے ترقیاتی فرائض کو آسان بنانے کیلئے ان کو (خصوصاً ایوب دور میں) اختیارات بھی اس طرح دیئے گئے کہ اس کام میں اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ اس سلسلہ میں قواعد و ضوابط خود بیوروکریسی نے اپنی زبان میں بنائے اور لکھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نجی شعبہ کے درمیان سہولتوں اور وسائل کی تقسیم زیادہ تر ان کی صوابدید کے ماتحت ہو گئی۔ بد عنوانی، اختیارات کے ناجائز استعمال اور رشوت کے فروغ کے لیے غالباً اس سے بہتر ترکیب ابھی تک ایجاد نہیں ہوئی۔"(۷)

ایسا ہی معاملہ قلعہ میں جاری و ساری تھا۔ قلعہ میں تعینات بیوروکریسی کا سارا عملہ اپنے اختیارات کا ناجائز

استعمال کرتے ہوئے جہاں عوام کیلئے مسئلہ بناہوا تھا۔ وہیں اُن کی بدعنوانیوں سے بااختیار اور طاقت ور طبقہ فیض یاب ہو رہا تھا۔ بدعنوان اور کرپٹ لوگ جائیدادیں بنا رہے تھے، بنک اکاؤنٹ بھر رہے تھے، اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے باہر کے ممالک میں بھیج رہے تھے۔ ہر سال نت نئے ماڈل کی گاڑیاں لینا اُن کا مشغلہ تھا۔۔ ایسے ہی لوگ بڑے بڑے شہروں میں پلاٹوں کے مالک بن کے بیٹھے تھے۔ جبکہ دوسری طرف دارا جیسے لوگ تھے جنہیں عملہ پیٹھ پیچھے گالیاں دیتا اور بُرا بھلا کہتا تھا محض اُن کی نیک نیتی اور ایمانداری کی بناپر لوگ اُن کے دُشمن تھے۔ انیس ناگی نے تاریخ کے تاریک پہلوؤں سے ناول میں بخوبی پردہ اُٹھایا ہے۔ انیس ناگی کی تحریریں مثبت سوچ اور مقاصد کی ترجمان بن کر سامنے آتی ہیں۔ انیس ناگی خود بیوروکریسی کے محکمے سے وابستہ رہے۔ اس محکمے کی مثبت و منفی کارگُزاریاں انیس ناگی کے براہِ راست مشاہدے اور تجربے میں آئیں۔ نیز انیس ناگی نے لاہور میں کمشنر برائے متروکہ جائیداد کے طور پر بھی فرائض سر انجام دیئے۔ اسی بنا پر اس ناول میں مشاہدے کی باریکی اور تجربے کی گہرائی دیکھی جاسکتی ہے۔ دارا جیسے کردار انیس ناگی کے آئیڈیل کردار ہیں۔ جو پاکستان کی تاریخ میں حق کے لیے لڑتے نظر آتے ہیں۔ چاہے دُنیا اُن کی جتنی مُخالفت کرے۔ دارا کے ارد گرد کے تمام لوگ اس سے خائف تھے جو نہ خود ناجائز کام کرتا اور نہ ہی کرنے دیتا تھا۔ انیس ناگی ہماری توجہ ایک اہم نکتے کی طرف دلاتے ہیں، اس ملک کی جڑوں کو کاٹنے میں جہاں بہت سے بدعنوان لوگوں کا ہاتھ ہے وہیں بہت سے لوگ پاکستان کی تاریخ میں ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے اپنے منصب کا حق ادا کیا۔ دارا ایسے لوگوں کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ عنایت الہیٰ ملک، گذشتہ دہائیوں میں پاکستان کی تاریخ میں گزرے ایسے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”ایسے محب وطن لوگ تھے اور انھوں نے انتظامی اور اقتصادی اصلاحات پر بعض معرکہ آراء تحریریں اور رپورٹیں بھی حکومت وقت کو پیش کیں مگر ان میں سے بیشتر سیاسی کشمکش اور بیوروکریسی کی روایتی بے حسی کا شکار ہوگئیں۔ آج اُن صحیفوں کا ایک ایک لفظ پکار پکار کر کہتا ہے کہ اگر ہم طاقِ نسیاں پر رکھنے کی بجائے اُن پر عمل پیرا ہوتے تو انتظامیہ کی یہ حالت نہ ہوتی جو آج ہے۔“(۸)

بہت سے باضمیر افسروں نے اپنے عمل، اپنی تحریروں اور تقریروں سے بدعنوانی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ مگر اُن کی آواز کسی نے نہ سنی۔ دارا بھی اپنے عمل سے بدعنوانی کے خلاف جہاد میں مصروف تھا۔ قلعہ میں دارا کے دو ماتحت ”کالے شاہ“ اور ”عمر“ اُس کے وفادار اور حمایتی تھے مگر وہ بھی مسلسل دارا کو وقت کے ساتھ چلنے اور لوگوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتے کیونکہ صرف دارا کو چھوڑ کر اُس سے اُوپر سے نیچے تک کے تمام لوگ زمینوں اور بنگلوں کے ناجائز کاغذات ملکیت جاری کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔ اس ناول میں انیس ناگی نے معاشرے کے افراد کی ہوس و خود غرضی پر شدید طنز اور چوٹ کی ہے۔ لوگ اپنے دم قدم پر کچھ کرنے کی بجائے پچھلی تاریخوں میں فارم داخل کر کے زمینوں پر ناجائز قبضے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ لوگوں کی اس کوشش کے پیشِ نظر دارا

متروکہ جائیداد کی نیلامی کا حکم دے دیتا ہے جس سے اُس کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ دارا اور کالے شاہ اس موضوع پر بات کرتے ہیں: "جناب ہم شہر کو بچانا چاہتے ہیں کہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی کچھ حصہ بچ جائے۔ آپ نے شہر میں متروکہ جائیداد کی نیلامی کا حکم دیا ہے۔ ایک فساد مچ گیا ہے۔"، "ٹھیک ہے شاہ جی، لیکن صرف وہ جائیداد جو ناجائز قبضے میں ہے، یہ زمین صرف اسی نسل کا ہی حق نہیں ہے۔"(۹) دارا جو اس کرپشن و بد عنوانی کے طوفان کا اکیلا مقابلہ کر رہا ہے۔ وہ زمین کو ناجائز ہاتھوں میں جانے سے روکنے کی بھرپور کوشش میں مصروف ہے، اُس کے نزدیک پورا معاشرہ انتہائی خود غرضی و بے حسی میں مبتلا ہے۔ لوگوں کو اپنی آنے والی نسل کے مستقبل کی قطعاً کوئی فکر اور احساس نہیں ہے، لوگوں کو اپنے آج کی فکر ہے، اُن میں دور اندیشی مفقود ہو چکی ہے، لالچ نے لوگوں کے دماغ ماؤف کر دیے ہیں کہ اُنہیں اپنا اچھا بُرا نظر نہیں آ رہا۔ متروکہ زمین کو نیلامی پر لگانے کی وجہ سے دارا کو سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا اپنے افسران بالا کی طرف سے کرنا پڑا جنہوں نے لاہور میں فالتو زمینوں اور پلاٹوں پر ناجائز قبضہ کیا ہُوا تھا۔ اس حوالے سے عنایت الٰہی بیان کرتے ہیں:

> "اپنی ملازمتوں کے دوران بھی یہ سرکاری زرعی زمینوں اور مربعوں کی الاٹمنٹ سے باز نہیں آئے۔ چند ایک ایسے افسروں کی مثالیں سب کے سامنے ہیں جو سول سروس میں آنے کے بعد ہزاروں ایکڑ اراضی کے مالک بن گئے۔ اگرچہ ملازمت سے پہلے ان کے پاس چپہ بھر زمین بھی نہ تھی، تحفے کے طور پر کمرشل اور رہائشی پلاٹ حاصل کرنے کے علاوہ مراعات کے بدلے بڑی بڑی کمپنیوں میں ہدیئے کے طور پر لاکھوں روپے کے حصص انہیں پیش کئے جاتے ہیں۔"(۱۰)

بد عنوان اور رشوت خور افسران نے اس ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا، قیمتی پلاٹس اپنے قبضے میں لے کر ملک کو شدید نقصان پہنچایا۔ جن زمینوں پر اُن کا کوئی حق نہ تھا۔ اُن پر غاصبانہ قبضہ کر کے بیٹھ گئے ایسے میں جو لوگ بھی اُن کے خلاف آواز اُٹھاتے وہ اُن کے جانی دشمن بن جاتے تھے، ان سب حقائق کا اظہار انیس ناگی نے اس ناول میں سچائی کے ساتھ کیا ہے۔ دارا نے جب اُن زمینوں کو نیلامی پر لگایا تو اُس کے گرد دائرہ تنگ کیا جانے لگا۔ دارا کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اُس کی مُخبری اور تعاقب پر لوگوں کو معمور کر دیا گیا تھا، جو دارا کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ مُنشی جمال دین، دارا کو اپنے ارد گرد سے خبردار رہنے کیلئے کہتا ہے۔ "میں صرف آپ کو کہنے آیا ہوں کہ آپ کی جان اور ملازمت دونوں کو بے حد خطرہ ہے۔"، "منشی جی میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟"، "آپ اس قلعہ کو مسمار کرنا چاہتے ہیں۔ سر یہ بد دیانتی کا قلعہ ہے۔ جب تک شہر لوہ آباد ہے۔ اسے گرایا نہیں جاسکتا۔"(۱۱)

انیس ناگی نے لاہور شہر میں بد دیانتی اور کرپشن کے دور دورے کا ذکر کُھل کر کیا ہے، ابتدا ہی اسے بد دیانتی اور بد عنوانیوں کا گڑھ بنایا گیا۔ تاریخ میں جو بھی حکمران آئے، یا بیرونی حملہ آور، لاہور کو ہر ایک کے ہاتھوں تاراج ہونا پڑا۔ بد دیانتی کا قلعہ اس شہر میں ماضی سے اب تک کی جانے والی بد عنوانیوں کی علامت ہے۔ جب تک یہ شہر آباد

ہے، بدعنوانی کی اس علامت کو، اس قلعے کو گرانا ناممکن ہے۔ دارا کی خواہش ہے کہ اس بددیانتی کے قلعے کو مسمار کر دیا جائے تاکہ شہر کرپشن سے نجات حاصل کر سکے۔ دارا اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے ماتحت سے کرتا ہے۔ "عالم یہ اچھا نہیں کہ اس قلعے کو گرا دیا جائے"۔ "سر یہ قلعہ نہیں گر سکتا۔ اس کو تو سارے شہر نے سہارا دیا ہُوا ہے۔ جو اسے گرائے گا وہ خود ہی گر جائے گا۔"(۱۲) ان جملوں میں انیس ناگی کے طنز کی کاٹ کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شہر کے ایک بڑے اور طاقتور طبقے نے کرپشن کا جو بازار گرم کیا ہوا تھا اُس نے لاہور کی بنیادوں میں جگہ بنا لی تھی۔ انیس ناگی کے مُطابق کرپشن و بدعنوانی کا خاتمہ اس شہر کو مسمار کر دینے کے مترادف تھا۔ اگر کوئی شخص بددیانتی کے قلعے کو گرانے کا سوچے گا تو گویا وہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی چلائے گا کیونکہ قلعے میں وصول ہونے والے رشوت کے پیسوں کے ذریعے ہی عیش و عشرت کے سامان مُہیا ہو رہے تھے۔

انیس ناگی لاہور میں پھیلی بددیانتی کے خلاف قلم اُٹھاتے ہیں۔ زندگی کا ایک طویل حصہ لاہور میں گُزارنے کے باوجود انیس ناگی کی تحریروں میں لاہور کے حوالے سے جذباتی حوالے نہیں ملتے۔ انیس ناگی کو لاہور نے کبھی متاثر نہ کیا، یہاں تک کہ جب وہ قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے پہلی بار لاہور آئے، اُسی وقت سے لاہور اُن کو نہ بھایا تھا اس کا اظہار اُنہوں نے اپنی سرگزشت میں بارہا کیا ہے۔ "لاہور شہر میرے لیے بالکل نیا تھا لیکن اس کی سڑکیں اور عمارتوں میں کوئی ایسی بات نہیں تھی، جو میرے اندر کسی تحیر کو جنم دیتی۔"(۱۳) ایک اور مقام پر اُن کے جذبات مزید اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ "شروع ہی سے لاہور میرے لیے پُرکشش نہیں تھا۔ اور مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ شہر میرا عذاب بن جائے گا اور مجھے زندگی کے اسفل ترین مراحل سے گزرنا پڑے گا۔"(۱۴) انیس ناگی جب ۱۹۴۷ء میں ہجرت کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ لاہور آئے، اُس وقت لاہور میں ایک افراتفری اور قیامت کا سماں تھا۔ ہر طرف چیخ و پکار اور بے سروسامانی کی کیفیت تھی۔ لوگ اپنے گھروں، اپنے ٹھکانوں سے بے ٹھکانا ہو چکے تھے۔ ایسا وقت تھا کہ سب لوگ ایک ہی صف میں کھڑے ہوئے تھے۔ اس حوالے سے انیس ناگی اپنی سرگزشت میں لکھتے ہیں:

> "شاید میرے ذہن میں ایسے شہروں کا نقشہ ہے جن کے منظر خوبصورت ہوں جہاں کے لوگ خوبصورت ،مہذب اور خوش لباس ہوں، جہاں سکون ہو اور ہر معاملہ ضابطے کے ساتھ چلتا ہو، جہاں ہر طرح کی آزادی ہو لیکن جو شہر جہنم کا منظر ہوں جہاں انسان اور لکس کی صابن کی ٹکیہ میں کوئی تمیز نہ ہو، وہاں جینا مرنا برابر تھا۔"(۱۵)

ہجرت نے واقعتاً انسان اور صابن کی ٹکیہ میں کوئی فرق نہ رکھا تھا۔ لوگ دربدر تھے اور ٹھکانوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ مہاجرین کی آبادکاری کی مسئلہ منہ کھولے کھڑا تھا۔ انیس ناگی کے نزدیک جہاں لوگوں میں جذبہ ہمدردی و اخوت کو جنم لینا چاہیے تھا وہاں لوگوں نے متروکہ جائیداد کے حوالے سے جھوٹے سچے کلیم داخل کرانا

شروع کر دیئے تھے۔ ہر کوئی اپنی فکر میں مبتلا تھا کہ جلد از جلد لاہور کی ساری زمین اور ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر بلا شرکت غیرے قبضہ کر لیا جائے، جو کچھ ہو اپنے پاس ہو اور کسی کے ہاتھ کچھ نہ آئے۔ مہاجرین نے ایسے وقت میں بھی اپنی بے بسی ولاچاری کو غلط طریقے سے استعمال کیا، اس کا اظہار انیس ناگی اپنی سرگزشت میں یوں کرتے ہیں:

> "پاکستان بننے کے دو تین ماہ کے اندر ہی مقامی باشندوں اور مہاجروں نے ہندوؤں کی متروکہ جائیداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس وقت شہر میں کوئی نظم و نسق نہیں تھا، ایک ملک ٹوٹ رہا تھا ایک ملک بن رہا تھا۔ سب کچھ ابتر تھا۔ شہریوں میں ایک عجیب طرح کی بھوک تھی۔ مہاجر اور مقامی، ہندوؤں کے متروکہ مکان لوٹ کر یہ کہتے کہ ان پر ہمارا حق ہے۔"(۱۶)

ہجرت کے بعد لاہور میں مہاجرین کی جو ذہنیت انیس ناگی کے تجربے سے گزری، اُس کا اظہار اس ناول میں بھرپور انداز میں کیا گیا ہے۔ انیس ناگی کے نزدیک جائیداد کا لالچ، اُس پر قبضے کی خواہش، زمین کی بھوک آج بھی موجود ہے۔ دارا کے افسران بالا خود ان ناجائز کارروائیوں میں ملوث ہیں۔ دارا کا ماتحت عمر، دارا کو زمین کی نیلامی کے اعلان کے بعد لوگوں کے ردعمل سے آگاہ کرتا ہے: "آپ نے شہر میں جو فالتو زمین کی نیلامی کا اعلان کیا ہے۔ اس سے بہت زیادہ ردعمل پیدا ہوا ہے کہ ساری فالتو زمین تو ناجائز قبضے میں ہے۔ ان جعل سازوں کے پیچھے سارا شہر ہے، ہر بڑے افسر کا ان پلاٹوں میں حصہ ہے۔"(۱۷)

انیس ناگی کو بااثر طبقے کی نقاب کشائی میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا۔ اس کا بہترین اظہار اس ناول میں انیس ناگی کے بیان کردہ حقائق سے ہوتا ہے۔ دارا کے وفادار ماتحت مُسلسل اُسے فالتو زمین کی نیلامی کرنے سے روکتے ہیں۔ وہ دارا کو خبردار کرتے ہیں کہ فالتو زمین کی نیلامی پر شور مچانے والوں کی پشت پناہی، افسران بالا کر رہے ہیں۔ معاشرے میں بے ایمانوں کا پورا ٹولہ موجود ہے جن کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ جن لوگوں کو عوام کی پس ماندہ حالت کی کوئی پرواہ اور احساس نہیں تھا۔ ایسے لوگوں کا کام صرف اپنوں کو نوازنا تھا۔ ایسے بڑے بڑے خاندانوں پر انیس ناگی نے بھرپور چوٹ کی ہے جو ملک کے سارے پیسے، ملازمتوں اور یہاں تک کے قیمتی زمینوں پر بھی قیام پاکستان کے بعد سے قابض ہیں۔ اور اُن کی یہ حرص ختم ہونے میں نہیں آتی۔ عنایت الٰہی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "کنبہ پروری اور اقربانوازی تو پاکستان کے معرض وجود میں آتے ہی شروع ہو گئی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے چند خاندانوں نے سرکاری ملازمتوں پر اجارہ داری حاصل کر لی ہے۔۔۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ انہی خاندانوں کے افراد نے بڑے بڑے شہروں کی نو آبادیاتی سکیموں میں اعلیٰ اور ارفع پلاٹ نہایت ہی کم قیمتوں پر حاصل کئے۔"(۱۸)

پاکستان کے وہ لوگ جنہوں نے ملک بننے کے فوراً بعد سے اس کو اپنے خون پسینے سے سینچنا شروع کیا، اس ملک کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کی سعی میں لگے رہے، اُنہیں ہر طرح سے نقصان پہنچایا گیا اور ایسے لوگ جنہوں نے

اس ملک کی ترقی میں اپنا کوئی حصہ نہ ڈالا۔ جو ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں اور پھر بھی اتنے برس گزر جانے کے باجود خود کو مہاجر کہتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک لوگوں کی نیتیں نہ بھری تھیں۔ لوگ آج بھی خود کو بے سرو ساماں ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ایسے لوگوں کے خلاف دارا مُسلسل سینہ سپر ہے۔ تبھی وہ اپنے ماتحت عُمر سے کہتا ہے:

"یار میں تو بگڑے ہوئے معاملات درست کرنا چاہتا ہوں، تیس برسوں سے لوگ دھکے کھا رہے ہیں، ابھی تک ہم اپنے آپ کو مہاجر کہتے ہیں، یہ سلسلہ آ کر کسی نے تو ختم کرنا ہے۔" "جناب ستر فیصد سے زیادہ کلیم جھوٹے ہیں۔ میں خود بٹالے کا مہاجر ہوں، ہمارے شہر میں جو کی تھے وہ اب کارخانوں اور جائیدادوں کے مالک بن گئے ہیں۔"(۱۹)

دارا معاشرے کے بگڑے معاملات اپنی سی کوشش سے دُرست کرنا چاہتا ہے۔ معاشرے اور حالات نے اُسے اتنا تجربہ عطا کر دیا تھا کہ وہ جان سکے کہ آدھے سے زیادہ کلیم جھوٹے اور فرضی ہیں۔ ایسے بے ایمانوں کو دارا آڑے ہاتھوں لیتا۔ وہ ناحق زمین پر قبضہ کرنے والوں کے خلاف تھا۔ انیس ناگی کی ایک ادھوری سر گزشت کا مطالعہ کریں تو ہمیں دارا کے کردار میں انیس ناگی کے والد کا عکس نظر آتا ہے۔ جنہیں ۱۹۴۷ء میں ہجرت کے بعد لاہور میں قائم کیے گئے محکمہ بحالیات میں نافذ کیا گیا تھا۔ مہاجرین کے ساتھ ساتھ مقامی لوگ بھی متروکہ جائیداد حاصل کرنے کی سر توڑ کوششیں کر رہے تھے۔ ایسے میں لوگ مبالغہ آمیز کلیم داخل کروا رہے تھے۔ انیس ناگی ایک ادھوری سر گزشت میں بیان کرتے ہیں:

"ایک دن ایک ہیڈ کانسٹیبل نے میرے والد سے ایک مکان الاٹ کروایا۔ چند دنوں کے بعد وہ اپنی داڑھی مونچھ منڈوا کر ایک دیہاتی کا روپ دھار کر جعلی کلیم کے کاغذ لے کر ایک اور مکان الاٹ کروانے آیا۔ میرے والد نے اُسے پہچان لیا اور اس کے بعد اُن کا غصہ ناقابل برداشت تھا۔ انہوں نے میز پر سے سیاہ رنگ کا رولر اٹھایا اور اسے بے تحاشا زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ وہ اسے گالیاں بھی دیتے جاتے اور کہتے کہ ہم نے پاکستان دھوکہ بازی کیلئے بنایا ہے۔؟"(۲۰)

انیس ناگی کے والد ایک ایماندار افسر تھے۔ ان کیلئے یہ امر ناقابل برداشت تھا کہ لوگ نوزائیدہ مملکت کی جڑوں کو مزید کمزور کریں، بے ایمانی و بدعنوانی سے اس ملک کو لوٹیں، لوگوں میں ہمدردی و یگانگت کی بجائے مکر و فریب نے انیس ناگی کے والد کو بے حد دل برداشتہ و مشتعل کر دیا۔ مکانوں کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں سخت گیر رویہ ہمیں دارا کی یاد دلاتا ہے۔ انیس ناگی اپنے والد کے حوالے سے لکھتے ہیں: "مکانوں کی الاٹمنٹ میں اتنا سخت رویہ لوگوں اور حکام کو پسند نہیں تھا۔"(۲۱) دارا کے جائیداد کی الاٹمنٹ کے حوالے سے سخت گیر رویے، نیز فالتو زمینوں کی نیلامی نے لوگوں کو مزید اس کے خلاف کر دیا۔ دارا کے افسران بالا بھی اس کرپشن میں ملوث تھے۔ دارا جس محکمے

میں افسر تھا۔ اس کا بنیادی کام جائیداد و متروکہ و فالتو زمینوں کا انتظام تھا۔ پاکستان میں "ایویکیو ٹرسٹ پراپرٹی بورڈ"(Evacuee Trust Property Board) پاکستانی حکومت کا ایک قانونی بورڈ ہے، جو ۱۹۶۰ء میں قائم ہُوا ۔ یہ ادارہ ۱۹۴۷ء کی ہجرت کے بعد پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی ایسی جائیداد، جو مذہبی، تعلیمی و خیراتی نوعیت کی حامل ہیں۔ اُن کا انتظام سنبھالتا ہے۔ ایویکیو ٹرسٹ پراپرٹی بورڈ کی رپورٹ کے مطابق: "ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے چھوڑی ہوئی ۲۰ فیصد اراضی پر ملک کے طاقت اور بااثر افراد نے غیر قانونی طور پر قبضہ کر لیا۔ جبکہ بہت سی اراضی ETPB کے کرپٹ اور بد عنوان ملازمین کی کرپشن کی بنا پر ریکارڈ میں درج نہیں کی جا سکی۔" (۲۲) اس رپورٹ کے مطابق بااثر افراد نے متروکہ جائیداد پر غیر قانونی طور پر قبضہ کیا اور ایسا وہ اکیلے نہیں کر سکتے تھے۔ محکمہ کے ملازمین نے اس کرپشن میں اُن کا پورا پورا ساتھ دیا اور محکمہ کے ریکارڈ میں اراضی کا ریکارڈ درج نہیں کیا گیا۔ بلکہ اُسے خرد بُرد کر دیا گیا۔ قلعہ کا عملہ بھی اسی طرح کی کاروائیوں میں ملوث تھا۔ بااثر افراد کے مختلف پلاٹوں اور زمینوں میں حصّے اُنہی کی ملّی بھگت سے تھے۔ طاقت ور لوگوں نے غیر قانونی طور پر ان زمینوں پر قبضہ کیا ہُوا تھا۔ اوراب دارا اُن افراد اور افسران بالا کیلئے مسئلہ بنا ہُوا ہے۔ دارا کے خلاف مسلسل متعلقہ محکمہ کو شکایات بھیجی جا رہی تھیں۔ محکمہ ایک ایماندار افسر کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ انیس ناگی نے "قلعہ" کے ذریعے پورے معاشرے پر طنز اور چوٹ کی ہے۔ دارا کے ذہن میں کئی بار پر خیال اُبھرتا ہے اگر میں بھی انہی جیسا بن جاؤں، جیسا معاشرے کے باقی افراد ہیں، جیسا قلعہ کا باقی سارا عملہ ہے۔ تو پھر لوگ مجھے قبول کر لیں گے۔ "اگر میں ان لوگوں کے کام کر دوں تو میں ان کیلئے ایک مددگار دوست ہوں۔ اگر انکار کر دوں تو بہت برا بھلا کہیں گے۔۔۔ مُجھے معاشرتی تنہائی میں قید کرنے کی کوشش کریں گے۔"(۲۳)

انیس ناگی نے سچائی پر مبنی نکتہ بیان کیا ہے کہ معاشرہ ایسے افراد کو ہی قبول کرتا ہے جو اُس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت رکھتے ہوں جبکہ ایسے افراد جو معاشرے کے دیگر افراد سے الگ اور مختلف سوچ اور عمل کے حامل ہوں، معاشرے اُنہیں خود سے الگ کر دیتا ہے، اُنہیں قید تنہائی کی سزا ملتی ہے، وہ بالکل اکیلے رہ جاتے ہیں، خواہ وہ اپنی جگہ پہ دُرست اور سچے کیوں نہ ہوں اور ایسا ہی دارا کے ساتھ ہو رہا تھا۔ دارا کی سختی اور افسرانِ بالا کے احکام بجانہ لانے اور اُن کے منظورِ نظر لوگوں کو خوش نہ کرنے کی پاداش میں دارا کے خلاف انکوائری شروع کر دی گئی۔ اُسے اپنی ایمانداری، فرض شناسی کے سبب الزامات کا سامنا کرنا پڑا، اُسے ناکردہ گناہوں کی سزا مل رہی تھی۔ اُس کی ایمانداری اُس کا جرم ٹھہرایا گیا۔ دارا کو انکوائری بورڈ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اپنی جگہ پر دُرست ہوتے ہوئے اعتراضات والزامات سننا اور اُن کا سامنا کرنا انیس ناگی کی پیشہ ورانہ زندگی کا تلخ حصہ رہا ہے۔ انیس ناگی کو بھی اُن کے افسرانِ بالا کی جانب سے مسائل کا سامنا رہا۔ درا کا افسر اُس کی ایمانداری کا مذاق اُڑاتا ہے۔ "مسٹر دارا آپ کی شہرت

اچھی ہے، آپ دیانت دار ہیں لیکن دیانت داری اور پاگل پن میں کچھتو فرق ہونا چاہیے؟" دارا یہ سخت جملہ سُن کر کچھ لرز گیا۔"(۲۴) انیس ناگی یہاں معاشرے کی انتہائی بھیانک حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں، جہاں ایمانداری دیانت داری کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔، جہاں دیانت دار کو پاگل اور اُس کی دیانت داری کو اُس کو خبط قرار دیا جاتا ہے۔ ایک ایماندار شخص کو اپنا فرض ادا کرنے سے بہ زورِ قوت روکا جاتا ہے اور اُسے غلط راستے کی طرف دھکیلا جاتا ہے۔ اب دوسرا افسر نکتہ اُٹھاتا ہے۔

> "ملک صاحب ہمارے دوست ہیں، اچھے خاصے افسر ہیں، اُنہوں نے غلطی سے زمین خریدلی تھی، آپ ان کے پیچھے لگ گئے ہیں۔" دارا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "جناب انہوں نے زمین خریدی نہیں۔ سات کنال پر زبردستی قبضہ کر کے ایک ہفتے میں عمارت کھڑی کر کے یہ موقف اختیار کیا ہے وہ ۱۹۷۶ء سے اس پر قابض ہیں۔ ان کی وجہ سے محکمے کا چالیس لاکھ کا نقصان ہے"، "کیا فرق پڑتا ہے، اور لوگوں نے بھی تو یہی کام کیا ہے۔"(۲۵)

پاکستان کی تاریخ میں ایسے افسران، جنہوں نے متروکہ زمین و جائیداد پر غاصبانہ قبضہ کیا، اُن پر انیس ناگی نے بے خوفی سے چوٹ کی ہے۔ ماضی میں طاقت ور افراد کی کرپشن کا ساتھ خود محکمے کے افراد نے دیا۔ اور خوب ناجائز مال اکٹھا کیا۔ افسر کا اس بات کا اظہار کہ کرپشن کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، سب ہی ایسا کر رہے ہیں پورے معاشرے کے ناسور کی طرف اشارہ ہے۔ عنایت الٰہی نے اداروں کی کرپشن کا تجزیہ اپنی تصنیف پاکستان میں انتظامیہ کا زوال میں وضاحت کے ساتھ کیا ہے: "آزادی سے قبل بھی کرپشن موجود تھی لیکن کچھ روایتی محکموں تک محدود رہی۔۔۔ پھر (قیامِ پاکستان کے بعد) ترقیاتی عمل میں کرپشن کی نئی جہتیں اور صورتیں وجود میں آئیں۔ اور ان پر کسی حد کا تعین نہیں کیا جاسکا۔"(۲۶) ماضی سے لے کر دورِ حاضر تک کرپشن نے ملک اور اس کے اداروں کو کس قدر نقصان پہنچایا، اس کا اندازہ ہمیں ناول سے بخوبی ہوتا ہے۔ ایسے محکموں سے انیس ناگی کا براہِ راست تعلق رہا۔ اُنہوں نے یہ تمام حقائق و واقعات اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھے، تاریخ کی بدعنوانیوں کو اپنے سامنے تاریخ کا اٹوٹ حصہ بنتے ہوئے دیکھا، اور پھر اپنے ناول کا موضوع بنایا۔ اس کا اندازہ ہمیں دارا کے جواب سے بخوبی ہوتا ہے کہ انیس ناگی اس ملک اور شہر کے بدلتے ادوار کے شاہد تھے۔

> "آپ نے اس کی ملکیت کا کاغذ کیوں روکا ہُوا ہے؟"، "اس لیے کہ اس کی کتاب معاوضہ جعلی ہے، یہ کوٹھی ایک بیوہ کو عارضی طور پر ملی تھی، وہ لاولد تھی، اس کے انتقال کے بعد اس پر ناجائز قبضہ کر کے جعلی کاغذات بنائے گئے ہیں، آپ کو یہ سب کچھ کیسے پتہ ہے؟ پہلے آدمی نے کہا، "کیونکہ یہ میرے شہر کی ملکیت ہے۔ اس لیے مجھے ان سب کی سوانح عمریاں بھی معلوم ہیں۔"(۲۷)

داراکی طرف سے ہر ممکن وضاحت اور اپنی پوزیشن صاف کرنے، اپنی ایماندار کا ثبوت فراہم کر دینے کے باوجود اُس کے بد عنوان افسران بالا اُسے ذلیل کر کے آفس سے نکال دیا، انیس ناگی نے تاریخ میں ایمانداری کو جیسے بکتے دیکھا، دیانت داری کا جیسے مذاق بنتے دیکھا، اُسے اپنے داخل میں محسوس کیا اور دارا کے کردار کے ذریعے اس کا بخوبی اظہار کیا۔ ماضی میں انیس ناگی کے والد کو ایمانداری کی بنا پر اپنے افسران کی طرف سے جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا، اس کا واضح طور پر اظہار داراکی کیفیت سے ہوتا ہے۔ انیس ناگی کے والد بھی ایمانداری و فرض شناسی کی قیمت چکا رہے تھے۔ انیس ناگی نے ۱۹۴۷ء کے تاریخی دور میں اداروں کی کرپشن اور اُن کے خلاف آواز اُٹھاتے اپنے والد کو دیکھا جو تنہا بد عنوان عناصر کے خلاف آواز اُٹھانے والے تھے جس کی بنا پر اُنہیں بہت سی مُشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انیس ناگی ایک ادھوری سر گزشت میں لکھتے ہیں "ایک رات کافی دیر سے وہ میانوالی سے گھر پہنچے۔، "خیریت تو ہے کہ بغیر اطلاع کے اس وقت آپ آئے ہیں۔"، "بس ایک نئی مشکل پڑ گئی ہے""سرکار کا آدمی ہوں کسی ٹمن داریانواب کا ملازم نہیں ہوں۔ میں کسی کے سامنے کیوں جھکوں۔"(۲۸) انیس ناگی کے مطابق اُن کے والد کو اُن کی فرض شناسی اور ایمانداری سے اپنے کام کرنے کی پاداش میں، محکمے کی طرف سے انتہائی سختی کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن کے خلاف انکوائری کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ جن لوگوں نے مل کر پاکستان اور اس کی جڑوں کو کھوکھلا کیا۔ آزادی مل جانے کے باوجود اس کی قدر نہ کی اور آزادی کے اتنے برسوں بعد بھی اپنے زور بازو پر کچھ نہ کیا بلکہ رشوت اور سفارش کو اپنا دین و ایمان بنائے رکھا، ایسے لوگوں نے انیس ناگی کے والد کی ایمانداری کو بھی جرم بنا دیا۔ انیس ناگی اپنے والد کے خیالات اُنہی کے الفاظ میں اپنی سر گزشت میں نقل کرتے ہیں:" میں ملازمت میں بہت سینئر ہوں، اس کے باوجود مجھے چھوٹے چھوٹے شہروں میں تعنیات کیا جاتا ہے۔ ہائیکورٹ میں ابھی تک دو تین جج میری مخالفت میں ہیں۔ انہیں میرے خلاف انکوائری کرنے کا ایک اور موقع مل جائے گا۔"(۲۹)

قیام پاکستان کے بعد جب انیس ناگی کے والد کو میانوالی میں تعینات کیا گیا تو وہاں کا نواب اُن کا شدید مخالف ہو گیا کیونکہ اُنہوں نے میانوالی میں ایک ہندو کا متروکہ قلعہ یہ کہہ کر اُس نواب کے نام الاٹ نہیں کیا کہ متروکہ جائیداد پر مہاجروں کا حق ہے، جو بے سروسامان ہیں، جن کے پاس رہنے کو کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ نواب اُن کا جانی دشمن بن گیا اور ان پر رات کی تاریکی میں حملہ کروایا گیا مگر وہ محفوظ رہے۔ انیس ناگی اپنی سر گزشت میں اپنے والد پر حملے کا تذکرہ اُنہی کی زبانی کرتے ہیں:

> "گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنی میں ایک دم چوکنا ہو گیا کہ یہ قبائلی علاقہ ہے یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے اپنے تکیے کے نیچے سے ریوالور نکالا اور اس میں چھ گولیاں بھریں اور کھڑکی میں سے دیکھا کہ چار گھڑ سوار کالے کپڑے پہنے، ہاتھوں میں رائفلیں لیے ریسٹ ہاؤس کی طرف بڑھ رہے تھے۔۔۔ انہوں نے گولیوں کی اک باڑ میرے کمرے کی کھڑکی پر ماری۔"(۳۰)

اس حرکت سے افسران بالا کی یہ سازش بے نقاب ہو کر سامنے آگئی کہ انیس ناگی کے والد کو خاص مقاصد کے تحت ایسی جگہوں پر تعینات کیا جاتا جہاں بظاہر اُنہیں کرپشن کے خاتمے کی ذمہ داری سونپی گئی ہوتی مگر اصل مقصد اُن کو راستے سے ہٹانے کا اور اُن کی جان خطرے میں ڈالنے کا تھا اور بالکل ایسا ہی ہمیں دارا کی صورتحال میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ قلعہ جہاں بڑے بڑے افسران اپنی تعیناتی کا خواب دیکھتے تھے تاکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مال و دولت اکٹھا کر سکیں، وہاں دارا کو قلعے کی تعیناتی بغیر کسی رشوت و سفارش کے مل گئی تھی۔

> "دارا کا خیال تھا کہ ایسے یہ نئی تعنیاتی مفت میں مل گئی تھی لیکن قدرے غور و خوض پر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اوپر والوں نے اسے یوں ہی نہیں بھیجا تھا، اسے البتہ قربانی کا بکرا بنایا گیا تھا۔ مارشل لاء لگا ہوا تھا اور سول حکام نے اپنی بہتر کارکردگی دکھانے اور کرپشن کا سدّباب کا ڈھونگ رچانے کیلئے دارا کو قلعہ میں تعینات کیا تھا۔"(۳۱)

انیس ناگی نے اس جگہ ۱۹۷۷ کے ضیاالحق کے مارشل لا ءکا ذکر کیا ہے۔ جس کی جبریت انیس ناگی کی تحریروں میں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ناول میں جہاں انیس ناگی تذکرہ کرتے ہیں کہ تیس سال ہو گئے اس ملک کو بنے ہوئے، آخر ہم کب تک خود کو مہاجر کہیں گے۔ یہاں انیس ناگی کے تیس سال کے ذکر کے حساب سے قیامِ پاکستان ۱۹۴۷ء سے تیس برس بعد کا عرصہ ۱۹۷۷ء کا سال بنتا ہے، یہ وہ دور ہے جب پاکستان میں تیسرا مارشل لاء نافذ ہوا۔ جنرل ضیاالحق کا مارشل لاء قریباً ساڑھے آٹھ برس پر محیط تھا۔ یہ عرصہ پاکستان کی تاریخ کا ایک مشکل اور دُشوار گزار دور تھا۔

انیس ناگی نے مارشل لاء میں ایماندار افسروں کی کڑی نگرانی، اُن پر بے جا اور ناجائز سختی اور آخر کار اُن کے مخالف عناصر کی جیت کے خلاف بے باکی و سچائی سے لکھا ہے۔ مارشل لاء میں اداروں پر معمول سے زیادہ سختی کی بنا پر دارا کے افسران اپنی کارکردگی بہتر دکھانے کی کوشش میں دارا کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے۔ تاکہ اپنی جان چھڑائی جاسکے۔ انیس ناگی نے دارا کے کردار کو معاشرے میں اچھائی کا علم بردار دکھایا ہے۔ مگر اپنے گرد تنگ ہوتے دائرے سے بعض دفعہ شدید پریشان اور مضطرب بھی ہو جاتا ہے۔ اس کا اظہار وہ اپنے ماتحت سے کرتا ہے۔ "عمر میں موت سے نہیں ڈرتا، میں کسی ایک کا ذاتی مخالف نہیں ہوں۔ شاید میرے اندر بھی لالچ ہو، خواہش ہو، لیکن ہم اگر سب ایک ہو جائیں تو پھر ـــــ شہر میں طوفان مچا ہوا ہے، یہ محض زمین نہیں ہے، ایک سیلاب ہے، سب کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ دراصل جو کچھ میرے بڑوں نے کیا میں وہ نہیں کرنا چاہتا۔"(۳۲)

انیس ناگی نے ناول میں پاکستان کی تاریخ کے اُن بدعنوان افراد پر چوٹ کی ہے جنہوں نے لالچ و طمع کے ہاتھوں ہر دور میں اپنے ملک کو نقصان پہنچایا، جنہوں نے ذاتی مفاد کی کی خاطر زمیوں پر ناجائز قبضے کیے اور اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجادی، انیس ناگی حکمرانوں پر چوٹ کرتے ہوئے دارا اور ایک مشہور اخبار کے صحافی کی گفتگو کا تذکرہ

کرتے ہیں: ”وہ ایک مشہور اردو اخبار کا چیف رپورٹر تھا، اس لیے دارا کچھ سنبھل گیا۔ کیونکہ اُسے احساس تھا کہ آج کل جو بات اخبار میں اُچھالی جاتی ہے، اس کا بہت جلد نوٹس لیا جاتا ہے اور جب حکمران کمزور ہوں تو اخبار والے زیادہ مضبوط ہو جاتے ہیں۔“(۳۳)انیس ناگی نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ماضی ہو یا حال، حکمرانوں نے عوام کیلئے وہ کچھ نہیں کیا جس کے وہ عوام سے وعدے کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ملک کو لوٹ کر اپنے خزانوں کو بھرنے کی کوشش کی ہے اور ایسے میں جب حکمران اپنے ذاتی فائدے کو ملکی فائدے پر فوقیت دیتے ہیں تو وہ حکمران عوام کی نظروں میں اپنی حیثیت واہمیت کھو دیتے ہیں اور پھر ہمارا میڈیا اور اخبارات کو کھُل کر بولنے اور احتساب کرنے کا پورا پورا موقع مل جاتا ہے، ایسی صورت میں انہیں خاموش کرانا آسان نہیں۔ یہ بات دارا بخوبی جانتا تھا۔ صحافی دارا سے اپنے ذاتی کام کے حوالے سے آیا ہے جو کہ ناجائز ہے، دارا کے انکار پر وہ دارا کو دھمکیاں دیتا ہے کہ اخبار میں دارا کی نجی و ملازمتی زندگی کے حوالے سے غلط خبریں شائع کرے گا۔ مگر دارا اس بات کی پرواہ نہیں کرتا۔ مارشل لاء میں انیس ناگی کو ملازمتی و ذاتی زندگی میں بہت سی دشواریوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ انیس ناگی کی مخبری اور تعاقب کروایا گیا، اُنہیں ملازمت سے جبری طور پر نکال دیا گیا۔ انیس ناگی کے والد کے ساتھ ساتھ انیس ناگی کی اپنی ملازمتی زندگی کی دشواریوں کی جھلک بھی دارا کی پیشہ ورانہ زندگی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ دارا کی بھی مخبری اور تعاقب کیا جا رہا تھا۔ اُسے اندازہ تھا کہ اُس کی نقل وحرکت پر نظر رکھی جارہی ہے۔ دارا اپنے وکیل دوست سراج سے ملنے اس کے چیمبر پہنچتا ہے۔ تبھی اُسے احساس ہوتا ہے۔ ”میں نے یہاں آکر غلطی کی، اکثر مجھے جانتے ہیں اور سراج کے چیمبر میں جاتا ہوا دیکھ کر کیا کہیں گے؟ کہ وہ میرا ٹاؤٹ ہے؟ کیا مُصیبت ہے۔“(۳۴)دارا جب بھی اپنے دوستوں ڈاکٹر ظفر، وکیل سراج، پروفیسر آرتھر کے ساتھ بیٹھتا تو سب مل کر کرپشن زدہ معاشرے اور ملک کے بگڑتے حالات پر تبصرہ کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے۔ ”یار ہم میں سے ایک ڈاکٹر ہے، ایک وکیل، ایک پروفیسر اور ایک بیورو کریٹ، ہم سب مل کر اس نظام کی جڑیں کاٹ سکتے ہیں۔۔ جڑیں تو تمھاری پہلے کی کٹی ہوئی ہیں، اب کاٹنے کیلئے اور رہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ظفر نے کہا۔“(۳۵)

انیس ناگی کی تحریریں ملک کے کھوکھلے نظام پر گہرے طنز اور شدید چوٹ کی عکاس ہیں۔ ہماری جڑیں کمزور ہیں، ہماری بنیاد کھوکھلی اور ناپائیدار ہو چکی ہے۔ ہمارے ملک کی بنیادوں میں کرپشن ایسے سما چکی ہے کہ پورا ملک لرز رہا ہے۔ ہمارا نظام تباہی کا شکار ہے اور ہمارے حکمرانوں کو اس کا احساس تک نہیں۔ اس ملک کی جڑوں کو، اس کی بنیادوں کو ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہی مستحکم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ آزادی کے بعد سے اب تک ہم نے اس ملک سے صرف وصول کیا ہے، لوٹایا نہیں۔ اور ایسے میں شہر لوہ (لاہور) میں زمین پر قبضے کا ضبط خطرناک حدوں کو چھونے لگا تھا۔ ہر کوئی ناجائز طریقے سے زمین ہتھیانے میں مصروف تھا۔ قلعہ کا عملہ پوری طرح سے ایسے بدعنوان لوگوں کا

ساتھ دینے میں مصروف تھا۔ دارا کے مخالفین کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ تیزی سے بڑھتی آبادی نے لوگوں کو عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر دیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے لیے اس زمین میں سے کچھ نہ بچے لہٰذا جلد از جلد زیادہ سے زیادہ زمین اپنے قبضے میں کر لینے ہی میں عافیت ہے۔ انیس ناگی نے ان عوامل کو اس ناول میں بخوبی واضح کیا ہے۔ "ان دنوں شہر لوہ میں ملکیت کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ ہر ایک کو یہ عارضہ تھا کہ وہ جعل سازی سے، تعلقات سے یا سیاسی داؤ کے ذریعے شہر میں جو زمین بچی ہے اس پر قبضہ کر کے اسے اپنی دائمی ملکیت میں شامل کر لے۔ اس کی وجہ لوگوں کا خوف یہ تھا کہ آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔"(۳۶) انیس ناگی یہاں شہر لاہور میں زمین کے حوالے سے بڑھتے لالچ پر کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ لینے کی خواہش ہر دور میں انسان کے اندر موجود رہی ہے۔ روزِ ازل سے انسان اس عدم تحفظ کا شکار رہا ہے کہ کہیں کوئی اور اس سے پہلے کامیابی نہ پالے، دوسرا کوئی اُس سے زیادہ خوشحال نہ ہو جائے یا دہ دُنیاوی مرتبے وحیثیت میں دوسرے سے کم تر نہ گردانا جائے۔ اسی لالچ نے انسان کا سکون چھین لیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ زر اور زمین کو اپنی ملکیت میں لے کر ہی انسان احساس تحفظ سے ہم کنار ہوتا آیا ہے۔ انیس ناگی نے انسانی نفسیات کو ناول میں بخوبی بیان کیا ہے اور اس لالچ کو وبا کا نام دیا ہے۔ وبا جب پھیلتی ہے ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے کر بیمار کر دیتی ہے۔ زمین پر قبضے وملکیت کی خواہش کی وبا شہر لاہور کے باسیوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ لوگ اس عارضے میں مبتلا ہو کر ہر ممکن کوشش میں مصروف تھے کہ کسی طرح بھی ہو بس شہر کی بچی ہوئی زمین اُس کے حق ملکیت میں آجائے، ایسے میں لوگ ہر طرح کا حربہ اپنا رہے تھے چاہے وہ رشوت ہو، یا سفارش یا کوئی سیاسی تعلق۔

لیکن یہاں ایک اور امر بھی انیس ناگی واضح کرتے ہیں کہ زمین کا یہ لالچ اور حرص، زمین حاصل کرنے کے بعد ختم ہونے کی بجائے اور زیادہ بڑھتا جارہا تھا، لوگوں کی نیتیں کسی بھی طرح بھرنے میں نہیں آرہی تھیں، ملکیت کی وبا ایسی پھیلی تھی کہ اس نے لوگوں کو ذہنی وقلبی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک عجیب قیامت وافراتفری کا سماں تھا۔ اور جبکہ لوگوں کا لالچ اس حد تک بڑھ چکا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ دارا جسے افسر کو ایمانداری وفرض شناسی سے اپنے فرائض انجام دینے دیا جاتا۔ آخر کار اُسے نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔

انیس ناگی نے بھی زندگی میں جہاں اپنے دل کی، اپنے ضمیر کی آواز سُنی، اُنہیں بھی ایسی ہی مُشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اُنہیں بھی اس نظام نے قبول نہ کیا، اُن پر بھی زندگی کا دائرہ تنگ کیا گیا، اُنہیں بھی ملازمت سے نکال دیا گیا کہ یہ معاشرہ اپنی ڈگر سے ہٹ کر چلنے والوں سے جینے کا حق بھی چھین لیتا ہے۔ تاریخ کی جبریت کو انیس ناگی نے اپنی زندگی میں قدم قدم پر سہا، قیام پاکستان کے بعد اُن کے والد کو بدعنوان لوگوں نے ایمانداری کی پوری پوری سزا دی، اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں انیس ناگی کو بہت سی کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا، اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کی

تاریخ کے مختلف ادوار میں انہیں جبر و استبداد کا سامنا کرنا پڑا، تاریخ کے تمام حالات و واقعات کو انیس ناگی نے اپنے باطن میں محسوس کیا اور پھر اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ انیس ناگی نے دارا کو اچھائی کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ مگر دارا کو کرپٹ نظام الزامات کی بھرمار کر کے نوکری سے فارغ کر کے گھر بھیج دیتا ہے۔ دارا اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات کے بارے میں سوچ کر کُڑھتا ہے۔ "اُس نے کار چلاتے ہوئے ایک دو مرتبہ اپنا سر جھٹکا اور ان الزامات کے بارے میں سوچنے لگا جو اُس پر لگائے گئے تھے۔ جن میں ایک ریکارڈ روم کو آگ لگانے کا تھا۔ ایک اور الزام لوگوں کو ناجائز تنگ کرنے، منشی جمال کے ذریعے رشوت لینے کا تھا۔ "(۳۷) دارا اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کے حوالے سے حیران و پریشان ہونے سے زیادہ بے حسی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اب وہ اپنے اوپر لگائے جھوٹے الزامات کی صفائی میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اُس کا دل اور دماغ نفع و نقصان کے حساب کتاب سے آزاد ہو چکا ہے۔ ناول میں انیس ناگی نیکی اور بدی کے درمیان مسلسل جنگ کی کیفیت دکھاتے ہیں کہ کس طرح ماضی میں پاکستان کے حالات بنتے بگڑتے رہے، کس طرح سے ملک دشمن عناصر نے ملک کو نقصان پہنچایا جبکہ باضمیر لوگوں نے ملک کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر بالآخر کرپشن زدہ نظام کی جیت ہو گئی۔

معاشرے نے دارا کو قبول نہ کیا، نوکری سے نکال دیئے جانے کے بعد دارا اپنی آبائی حویلی میں سکونت اختیار کر لیتا ہے۔ دارا کو ایمانداری کے باوجود جس ذلت کا سامنا کرنا پڑا، اُسے کرپٹ اور بدعنوان ثابت کیا گیا۔ اس چیز نے اُسے ہر چیز سے بددل کر دیا تھا۔ اُسے ناکردہ گناہوں کی سزا کا مرتکب ٹھہرایا گیا۔ دارا کو بنیادی طور پر افسران بالا نے اپنی گردنیں بچانے کیلئے قربانی کا بکرا بنایا۔ بیوروکریسی کے ادارے میں ہونے والی کرپشن کے ذمہ دار افسران جو قلعہ میں ہونے والی کرپشن میں ملوث تھے۔ اُنہوں نے سارا نزلہ دارا پر گرایا اور اس کی ایمانداری کو بے ایمانی کے لبادے میں لپیٹ کے پیش کر دیا۔ پاکستان میں یہ ریت نئی نہیں جس کا انیس ناگی ذکر کرتے نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے عنایت الٰہی ملک لکھتے ہیں:

> "اس ملک میں بدعنوان اور رشوت خور افسروں کے خلاف تفتیش اور مقدمات کے دوران ایسے وزراء انہیں بے گناہ ثابت کرنے کیلئے پوری طرح ان کا ساتھ دیتے ہیں اور بیوروکریسی ایسے موقعوں پر ان مقدمات کو اپنے وقار اور انا کا مسئلہ بنا کر تحقیقاتی ایجنسیوں سے تعاون نہیں کرتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعلیٰ افسران اور سیاستدان تو اپنی گردنیں بچا لیتے ہیں اور ماتحت عملے کو نمونے کے طور پر تھوڑی سی سزا دے دی جاتی ہے۔"(۳۸)

دارا کو بھی اُس کے افسران نے ایماندار ہوتے ہوئے بھی ماتحت ہونے کے ناتے سزاوار ٹھہرایا کرپشن کا سارا نزلہ دارا پر گرا اور اعلیٰ افسران نے اپنے آپ کو صاف بچا لیا۔ جس نے دارا کی کایا پلٹ کر دی۔ اب دارا ایک بالکل الگ انسان کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے، وہ "زہر ہی زہر کو مارتا ہے" کے مقولے کو اپنے قول و فعل سے سچ کر

دکھاتا ہے۔ یہاں انیس ناگی ناول کا رخ ایک دم موڑ دیتے ہیں اور اب دارا ہمیں اُسی کرپشن زدہ نظام کا ایک حصّہ نظر آتا ہے۔ وہ بدعنوان معاشرے سے مقابلہ کرنے اور اُسے پسپا کرنے کے لیے خود بدعنوان بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر شاہین مفتی کے مطابق:

> "جسے لوگ قلعہ کہتے ہیں یہ قلعہ بد دیانتی، زیادتی، ظلم، بے حیائی اور صورت حال کی جبریت کا قلعہ ہے جسے دارا گرا تو نہیں سکا تاہم اپنے انتخاب کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے ایسے مقام پر پہنچا ہے جہاں سنجیدگی Farce کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور انسانی نیکی کا قلعہ سمٹ کر بد عنوانی کے قلعہ کی ایک معمولی اینٹ میں ڈھل جاتا ہے۔"(۳۹)

دارا جس عزم کے ساتھ ایمانداری کے راستے پر چلا تھا، جس عزم کا اظہار کرتا نظر آیا تھا کہ جو پہلے بڑوں نے کیا، یعنی تاریخ میں ہمارے حکمرانوں نے پاکستان کے نظام اور بنیادوں کو کمزور بنایا، مارشل لاز نے ملک کو معاشی طور پر خستہ حالی کی طرف دھکیلا، طاقت وار افراد نے ماضی میں طاقت کے بل پر ناجائز ہتھکنڈوں سے فالتو زمینوں پر قبضہ کیا، کرپشن کے ذریعے لاہور کی جڑوں کو کاٹا، دارا وہ سب کچھ نہیں کرے گا۔ مگر دارا بالآخر تمام حقائق کو فراموش کر کے، بُروں کے ساتھ بُرا بن جاتا ہے، اُسے یہی راستہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ جب اچھائی کی کوئی قدر نہیں تو برائی کے راستے پر چلنا ہی بہتر ہے۔ پورے معاشرے سے کٹ کر تو نہیں رہا جا سکتا، بدعنوانی کے جس قلعے کو دارا مسمار کرنا چاہتا تھا وہ ایسا تو نہ کر سکا بالآخر خود مسمار ہو گیا۔

اب اُس کے مالی حالات بھی اچھے نہیں رہے تھے، محکمے سے بقایا جات وصول کرنے کیلئے وہ عمر اور کالے شاہ کی مدد حاصل کرتا ہے۔ دارا برائی کا مقابلہ بُرائی سے کرنے کی ٹھان چکا ہے۔ وہ اسی راہ پر چلنا غنیمت سمجھتا ہے۔ جس پر باقی معاشرہ گامزن ہے۔ دارا کی خود سے جنگ جاری رہتی ہے۔ "میں کرپٹ تھا یا نہیں، اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ اس نظام میں جو فیصلے کئے جا رہے ہیں، میں ان کی صداقت سے منحرف ہوں چھوڑو یار میں واقعی بد دیانت ہوں۔"(۴۰) دارا نے جس کرپشن سے عمر بھر انکار کیا، اُس کے طوفان کو روک کے رکھا۔ قلعہ میں مواقع ہونے کے باوجود کبھی اپنے دامن کو میلا نہ ہونے دیا۔ بالآخر اسی کرپشن کا حصّہ بننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ دارا اب ایک نیا عزم کرتا ہے۔ "اگر میں بے ایمان ہوں پھر مجھے واقعی بے ایمانی کر کے ثابت کرنا چاہیے کہ میں واقعی بے ایمان ہوں۔"(۴۱)

انیس ناگی نے معاشرے کی اس تلخ حقیقت کو ناول میں واضح کیا ہے۔ اگر ہم تاریخ کے صفحات پر نظر دوڑائیں تو ہمیں ہر دور میں کرپشن کے خلاف آواز اُٹھانے والے نظر آئیں گے، جہاں ہم اُنہیں حالات سے لڑتے دیکھتے ہیں، وہیں بہت سے لوگوں کو حالات کے آگے گھٹنے ٹیکتے بھی پاتے ہیں۔ ہمارے نظام میں پھیلی کرپشن ملک کے ساتھ ساتھ افراد کو بھی کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ دارا بھی اسی نظام کا حصّہ بن کر بے ایمانی کا راستہ اختیار کرنے پر

مجبور ہُوا۔ دارا جہاں پہلے خود کو ایماندار ثابت کرنے پر جُتا ہُوا تھا اب وہیں وہ خود کو بے ایمان ثابت کرنے کو تیار ہے۔ انیس ناگی یہاں دارا کے ساتھ ساتھ پورے پاکستانی معاشرے کے زوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں کیونکہ معاشرہ افراد سے قائم ہے۔ اور دارا بھی اسی معاشرے کی ایک اکائی ہے اور اگر معاشرے کی ساری اکائیاں بدعنوان ہو جائیں تو معاشرہ مکمل طور پر زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔

اب دارا اس بدعنوان معاشرے کا مقابلہ کرنے کیلئے اپنی مضبوط معاشرتی حیثیت بنانے کی سعی میں جُت جاتا ہے، جو اُسے اپنی من مانی کرنے کا اختیار بخش دے۔ دارا، کالے شاہ اور عمر کی مدد سے اپنی کوٹھی میں ہفت روزہ اخبار کا دفتر اور حویلی میں قرآن مجید پڑھنے کی غرض سے بچوں کے مدرسے کا اجراء کرتا ہے جس کا بظاہر مقصد عوام کی بھلائی ہے جبکہ اُس کی آڑ میں دارا کونسلر کا الیکشن لڑنے کی تیاری میں مصروف ہے، دارا کی اس پیش رفت کا مقصد سماج میں مضبوط حیثیت کا حصول ہے کیونکہ وہ یہ بات جان چکا ہے کہ معاشرے میں ایمانداری کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اب دارا بے ایمانی کے سارے داؤ پیچ سیکھ چُکا ہے۔

شراب نوشی اُس کا معمول بن چکی ہے۔ وہ طاقت کے حصول کی خاطر ہر حد تک جانے کو تیار ہے۔ الیکشن جیتنے کی غرض سے دارا اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیسے کے بل پر ووٹروں کو خرید لیتا ہے۔ کالے شاہ اور عمر کے ذریعے قلعہ سے وہ سابقہ فائلیں، جن پر اُس نے پہلے دستخط کرنے سے انکار کیا تھا، اب وہ منگوا کر اُن پر دستخط کرنے عوض بھاری رقمیں وصول کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اُس کے اندر کے ایماندار شخص کو معاشرے نے گلہ گھونٹ کر مار ڈالا ہے۔ "دارا ان فائلوں کو۔۔۔ اپنے دستخطوں کو دیکھ کر مُسکراتا۔" دستخط تو وہی ہیں، قلم بھی وہی ہے، پہلے انکار اور اب اقرار اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں پہلے ہی شہید بن چُکا ہوں، اب نہیں، مجھے بد دیانت کہا گیا ہے۔"(۴۲)ان جملوں میں انیس ناگی تاریخ میں انسانیت کے قتل کا نوحہ کرتے نظر آتے ہیں جہاں لالچ، طمع، اقتدار کی خواہش، مفاد پرستی و مُنافقت نے انسان کو اُس کے رُتبے سے بہت نیچے گرا دیا۔

انیس ناگی نے ستر کی دہائی میں پاکستانی معاشرے میں بڑھتی بدعنوانی کو اس ناول میں بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ جب مفاد پرستی کے بڑھتے رُجحان نے انسانی اقدار کو بُری طرح پامال کیا، انسان کے اندر ایسے عدم تحفظ کو جنم دیا کہ انسان کا ہر چیز پر سے اعتبار اُٹھ گیا اور اُسے صرف اور صرف اپنی ذات اور اُس کا تحفظ نظر آنے لگا۔ اور اس سب کے نتیجے میں غیر انسانی ماحول پروان چڑھا جس نے انسانیت کو سولی پر چڑھا دیا۔ دارا بالآخر انسانیت کو روندتا، کچلتا، زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھتا ہُوا کونسلر کا الیکشن جیت جاتا ہے۔ جس کامیابی کی اُسے تلاش تھی، وہ اُسے مل جاتی ہے۔ دارا اپنی جیت کا تجزیہ کرتا ہے۔ "دنیا کو جیتنے کیلئے یہ سیڑھی ضروری تھی۔ میرے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا گیا۔ ابھی مجھے اور الیکشن بھی جیتنا ہے۔" دارا اپنی جیت کا تجزیہ کرنے لگا کہ اس کی اصل وجہ اس سیاسی پارٹی کی پُشت پناہی تھی جس

نے ووٹروں کو خرید اتھا۔"(۴۳)انیس ناگی نے پاکستانی تاریخ کے ایک اور المیے کی طرف اشارہ کیا ہے۔رُجحان چلا آتا ہے کہ الیکشن غیر جانبداری سے لڑنے اور جیتنے سے زیادہ ووٹروں کو ملازمت اور سہولتوں کا لالچ دے کر جیتے جاتے رہے ہیں۔ دارا کو جیت اُس کے دم قدم پر نہ ملی تھی۔ یہ سیاسی پارٹیوں کی پشت پناہی کا پیش خیمہ تھا جنھوں نے پیسے کے زور پر لوگوں کی مجبوریاں خریدی تھیں۔ اس ناول میں انیس ناگی نے پاکستانی معاشرے کے زوال کا سبب ایسی ہی مجرمانہ سرگرمیوں کو ٹھہرایا ہے۔ انیس ناگی تاریخ کا تجزیہ پوری بے باکی سے کرتے نظر آتے ہیں۔ تاریخ کے بگڑتے چہرے سے نقاب ہٹاتے نظر آتے ہیں۔ ہمارے آج کے زوال کا سبب محض حال کی کوتاہیاں نہیں بلکہ تاریخ کی وہ بھیانک سچائیاں بھی ہیں جنھوں نے کبھی ہمارے ملک کو اپنے قدموں پر کھڑے ہونے نہ دیا۔ دارا اپنی ایمانداری کو کچل کے، بے ایمانی کا لبادہ پہن کے، الیکشن جیت جانے کے باوجود بھی خوش نہیں کیونکہ یہ سچ ہے کہ غلط ہتھکنڈوں سے سچی خوشی پانا ممکن نہیں۔"حویلی میں مکمل خاموشی تھی، صرف کلاک کی ٹک ٹک اور دارا کے دل کی دھڑکن سنائی دی رہی تھی۔۔۔ جب دارا کے ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے محسوس کیا کہ اسے اپنے جیتنے کی زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی۔"(۴۴)

دارا بنیادی طور پر بُرا انسان نہیں تھا۔ معاشرے نے اُسے بے راہ روی پر انتہائی حد تک مجبور کر دیا کہ اُسے اپنے بچاؤ کی کوئی راہ نظر نہ آئی۔ اور آخر کار وہ بھی ایسے بے ضمیر لوگوں میں شامل ہو گیا جن کی غیر انسانی حرکتوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ دارا نشے میں دُھت، ہوش و حواس سے بیگانہ ہوا جاتا تھا۔" دارا لڑکھڑا کر کُرسی سے اُٹھا اور دیوار پر مُعلق اپنے بڑوں کی تصویریں دیکھنے لگا، پھر مسکرایا۔ اب اس دیوار پر میری تصویر لگنے کا بھی جواز پیدا ہو رہا ہے۔ میں بھی تاریخ کا حصّہ بن جاؤں گا، تاریخ میں اچھے بُرے سب ہی ہوتے ہیں، مُجھے فرق نہیں پڑتا کہ میرا ذکر کس مد میں ہو گا؟"(۴۵)

یہاں ناول اختتام پذیر ہو جاتا ہے مگر انیس ناگی یہاں پر بہت سے سوال اُٹھا جاتے ہیں۔ غلط حربے اپنا کر الیکشن جیت کر اب دارا کی تصویر دیوار پر لگنے کا جواز پیدا ہو گیا تھا۔ انیس ناگی ہماری توجہ اس سمت دلاتے ہیں کہ تاریخ میں بہت سے نام ایسے موجود ہیں جنھوں نے شہرت و ناموری کی خاطر ہر طرح کے حربے کو اپنایا جیسا کہ دارا نے کیا۔ گویا تاریخ کا نہ مٹنے والا حصّہ بننا شرط اول ہے، اب ایسا کرنے کیلئے کون سی راہ اختیار کی جاتی ہے، اچھی یا بُری، اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ لوگ رُتبے اور عہدے کو سلام کرتے ہیں۔

انیس ناگی ایک اور پہلو پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ ہماری تاریخ میں اچھے بُرے سب لوگ ہی موجود ہیں، لوگوں کو تاریخ میں نام وری سے غرض رہی ہے، خواہ اُن کا نام اچھے معنوں میں لیا جائے یا بُرے، اس سے ہمارے معاشرے کو کوئی فرق نہیں پڑتا، جو کہ ایک المیہ اور لمحہ فکر یہ ہے کیونکہ ہر گزرتا لمحہ تاریخ کا ان مٹ نقش بنتا چلا

جاتا ہے۔ انیس ناگی کا یہ ناول پاکستانی معاشرے کی تاریخ کی بھیانک حقیقت کا نوحہ ہے۔ ناول کا سب سے اہم اور مضبوط کردار دارا دیانتداری میں اپنی مثال آپ تھا۔ اُسے اپنے ماتحت عملے کی طرف سے شدید ناپسندیدگی کا سامنا کرنا پڑا مگر اُس کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اُس کے خلاف انکوائری کی گئی مگر اُس نے افسران بالا کو منہ توڑ جواب دیا۔ ناول میں ایک بڑا المیہ شہر لوہ میں فالتو زمینوں پر ناجائز قبضے، متروکہ بنگلوں اور کوٹھیوں پر طاقت ور افراد کے مجرمانہ طریقے سے حق جمانے کا بیان ہوا ہے۔ ایسے بدعنوان لوگوں کے حلق کا کانٹا دارا کی ذات تھی جسے بہت جلد غلط الزامات لگا کر ملازمت سے نکال دیا گیا۔ تبھی دارا کا بالکل بدلا ہوا روپ سامنے آیا جب وہ کرپشن کا مقابلہ کرپٹ بن کر ، بدعنوانیوں کا مقابلہ بدعنوان بن کر ، طاقت ور لوگوں کا مقابلہ ، طاقت ور بن کر اور بُرائی کا مقابلہ بُرا بن کر کرتا ہے اور بالآخر مکمل طور پر معاشرے کے بدعنوانی کے قلعے کی ایک اینٹ بن جاتا ہے۔

انیس ناگی نے اس ناول میں قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی معاشرے اور لوگوں کی تاریخ کے الم بیان کیے ہیں کہ مہاجرین اور مقامی لوگوں نے اپنی مجبوری سے فائدہ اُٹھانے کی کن کن حیلوں سے کوششیں کیں۔ اس میں تاریخ میں ہونے والی بے حسی و خود غرضی پر کھُل کے اظہار خیال کیا گیا ہے یہ ناول ستر کی دہائی میں پاکستانی معاشرے کے زوال و انحطاط کو دکھاتا ہے کہ جب انسانی اقدار کی پامالی خطرناک حدوں کو چھونے لگی تھی۔ لوگوں کو اپنے مفاد کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ انیس ناگی نے پاکستان کی تاریخ سے اخذ شدہ حقائق اور لوگوں کی خود غرضی نیز اداروں کی بدعنوانی کو اس ناول میں کہانی کی صورت میں اس طرح ڈھالا ہے کہ جس سے تاریخ کی سفاکیاں بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہیں نیز انیس ناگی کے تاریخی شعور کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔

انیس ناگی نے اس ناول میں تاریخ کے سماجی و سیاسی حوالوں کو استعمال کیا۔ مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں پیش آنے والے مسائل، مہاجرین کے زمینوں اور مکانوں کے جھوٹے کلیم، مہاجرین کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں میں زمین کا لالچ، ۱۹۷۷ کا مارشل لاء، مارشل لاء میں جمہوریت کا قتل، اداروں کی کرپشن وبدعنوانیاں زمین کے حصول کیلئے ناجائز ہتھکنڈے، ستر کی دہائی میں پاکستانی معاشرے و پاکستانی نظام کا زوال، معاشرتی اقدار کی پامالی، انسانیت کی تذلیل، ایمانداری و نیک نیتی کا استحصال، پورے ملک میں کرپشن کا دور دورہ یہ سب تاریخی حوالے انیس ناگی کے ناول قلعہ میں حقائق و تخیل کی موزوں آمیزش کے ساتھ ملتے ہیں۔

انیس ناگی کا پاکستان کی تاریخ کے تاریک اور بگڑے ہوئے چہرے کو دکھانے کے پیچھے آج کی نسل کو اپنے ماضی سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُنہیں مستقبل کے حوالے سے خبردار کرنے کا مقصد بھی پیشِ نظر رہا تا کہ آنے والی نسل اپنے ماضی، اپنی تاریخ کی کوتاہیوں اور لغزشوں کو دہرانے کی بجائے اُن سے سبق حاصل کرے، اور اپنے مستقبل کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوششیں کرے۔ کیونکہ تاریخ نے جو روحانی اذیتیں انیس ناگی کو دیں۔ اس کا اظہار

انیس ناگی اپنی تحریروں میں بخوبی کرتے ہیں۔انیس ناگی ایسے ناول نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں جنہوں نے ہمیشہ نئی اور روشن خیال نسل کی نمائندگی کی ہے۔انیس ناگی نے اس ناول میں تاریخ کے مختلف حوالوں کا جائزہ تنقیدی نظر سے لیا ہے۔ انیس ناگی تاریخ کے بیان میں روایتی انداز کے حامل نہیں۔ نہ ہی وہ سنی سنائی باتوں اور خیالات کو اپنی تحریروں میں جگہ دیتے ہیں۔ انیس ناگی فرسودہ روایت کے خلاف مکمل طور پر بغاوت کا علم بلند کرتے ہیں جو اُن کے خیالات، انداز تحریر اور اسلوب میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ وہ تاریخی حقائق کو وراثت میں ملنے والی معلومات کے زاویوں سے نہ پرکھتے ہیں نہ انہیں روایت کے ترازو میں تولتے ہیں۔

انیس ناگی کے ہاں تاریخ کا بیان اُن کے تحقیقی و تنقیدی شعور کے متوازن امتزاج کے ساتھ ملتا ہے جہاں وہ حقائق کو پوری جانچ پڑتال کے بعد اپنے خاص انداز میں ایسے بیان کرتے ہیں کہ اُن کا تاریخی شعور کھُل کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ انیس ناگی تاریخ کے بیان میں نہ کسی کے متاثر نظر آتے ہیں نہ کسی کی تقلید کرتے ہیں۔ تاریخ کے حوالے سے انیس ناگی کے نظریات نہ صرف گزشتہ عہد بلکہ موجودہ عہد کا تجزیہ بھی کرتے جاتے ہیں۔ انیس ناگی کے تاریخی نظریات کو جامد نہیں کہا جاسکتا ان کے ہاں حقائق کی جانچ پڑتال کا عکس ان کے ناولوں سے جھلکتا ہے۔ انیس ناگی تاریخ کے تمام حوالوں میں سچائی کو مقدم رکھتے ہیں جیسا کہ اس ناول میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان تمام حوالوں سے دیکھا جائے تو انیس ناگی کا تاریخی شعور وضاحت سے سامنے آتا ہے جسے تنقیدی تاریخی شعور کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ایک اچھا ادیب وہی ہے جو حقائق کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرنے کی بجائے اُن کی سچائی کے معیار کو تنقید کے ترازو میں تول کر دیکھتا ہے اور یہی خاصیت ہمیں انیس ناگی کے ہاں نظر آتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،(لاہور:جمالیات،۲۰۰۵ء)،ص۸۔

۲۔ ایضاً،ص۸۔

۳۔ ایضاً،ص۱۶۔

۴۔ زاہد مسعود(مُرتب)،انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار (لاہور:حسن پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء)،ص۰۹۔

۵۔ ایضاً،ص۱۰۔

۶۔ زاہد مسعود(مُرتب)،انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار،ص۱۰۔

۷۔ عنایت الٰہی ملک،پاکستان میں انتظامیہ کا زوال(لاہور:مشعل،س ن)،ص۱۰۵۔

۸۔ ایضاً،ص۹۔

۹۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۷۱۔

۱۰۔ عنایت الٰہی ملک،پاکستان میں انتظامیہ کا زوال،ص۱۲۲۔

۱۱۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۸۵،۸۴۔

۱۲۔ ایضاً،ص۱۷۔

۱۳۔ انیس ناگی،ایک ادھوری سر گزشت(لاہور:جمالیات،۲۰۰۸ء)،ص۶۵۔

۱۴۔ ایضاً،ص۶۶۔

۱۵۔ ایضاً،ص۶۶۔

۱۶۔ ایضاً،ص۶۹۔

۱۷۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۸۵۔

۱۸۔ عنایت الٰہی ملک،پاکستان میں انتظامیہ کا زوال،ص۱۲۱۔

۱۹۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۸۵۔

۲۰۔ انیس ناگی،ایک ادھوری سر گزشت،ص۷۷۔

۲۱۔ ایضاً،ص۷۸۔

۲۲۔ Evacuee Trust Property Board[online]. last modified March 10, 2018.

https://en.m.wikipedia.org/wiki/Evacuee-Trust-Property-Board.

۲۳۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول ایضاً)،ص۶۸،۶۹۔

۲۴۔ ایضاً،ص۸۵۔

۲۵۔ ایضاً،ص۸۶،۸۷۔

۲۶۔ عنایت الٰہی ملک،پاکستان میں انتظامیہ کا زوال،ص۱۰۹۔

۲۷۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۸۷۔

۲۸۔ انیس ناگی،ایک ادھوری سر گزشت،ص۸۳۔

۲۹۔ ایضاً،ص۸۵۔

۳۰۔ ایضاً،ص۸۶۔

۳۱۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۱۰۷۔

۳۲۔ ایضاً،ص۱۱۰۔

۳۳۔ ایضاً،ص۱۱۱۔

۳۴۔ ایضاً،ص۱۱۹۔

۳۵۔ ایضاً،ص۱۲۰۔

۳۶۔ ایضاً،ص۱۴۰۔

۳۷۔ ایضاً،ص۱۸۷۔

۳۸۔ عنایت الٰہی ملک،پاکستان میں انتظامیہ کا زوال،ص۱۲۰۔

۳۹۔ زاہد مسعود(مرتب)،انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار،ص۱۵۔

۴۰۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۱۸۹۔

۴۱۔ ایضاً،ص۱۸۷۔

۴۲۔ ایضاً،ص۱۹۷۔

۴۳۔ ایضاً،ص۲۱۱۔

۴۴۔ ایضاً،ص۲۱۱۔

۴۵۔ ایضاً،ص۲۱۳۔

باب چہارم

چوہوں کی کہانی: انیس ناگی کی تاریخی جہات کی روشنی میں

چوہوں کی کہانی انیس ناگی کا آٹھواں ناول ہے جو ۱۹۹۵ء میں سارنگ پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے صفحات کی کل تعداد ۱۰۰ ہے جبکہ اس میں ۱۳ مختصر ابواب شامل ہیں۔اس ناول میں انیس ناگی کے تاریخی تصورات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے، "چوہوں کی کہانی" میں بیان کردہ تاریخی حوالوں کا جائزہ لیا جائے گا تاکہ انیس ناگی کے تاریخی شعور کو سمجھا جاسکے۔

تاریخ کے حوالے

غیر ملکی ادب کے مطالعے کے دوران انیس ناگی کو دوستوفسکی، سارتر، کامیو، کافکا جیسے بڑے ادیبوں کے فن و فکر نے بہت مُتاثر کیا۔ انیس ناگی نے یہ ناول چوہوں کی کہانی کامیو کے ناول سسیفس کے نثری ترجمہ "Taun" سے مُتاثر ہو کر لکھا۔ چوہوں کی کہانی کے حوالے سے ڈاکٹر شاہین مفتی نے اپنی تحریر میں انیس ناگی کے خیالات قلمبند کیے ہیں:

> "کامیو کے ناول "طاعون" اور میرے ناول "چوہوں کی کہانی" میں چوہوں کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں۔۔۔میں نے جس طاعون کا ذکر کیا ہے وہ اصلی ہے، چند برس ہوئے ہندوستان کے شہر سورت میں طاعون کی وبا پھیلی تو وہاں سے لوگوں کا انخلاء شروع ہو گیا، ادھر پاکستان میں انتظامیہ بھی حرکت میں آگئی اور دھڑا دھڑ دونوں ملکوں نے خبریں لگانی شروع کر دیں۔"(۱)

تاریخ میں ہندوستان کے شہر سورت میں طاعون پھیلنے کے حوالے سے دونوں ملکوں کے اعلیٰ طبقہ کی جو ذہنیت اور سیاست سامنے آئی، اسے انیس ناگی نے بہت خوبی سے اس ناول میں بیان کیا ہے کہ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ طاعون نے ہمارے جسموں سے زیادہ ہماری روح، ہمارے ذہنوں کو بیمار بنایا اور ہماری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ اس ناول میں یہ دکھایا گیا ہے کہ دوسرے درجے کا میونسپل افسر حکومتی اجازت نامے کے بغیر ہندوستان کے شہر سورت جا پہنچتا ہے جہاں طاعون کی وبا نے زور پکڑ لیا ہے۔ سورت میں اُسے پولیس اپنی تحویل میں لے لیتی ہے اور اُس کے جسم میں طاعون کے جراثیم داخل کرنے کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے تاکہ پاکستان کو بدنام کیا جاسکے مگر وہ افسر بچ کر پاکستان آجاتا ہے۔ مگر یہاں اُسے اپنوں کی طرف سے مزید ذہنی اذیت اور تذلیل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انیس ناگی کے فن کی خوبی یہی ہے کہ اُن کے پیشِ نظر سچائی اور حقائق کی تلاش اور اس کا اظہار ہوتا

ہے، خواہ اس احتساب کی زد میں اپنے آئیں یا غیر، انیس ناگی کے قدم نہیں ڈگمگاتے۔ ناول کا آغاز لاہور کے منظر نامے سے ہوتا ہے۔ انیس ناگی ہمیں لاہور کی غلاظت، گندگی، ٹریفک کے دھوئیں اور گردوغبار سے اٹی فضا کی تصویر دکھاتے ہیں۔ "سرمایہ داروں اور تاجروں نے اس شہر کو تاریخ سے چھین کر ایک کاروباری منڈی میں بدل دیا ہے۔ اس لیے یہ بے حد غلیظ شہر ہے۔"(۲) لاہور میں ٹریفک کے شور اور دھوئیں نے اس کی ساری خوبصورتی چھین لی ہے۔ ناول میں ایک اور مقام پر لاہور کی مدقوق صورتحال کا بیان یوں کیا گیا ہے۔ "حال ہی میں یونیسکو کی ایک رپورٹ میں اسے دنیا کا سب سے غلیظ شہر قرار دیا گیا ہے۔ سارا دن رکشوں کے سیاہ روسائلنسر چیختے ہیں اور دھواں اگلتے ہیں اور شہری اس دھوئیں کو نگلتے ہیں۔"(۳) میونسپل افسر، جو ناول کا مرکزی کردار ہے، اب ریٹائرڈ اور بوڑھا ہو چکا ہے، وہ اندرون لاہور میں رہائش پذیر ہے۔ پرانے لاہور کی گلیوں، محلوں میں رہتی بستی زندگی کی تصویر کشی ناول میں بہت خوبی سے کی گئی ہے۔ اندرون لاہور میں گندگی و غلاظت پھیلی رہتی ہے۔ وہ آس پاس کے محلوں میں ہر طرف موٹے موٹے چوہوں کو دوڑتے بھاگتے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ لاہور کی گندگی اُسے ہندوستانی شہر سورت کی غلاظت کی یاد دلا کر ہولاتی ہے کہ کہیں لاہور میں بھی سورت کی طرح وبا نہ پھیل جائے اور لوگ لقمۂ اجل بننے لگیں۔۔۔

انیس ناگی ناول میں بڑی جسامت کے چوہوں کا ذکر کرتے ہیں، جن کی تعداد اندرون لاہور میں بڑھتی جارہی ہے۔ "اندرونِ شہر کے بارے میں شبہ ہے کہ وہاں بیماری کے آثار ہیں، گلیوں اور محلّوں میں چوہوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔۔۔ اکبری منڈی میں کتوں کے سائز کے چوہے دندناتے پھر رہے ہیں۔"(۴) سورت میں طاعون کے ذکر کے ساتھ ہی ناول انیس ناگی کی خاص طرز کے مُطابق، فلیش بیک میں سفر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ میونسپل افسر حال سے ماضی میں جا نکلتا ہے۔ جوانی میں اُسے سیاحت کا بے حد شوق تھا اور اسی سیاحت کے شوق کے سبب وہ پہلا سفر کامیو کے ناول میں بیان کردہ پلیگ زدہ شہر "اوراں" کا کرتا ہے۔ مگر اوراں کو دیکھ کر اُسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ "یہ شہر دیکھ کر اُسے احساس ہوا کہ کامیو نے بہت سی باتیں زیبِ داستان کے طور پر بیان کی ہیں۔ جو حقیقی طور پر وہاں موجود نہیں ہیں۔"(۵)

جبکہ دوسرا سفر وہ بحری جہاز کے ذریعے میسور اور گوا کا اختیار کرتا ہے۔ دوران سفر اُس کی ملاقات ایک ہندوستانی جوڑے مسٹر اینڈ مسز چیٹر جی سے ہوتی ہے۔ میونسپل افسر اپنا تعارف ایم۔ اے ہسٹری کے طالب علم کی حیثیت سے کرواتا ہے تاکہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکے۔ یہاں انیس ناگی نے پاکستان اور ہندوستان کے لوگوں کی ایک دوسرے کے حوالے سے سوچ اور جذبات کا مکالموں کے ذریعے خوب اعادہ کیا ہے۔ میونسپل افسر، ہندوستانی جوڑے سے اپنا تعارف کرواتا ہے: "دونوں کو جب معلوم ہوا کہ میں ہمسایہ ملک سے ہوں تو دونوں کے تیور کچھ دیر کیلئے بدلے۔ "چیٹر جی" اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے ایک دم

کہا۔"بھئی تم لوگ ہم سے کیوں لڑتے ہو"میں برجستہ کہا۔"لڑتے تو آپ ہیں۔"(۶)انیس ناگی نے دونوں ملکوں کے تاریخی چپقلش اور بُعد کو الفاظ کے ذریعے بہت خوبی سے واضح کیا ہے۔ اتنے برس گزر جانے کے باوجود بھی دونوں ملکوں کے ذہنی و قلبی فاصلے مٹ نہ سکے۔ میونسپل افسر، جسے محض تجسس کی بنا ہندوستان کے بارے میں بہت کچھ جاننے کی خواہش ہے، کے مختلف سوالات کے جواب میں، مسز چیٹر جی کہتی ہیں:"مسٹر ہماری اور تمھاری تاریخ مختلف ہے، اس لیے میں جو بیان کروں گی وہ تمھارے لیے قابل قبول ہو گا؟"، "جی میں آپ کی ہر بات سنوں گا۔مادام ہماری تاریخ ایک تھی، پھر ایک سے دو تاریخیں بن گئیں۔"(۷)انیس ناگی یہاں تاریخ کا وہ پہلو اُجاگر کرتے ہیں جو اٹل ہے۔ برصغیر پاک وہند میں بسنے والی دو بڑی قوموں، ہندو اور مسلم، کی تاریخ ایک تھی۔ محبت اور بھائی چارہ اپنی مثال آپ تھا۔ انگریز کی آمد نے دونوں کے دلوں میں ایک نہ طے پانے والا فاصلہ قائم کر دیا اور جن قوموں کی تاریخ ایک تھی وہ دو حصوں میں بٹ کے رہ گئی۔

دوران سفر میونسپل افسر اچانک ہندوستان کے شہر سورت کی بندر گاہ پر اُترنے کا فیصلہ کرتا ہے، اس بات سے انجان کہ وہاں طاعون کی وبا پھیل رہی ہے اور شہر سے باہر جانے کے راستے تیزی سے بند کیے جا رہے ہیں۔ جو سیاح سورت میں داخل ہو چکے، اب اُن کی واپسی قطعی ناممکن ہے۔ اس حقیقت سے بے خبر وہ سورت اُتر جاتا ہے۔ جہاز سے اتر کر امیگریشن کاونٹر پر اُسے ایک بار پھر، پاکستانی ہونے کے سبب، شدید ذلت و نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوران تلاشی اُس کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز سلوک کر کے اُسے باور کرایا جاتا ہے کہ چونکہ وہ پاکستانی ہے لہٰذا اس ملک اور اس کے لوگوں کے دلوں میں اس کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے، بلکہ نفرت موجود ہے۔

امیگریشن افسر اُس کے سامان میں سے اُس کا کیمرہ ضبط کر لیتا ہے۔"تم یہ کیمرہ شہر کے اندر نہیں لے جاسکتے۔"، "کیوں؟ میں نے بھی تیزی سے جواب دیا۔"تم ہماری تصاویر لینا چاہتے ہو؟"، "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"۔"ٹھیک ہے تمھارا کیمرہ میں ضبط کرتا ہوں۔"(۸)ان مکالموں کے ذریعے ہمیں انیس ناگی کے تاریخی شعور کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات میں کشمکش کا آج دُنیا کے سامنے ہے۔ یہ کشمکش ایک تاریخی پس منظر کی حامل ہے۔ اسی لیے آج بھی دونوں ممالک اُسی تاریخی پس منظر کو یاد رکھے ہوئے ہیں اور چاہ کر بھی بھلا نہیں پاتے۔

ہندوستانی آفیسر، سیاحت کی غرض سے آئے پاکستانی سیاح کو اُسی مخصوص تاریخی پس منظر کی بنیاد پر اپنی نفرت اور تعصب کا نشانہ بناتا ہے۔ اُس کی نفرت اُس سیاح سے محض اُس کے پاکستانی ہونے کی وجہ سے ہے۔ میونسپل افسر کا کیمرہ اس لیے ضبط کر لیا جاتا ہے کہ ہندوستانی افسر کو شک ہے کہ یہ سیاح چونکہ پاکستانی ہے، اس لیے ہماری تصاویر بنا کر اُنہیں ہمارے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ انیس ناگی نے ہندوستانی افسر کی سوچ کو بطور علامت، دونوں

ملکوں کے درمیان کے تاریخی فاصلے اور دوری کی نشاندہی کے لیے استعمال کیا ہے کہ دونوں قومیں آج بھی ایک دوسرے کے ہر عمل کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ امیگریشن افسر کے انداز میں نفرت اور کینہ کی وجہ یہی ہے کہ سیاح پاکستانی ہے اور پاکستان سے یقیناً غلط مقاصد کے تحت ہندوستان میں داخل ہُوا ہوگا۔ اس متعصبانہ سوچ کی تصدیق ایک مسلمان انسپکٹر امجد کر دیتا ہے:"امجد صاحب آپ لوگ سیاحوں کے کیمرے کیوں چھین لیتے ہیں؟"،"اس لیے کہ تم مسلمان ہو اور ہمسایہ ملک سے آئے ہو۔"(۹) مسلمان انسپکٹر، امجد واضح طور پر، میونسپل افسر کو یہ باور کرا دیتا ہے کہ اُس کے ساتھ اس نازیبا اور متعصبانہ سلوک کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ ایک ایسے ملک سے آیا ہے، جو اُن کے ملک کا دشمن ہے۔

انیس ناگی نے پوری سچائی کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں زمینی قربت ہونے کے باوجود ازلی رقابت موجود ہے جسے اتنے برس گزر جانے کے باوجود ہم ختم نہ کر سکے، ہماری تاریخ اس کی گواہ ہے۔ سورت شہر میں ایک عجیب طرح کی افراتفری اور اضطراب کی کیفیت چھائی ہوئی ہے، پورے شہر پر ایک خوف کا سایہ لہرارہا ہے۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ میونسپل افسر، انسپکٹر امجد سے سورت شہر کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا ہے، تبھی اُسے صورتحال کی سنگینی کا احساس ہوتا ہے:"سورت شہر کیسا ہے؟"۔"آپ یہاں سے جلدی نکل جائیں۔"،"کیوں؟"۔۔۔۔"آپ غلط موسم میں یہاں آئے ہیں۔ یہاں وبا پھیل رہی ہے۔"(۱۰)

انسپکٹر امجد کی باتیں، اُسے خطرے کا احساس دلاتی ہیں۔ شہر میں سیاحت کی غرض سے آئے بہت سے سیاحوں کی تشویش ناک باتوں سے اُس کا خوف مزید بڑھ جاتا ہے جب اُسے پتہ چلتا ہے کہ شہر شدید وبا کی لپیٹ میں ہے اور شہر سے باہر جانے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ تبھی لوگ انتظامیہ کو بُری طرح کوس رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے جنھوں نے باہر سے آئے لوگوں کے واپس جانے کے تمام راستے مسدود کر دیئے تھے۔ میونسپل افسر اپنے سورت میں رکنے کے فیصلے پر پچھتا رہا تھا۔ جس شہر کو وہ طلسماتی و رومانوی سمجھ کر آیا تھا، وہ غلاظت سے اٹا ہُوا تھا۔ سورت کو دیکھ کے اُسے شدید مایوسی ہوئی، اس کا سیاحت کا سارا رومان جاتا رہا۔"اگر سین سورت کی بجائے صورت پڑھا جائے تو پھر سورت ایک بدصورت شہر ہے۔ میرے ذہن میں اس کے بارے میں جو طلسم اور رومان تھا وہ چند گھنٹوں کی سیاحت میں پسپا ہو گیا تھا۔"(۱۱) انیس ناگی نے ۱۹۹۴ء میں بھارتی شہر سورت کی گندگی و غلاظت سے اٹی حالت کی بھرپور تصویر کشی کی ہے:

> "شہر کے اندر ہی جا بجا کچی آبادیاں ہیں۔۔۔ چھوٹی چھوٹی گلیاں، پانی کے جوہڑ، گھروں کے کچرے کے انبار جن پر دن کے وقت چلتی ٹریفک کے دوران چوہے قطاروں میں اپنی خوراک تلاش کرتے تھے۔ سورت پہنچ کر دوسرے دن شہر میں سیر کرتے ہوئے جب میں نے ان چوہوں کو دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔"(۱۲)

انیس ناگی نے سورت شہر کی گندگی اور غلاظت کا جو حال بیان کیا ہے وہ شہر میں طاعون کے پھیلنے کا بنیادی سبب بنا۔ جس وقت کے سورت شہر کا انیس ناگی نے ناول میں تذکرہ کیا ہے، طاعون کے حملے کے بعد ہندوستان کی حکومت نے سورت پر خصوصی توجہ مرکوز کرتے ہوئے اُس کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ روچکارائے کے مطابق:

"Within 18 months of Surat being hit by a deadly plague in1994, the city managed to transform itself from a dirty, garbage strewn mess into one of the cleanest city in the county." (۱۳)

سورت شہر کی گلیوں میں اُچھلتے کودتے، بے فکری سے دوڑتے چوہے نیز شہر میں پھیلی گندگی و غلاظت کے ڈھیر سب لوگوں کیلیے موت کا پیغام لائے۔ انیس ناگی نے وبا پھیلنے کا سبب شہر کی ابتر حالت کو قرار دیتے ہوئے ۱۹۹۴ میں سورت کا نقشہ وضاحت سے کھینچا ہے۔ شہر کی گندگی و غلاظت کے ساتھ ساتھ طوفانی بارشوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور جراثیموں اور بیماریوں کا مُنہ کھول دیا۔ ایسے میں شہر کی انتظامیہ کی لاپرواہی دیدنی تھی کہ اُنہوں نے شہر کی ابتر حالت کو سُدھانے میں کسی عجلت سے کام نہ لیا اور طاعون نے زور پکڑ لیا۔ سورت کی انتظامیہ نے مجرمانہ غفلت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ نیویارک ٹائمز کی رپورٹ کے مُطابق:

"Large scale flooding occurred due to the heavy rain and clogged sewers. This caused dead animals to remain out in the open, which added to the already unhygienic conditions." (۱۴)

طاعون کی وبا کے تیزی سے پھیلنے کے سبب ہسپتالوں میں مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ یہاں ہماری ملاقات ناول کے ایک اور مرکزی اور انسانیت دوست کردار سینئر ڈاکٹر شنکر سے ہوتی ہے جو سورت ہسپتال میں تعینات ہے۔ وہ ہسپتال میں ایک جیسی علامات کے مریضوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر خطرے کو بھانپ لیتا ہے۔ اُسے احساس ہو جاتا ہے کہ وبا پھیل رہی ہے۔ "سورت ہسپتال کے کیلٹی وارڈ کے باہر لوگ فرش پر، فٹ پاتھ پر چادریں بچھائے کراہ رہے تھے۔ کوئی خون کی قے کر رہا تھا۔ "(۱۵) ڈاکٹر شنکر ساری صورتحال دیکھ رہا تھا۔ اس کا شک یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ یہ ہو نہ ہو طاعون ہی ہے۔ تبھی ڈاکٹر شنکر کیلٹی آفیسر سے پوچھتا ہے:

"صبح سے اس قسم کے کتنے مریض آئے ہیں؟"، "سر بیس کے قریب آچکے ہیں۔"، "ان کے symptoms کیا ہیں؟"، "سر میں درد، بخار، ہذیان، پیاس، سانس کی کمی، کسی کی بغلوں میں گلٹیاں اور کسی کی جانگھ میں"۔ "ڈاکٹر شنکر خاموش رہا پھر بولا "تشخیص کیا ہے؟" "وائرس انفکشن لگتی ہے۔"، "سلی، ڈاکٹر شنکر نے اضطراب سے کہا۔ "وباء شروع ہو چکی ہے۔ "(۱۶)

یہاں انیس ناگی المناک حقیقت سے قاری کو آگاہ کرتے ہیں کہ ۱۹۹۴ء میں بھارتی شہر سورت میں پھیلنے والی

جان لیوا وبا طاعون کو، سورت کے ہسپتالوں کا عملہ بروقت شناخت ہی نہ کر پایا تھا، جو وباء کے پھیلنے کا بڑا سبب بنا۔ جس بیماری کو ڈاکٹر اور دیگر عملہ وائرس انفکشن سمجھ رہا تھا۔ وہ جان لیوا وباء تھی۔ انیس ناگی نے انتظامیہ کی غفلت پر کڑا طنز کیا ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی سے کوتیاسیوارااماکرشنن کے مطابق "گجرات طاعون کمیٹی" نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا:

"Not plague at all but lower respiratory tract infection. No bubonic plague definitively proved at Surat and no infections secondary cases either." (۱۷)

سورت میں طاعون کی بروقت تشخیص نہ ہونے کے باعث "کالی موت" کے جراثیموں نے اپنے پنجے گاڑنے شروع کر دیئے۔ ڈاکٹروں اور دیگر عملے کے غیر ذمہ دارانہ رویے کے باعث خطرناک اور جان لیوا بیماری کو محض معمولی وائرس انفکشن کہہ کے ٹال دیا گیا۔ انتظامیہ نے اپنی نااہلی کے باعث پورے شہر کو داؤ پر لگا دیا۔ انیس ناگی سورت شہر میں ہونے والے تاریخی المیے کو باطنی و خارجی دونوں حوالوں سے بہت خوبی سے بیان کرتے ہیں۔ جب کچھ لوگوں کی کوتاہی نے بہت سے لوگوں کے لیے موت کا پروانہ جاری کر دیا۔ ناول میں تاریخ کے اوراق ہمارے سامنے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ انیس ناگی نے سورت میں طاعون کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ابتری اور افراتفری کی صورتحال کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ماضی کی اُس جان کُنی کی کیفیت کو ہم محسوس کرتے ہوئے تاریخ سے جڑتے چلے جاتے ہیں ۔اُس وقت سورت کے ڈاکٹروں سے وہ صورتحال اور مریضوں کی حالت کنٹرول نہ ہو سکی جس نے لوگوں کو شدید مشتعل کر دیا اور انہوں نے ڈاکٹروں کی املاک پر حملے شروع کر دیئے۔ ڈاکٹر اور دیگر سٹاف بیماری اور لوگوں کے اشتعال کے ڈر سے بھاگ نکلے۔

سورت سے بڑی تعداد میں لوگوں نے بھارت کی دیگر ریاستوں کی طرف نقل مکانی شروع کر دی۔ انیس ناگی، ڈاکٹر شنکر کے ذریعے باریکی سے صورتحال کا جائزہ پیش کرتے ہیں: "پانچ سو مریض ہسپتال میں آ گئے ہیں۔ کہاں مناسب اقدام کیے جا رہے ہیں؟ ہسپتال میں دوائیاں ختم ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر چھوت کی وجہ سے بھاگ گئے ہیں۔"(۱۸) اخبارات میں لوگوں کی نقل مکانی کی خبریں ہندوستان کے ساتھ ساتھ پوری دُنیا میں پھیلنے لگیں۔ یہ نقل مکانی صرف لوگوں کی نہیں تھی، اُن کے ساتھ طاعون کے جراثیم بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں منتقل ہو رہے تھے۔ دیگر علاقوں کے طاعون کی زد میں آنے سے انتشار اور اشتعال بڑھتا جا رہا تھا۔ اس تکلیف دہ صورتحال میں عوام کا سہارا ہسپتال اور ڈاکٹر تھے، مگر ڈاکٹر بھی اپنی جان بچا کر بھاگ رہے تھے کہ کہیں وہ بھی اس وبا کا شکار نہ بن جائیں۔ عجب قیامت کا سماں تھا۔ کیا ڈاکٹر، کیا مریض، سب کے پیشِ نظر صرف اور صرف اپنا بچاؤ تھا۔ ڈاکٹر، جو انسانوں کے لیے مسیحا کا کام کرتے ہیں، اُن کے فرار نے صورتحال کو مزید بگاڑ دیا تھا۔ "طاعون کے خونی پنجے لمبے ہو گئے۔ کلکتہ بھی زد میں آ گیا۔ سورت میں لوگوں نے ڈاکٹروں کی املاک پر حملہ کر دیا۔ دو لاکھ لوگ شہر چھوڑ کر چلے

گئے۔"(۱۹)انیس ناگی، حقائق کو بدلے بغیر، ہمارے سامنے تاریخ کو سچائی کے ساتھ سامنے لاتے ہیں۔ طاعون کی وبا نے بھارتی ریاست گجرات کے شہر سورت میں زور پکڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف اپنے پنجے گاڑنے شروع کر دیئے۔ حکومت اور اعلیٰ حکام کی نااہلی کے سبب لوگوں کو علاج اور تشخیص کی خاطر خواہ سہولیات میسر نہ آسکیں جس کے باعث اُنہوں نے پریشانی اور افراتفری میں دوسری ریاستوں میں نقل مکانی شروع کر دی۔ جو بیماری پہلے چند علاقوں تک محدود تھی، وہ طاعون کے جراثیموں کے ساتھ نقل مکانی کرنے والے لوگوں کے ذریعے ہندوستان کی اور ریاستوں اور شہروں میں پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ HDGC کی رپورٹ کے مطابق:

"By morning of september22,1994, exodus of people from the city had begun. Within two days, more than 300,000 residents deserted the city, which also included several doctors and members of paramedical staff." (۲۰)

لوگوں کو سورت میں بہتر علاج اور ادویات کی فراہمی نہیں کی جارہی تھی۔ اموات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ طاعون اور یقینی موت کے خوف نے لوگوں میں شدید انتشار پیدا کر دیا تھا۔ لوگ اپنے قدموں پہ چل کے ہسپتال آتے۔ تیز بخار اور خون کی اُلٹیاں کرتے ہوئے لوگوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ بیشتر مریض ہسپتال پہنچتے، ڈاکٹر کو دکھانے کی نوبت نہ آتی اور مریض دم توڑ دیتے۔ موت نے انتہائی بے یقینی کی فضا پیدا کر دی تھی۔ نیویارک ٹائمز میں ڈاکٹر پرویز شیخ بیان کرتے ہیں:

"Patients come walking in and within minutes, they collapse and die."
(۲۱)

اسی خوف کے باعث لوگ تیزی سے سورت شہر کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ انیس ناگی نے ۱۹۹۴ میں ہندوستان پر ٹوٹنے والی تاریخی اُفتاد کا احوال حقائق کے التزام کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ اُس دور کی تمام تر بے رحمی و سفاکی پوری سچائی کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ہر طرف موت رقصاں تھی۔ انیس ناگی نے ناول میں اس پہلو کو اُجاگر کیا ہے کہ طاعون کی مصیبت نے پورے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ ریلوے اسٹیشن و بس اسٹیشن، ہر جگہ لوگوں کا جم غفیر تھا جو ہر صورت میں اپنی اور اپنے خاندان کی جان بچانے کیلئے مختلف ذرائع آمد و رفت تک رسائی کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ سورت سے نکلا جاسکے۔ انیس ناگی نے جیسا کہ ناول میں بیان کیا کہ ایک بڑے پیمانے پر سورت شہر سے تقریباً دو لاکھ لوگوں نے ہجرت کی۔ نیویارک ٹائمز کی خبر سے انیس ناگی کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے:

"Witnesses in Surat described huge crowds at the city's main railroad

and bus stations and on roads leading out of the city. Judging from ticket sales. Officials said as many as 200,000 people may have left over the last two days." (۲۲)

اتنے بڑے پیمانے پر نقل مکانی کا نقصان یہ ہُوا کہ طاعون کے جراثیم ہندوستان کی دیگر ریاستوں میں مُنتقل ہو گئے اور طاعون کی وبا کی تیزی میں اور شدت آگئی۔ حکومت کیلئے صورتحال کو کنٹرول کرنا دشوار ہوتا جارہا تھا۔ لوگ تیزی سے دوسری جگہوں پر نقل مکانی کر کے اپنی جانیں بچانا چاہتے تھے مگر وبا اور بیماری خود اُن کے اپنے اندر تھی۔ جس وہ چھٹکارا پانے میں ناکام تھے۔ اُن کے سامنے دو ہی راستے تھے، فرار یا موت۔ لوگوں میں یہ احساس ختم ہو چکا تھا کہ وہ باقی لوگوں کی زندگی کا احساس کریں۔ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو وبا کا شکار نہ بنائیں۔ افراتفری کی اس صورتحال میں کس کو احساس تھا کہ کوئی بچتا ہے یا مرتا ہے، سب کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ جس کی بنا پر ہندوستان کی بہت سی ریاستوں کے لوگ بھی طاعون کی زد میں آگئے۔ دائرۃ المعارف کے مطابق:

"The 1994 plague in India was an outbreak of bubonic and pneumonic plague in south-central and southwestern India from 26 August to 18 October 1994.693 suspected cases and 56 deaths were reported from the five affected Indian states as well as the union Territory of New Delhi. These cases were from Maharashtra (488 cases), Gujarat (77 cases), Karnataka (46 cases), Uttar Pradesh (10 cases), Madhya Pradesh (4 cases) and New Delhi (68 cases). (۲۳)

ہندوستان کے شہر سورت میں قیامت اور افراتفری کا سماں تھا۔ بھارت کی مختلف ریاستوں سے لوگوں کے طاعون میں مبتلا ہونے کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ وبا تیزی سے پھیل رہی تھی۔ تحقیقات کی روشنی میں مختلف ریاستوں میں تقریباً 693 افراد طاعون میں مبتلا ہوئے اور 56 افراد موت کے گھاٹ اتر گئے۔ انیس ناگی نے ان تمام دردناک کیفیات اور تاریخی سانحے کا بیان ناول میں کرداروں کے ذریعے بخوبی کیا ہے۔ خارجی دنیا کی المناک حقیقتوں کے حوالے سے حساسیت، انیس ناگی کو بیان کا حوصلہ اور اُن کے فن کو نکھار بخشتی ہے۔ انیس ناگی مروجہ روش سے ہٹ کے چلنے والے بلند حوصلہ ادیبوں میں سے ایک ہیں اور دنیائے ادب میں اپنے بے باک انداز اور علامتی پیرایہ اظہار کی وجہ سے ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔

اس ناول میں انیس ناگی نے طاعون کو حقیقی کے ساتھ ساتھ علامتی معنی بھی بخشے ہیں۔ طاعون کا لفظ انیس ناگی کے ہاں معاشرے کے بیمار ذہنیت کے افراد کی بیمار سوچ کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ جیسے طاعون کی وبا نے سورت

شہر کے باسیوں کو اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا، وہیں انیس ناگی ہمیں ہندوستانی معاشرے کے ایسے بااثر افراد سے ملواتے ہیں۔ جن کے اندر طاعون نے اپنے خونی پنجے گاڑ کر اُن کے باطن کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ سورت کے حکومتی ارکان اور انتظامی عملہ پاکستان سے آئے سیاح، میونسپل افسر کو اُس کے ہوٹل سے آدھی رات کو حراست میں لے لیتا ہے اور اُس پر غیر انسانی تشدد کیا جاتا ہے۔ وہ شدید خوف کے عالم میں سوچتا ہے: ”ایک غیر جگہ کے خوف سے ایک دم مجھے احساس ہوا کہ شاید میں اب یہاں سے نہ نکل سکوں، نہ جانے مجھ پر کیا کیا الزامات لگائے جائیں اور مجھ سے پوری ایک تاریخ کا بدلہ لیا جائے۔“(۲۴)

ان جملوں سے انیس ناگی کے تاریخی شعور کی بھرپور انداز میں عکاسی ہوتی ہے۔ میونسپل افسر کے خیالات انیس ناگی کے تاریخی شعور کے ترجمان بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ میونسپل افسر اس خوف میں مبتلا ہے کہ میں ایک غیر ملک میں موجود ہوں اور ملک بھی وہ جس کے ساتھ برسوں سے عداوت اور تاریخی کشمکش و دُشمنی چلی آرہی ہے۔ اسی بنا پہ اُس کا خوف اپنی جگہ پر جائز معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ میں جو کچھ ہوا، اُس کا بدلہ پاکستانی ہونے کے ناطے ضرور اُس سے لیا جائے گا۔ اُس کے ساتھ کوئی لحاظ نہیں برتا جائے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی پاکستان کا کوئی باسی ہندوستان میں یا ہندوستان کا کوئی باسی پاکستان میں قیدی بنا کے رکھا گیا، اُس نے اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ تاریخ کا تاوان بھی ادا کیا ہے۔ میونسپل افسر خوف زدہ ہے کہ اُس پر ناکردہ جرائم کے الزامات لگائے جائیں گے۔ کچھ نہ کرتے ہوئے بھی اُسے مجرم ٹھہرایا جائے گا۔ اور اس سے تاریخ کا بدلہ لینے کی پوری پوری کوشش کی جائے گی۔

میونسپل افسر کے بطور پاکستانی، ہندوستانی حکومت اور انتظامیہ کے حوالے سے تمام خدشات دُرست ثابت ہوئے۔ جو وہ سوچ رہا تھا، سورت کی انتظامیہ اُس کے ساتھ اُس سے بھی بدتر سلوک کرنے پر تُلی بیٹھی تھی۔ اُس سے تاریخ کا بدلہ لیا جارہا تھا۔ سورت کی حکومت اُس پر مُسلسل تشدد کر کے اُس سے یہ اقرار کروانا چاہتی تھی کہ وہ یہ تسلیم کرے کہ وہ اپنے ساتھ طاعون کے جراثیم پاکستان سے اس غرض سے لایا ہے تاکہ پاکستان، ہندوستان سے تاریخ کا بدلہ چُکا سکے۔ جبکہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ میونسپل افسر صرف سیاحت کی غرض سے سورت آیا تھا۔ اُسے نئی نئی جگہیں دیکھنے کا شوق مہنگا پڑ گیا تھا۔ اس کو ایک انتہائی غلیظ اور بدبودار علیحدگی کے ہسپتال میں رکھا گیا تھا، جو ایک عقوبت خانے سے کم نہ تھا۔

”علیحدگی کا یہ ہسپتال۔۔ یہاں عقوبت کا ایک مرکز بھی ہے جہاں سیاسی قیدیوں، جاسوسوں اور حکومت کے مُخالف کو بند کر کے ہر طرح کی عقوبت دی جاتی ہے کہ وہ صرف اس بات کا اقرار کریں جس کا مفروضہ انہوں نے پہلے قائم کیا ہوتا ہے۔“(۲۵) میونسپل افسر کو دن میں کئی بار تشدد کے مراحل سے گزارا جارہا تھا، اُس کا جسم لہولہان ہو چکا تھا۔ وہ مُسلسل اپنی صفائی میں بول رہا تھا۔ ”میڈم میں سیاح ہوں۔ اپنی مرضی سے یہاں آیا ہوں۔“۔ ”ڈاکٹر صاحب

میں بیمار نہیں ہوں۔ مجھے بخار نہیں ہے۔ مجھے تے نہیں آئی ہے۔ میرے بدن پر کوئی گلٹی نہیں ہے۔"(۲۶) اُس کے مسلسل مختلف نوعیت کے جسمانی ٹیسٹ کیے جارہے تھے۔ ہسپتال کی انتظامیہ اُسے ایک ایسا مریض ثابت کرنے پر تُلی ہوئی تھی جو دشمن ملک سے سیاحت کی بجائے اپنے جسم میں طاعون کے جراثیم لے کر آیا ہے تا کہ ہندوستان میں طاعون کی وبا کو پھیلا سکے۔ کوئی اس کی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ سب لوگوں کے نزدیک وہ صرف اور صرف ایک پاکستانی تھا۔ جس سے وہ ماضی کے سارے حساب بے باک کرنا چاہتے تھے کہ کہیں پھر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔

اس مقام پر انیس ناگی تاریخ کا بھیانک رُخ دکھاتے ہیں، جہاں انسانیت دم توڑ جاتی ہے اور صرف حیوانیت کا راج ہوتا ہے۔ انسان اپنی رنگ، نسل، طبقے، فرقے اور زمینی حدود سے پہچانے جاتے ہیں اور اسی کے مطابق اُن سے سلوک کیا جاتا ہے۔ انسان اور انسانیت کی بتدریج پامال ہوتی ہوئی اقدار نیز تاریخی تعصب کی بنیاد پر انسانیت کی تذلیل کے حوالے اس ناول میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ تہذیب یافتہ معاشرہ ہمیں اپنی بنیادوں پر مضبوطی کے ساتھ کھڑے رہنے کی بجائے ڈولتا اور بالآخر مسمار ہوتا نظر آتا ہے۔ میونسپل افسر کے مسلسل اپنی صفائی پیش کرنے پر سینئر ڈاکٹر شنکر اُس کی مشکل آسان کر دیتا ہے۔

> "میں نے ایک دم کہا: "سر میں بیمار نہیں ہوں۔ مجھے طاعون نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اُس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "تمہارے خون کے نتیجے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک تمہیں طاعون ہے جو تم اپنے ملک سے یہاں لائے ہو۔" ڈاکٹر شنکر یہ بات کہہ کر اپنے نائب ڈاکٹر کے ساتھ وارڈ سے باہر نکل گیا۔"(۲۷)

سورت کی حکومت اور اعلیٰ حکام اپنی کوتاہی اور نااہلی کا سارا بوجھ پاکستان پر ڈالنا چاہتے تھے۔ طاعون کے پھیلنے کی بہت بڑی وجہ حکومت اور انتظامیہ کا غیر سنجیدہ و غیر منظم رویہ تھا جس کی بنا پر طاعون کی وبا سورت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں پھیلتی چلی گئی مگر اعلیٰ حکام اپنی غلطی ماننے کو تیار نہ تھے۔ اُنہوں نے ڈاکٹر شنکر کو میونسپل آفسر کے معائنے کیلیے اسی غرض سے بھیجا تھا تا کہ وہ اُسے طاعون کا مریض ثابت کرے اور تاریخی دُشمنی اور تصادم کو مزید ہوا دی جا سکے۔ قیام پاکستان کے تاریخی واقعے نے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کشمکش، نفرت، دشمنی، اور غصے کی ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی، جس کو دونوں ملک ابھی تک ڈھا نہ سکے بلکہ وہ دیوار وقت گزرنے کے ساتھ مزید اونچی اور مضبوط ہوتی گئی۔

انیس ناگی ۱۹۴۷ء سے دلوں میں پنپتی نفرت کی سمت اشارہ کرتے ہیں جس کو سمجھوتہ ایکسپریس بھی طے نہ کر سکی، دونوں ملکوں کی سرحدوں کے فاصلے مٹاتی ٹرین جس کا نام تو "سمجھوتہ" رکھ دیا گیا تھا مگر دونوں ملکوں نے ذہنی و دلی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ سمجھوتہ نہ کیا تھا۔ گویا سمجھوتہ ایکسپریس کا قیام صرف دُنیا دکھاوا تھا۔ ہندوستان

اور پاکستان کے درمیان کی خلیج سمجھوتہ ایکسپریس طے کرنے میں ناکام رہی تھی۔ انیس ناگی اس المیے پر افسوس کے ساتھ توجہ دلاتے ہیں کہ دونوں ملک خطے کی تقسیم کے اتنے برس بعد بھی ایک دوسرے پر بہتان طرازی کی وجوہات تلاش کرتے ہیں۔ پاکستان بننے سے قبل ہندوؤں اور مسلمانوں کے جو اختلافات تھے، قیام پاکستان کے بعد اُن میں کمی ہونے کی بجائے مزید اضافہ ہی ہوا۔ تقسیم کے بعد سرحدوں کا تعین، اثاثہ جات کی تقسیم، ریاستوں کے الحاق کے حوالے سے معاملات میں کشیدگی بڑھی اور دلوں میں دوری۔ اور پھر سب سے بڑھ کر جو مسئلہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو مزید تلخ کرتا گیا وہ تھا مسئلہ کشمیر، جو اب تک دونوں ملکوں کے تعلقات میں کشیدگی اور تناؤ کا باعث بنا ہوا ہے۔ نہری پانی پر تنازعات سے تعلقات مزید خراب ہوئے۔ اُس کے بعد ۱۹۶۵ء کی تاریخی جنگ ہوئی، جس میں دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے مدِمقابل آکر اپنی شدید نفرت اور بھرپور جارحیت کا مظاہرہ کیا۔

ایسے میں ۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان تنازعات نے سر اُبھارا تو ہندوستان نے اس میں مداخلت کرتے ہوئے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنے کی بھرپور کوشش کی، جس میں وہ پوری طرح کامیاب رہا اور مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو گیا۔ یوں ہندوستان اور پاکستان کی نفرت کی جڑیں اور مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ انیس ناگی کا تاریخ کا گہرا مشاہدہ و مطالعہ اُن کے ناول میں جھلکتا ہے۔ دونوں ملکوں کے اس متنازعہ تاریخی پس منظر کے جائزے کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ ہندوستان کی حکومت پاکستانی سیاح سے تاریخ کا بدلہ نہ چکاتی، اُس کو اُن گناہوں کی سزا کیسے نہ دیتی جو اس نے کیے ہی نہ تھے۔ اُس سے سیاسی و تاریخی جھگڑوں کا انتقام کیوں نہ لیا جاتا۔ انہی وجوہات کی بنا پر سورت کے اعلیٰ حکام ڈاکٹر شنکر پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ میونسپل افسر کے جسم میں انجکشن کے ذریعے طاعون کے جراثیم داخل کرے مگر ایسے ظالمانہ و بزدلانہ فعل کیلئے ڈاکٹر شنکر کا ضمیر مطمئن نہیں۔ ڈاکٹر شنکر کی سوچ تعصب سے پاک ہے۔ وہ ایک وسیع النظر انسان ہے جس کی سوچ کا دائرہ تنگ نہیں۔ انیس ناگی، ڈاکٹر شنکر کو گھٹن زدہ معاشرے میں انسانیت کا علم بردار دکھاتے ہیں جو رنگ و نسل اور ملکی سرحدوں سے بالاتر ہو کر انسانیت کے کام آتے ہیں۔

ڈاکٹر شنکر کے نزدیک انسان کی اہمیت ہے نا کہ اُس کی شناخت کی کہ وہ کس ملک سے آیا ہے؟ پاکستانی ہے یا ہندوستانی؟ ڈاکٹر شنکر ہمیشہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے حق میں بھی آواز بلند کرتا نظر آتا ہے کیونکہ وہ انسانیت کی سربلندی کا خواہاں ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاتھوں مختلف موقعوں پر مسلمانوں پر کیے جانے والے مظالم کے حوالے سے اپنی بیوی پاروتی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ہندوؤں کے متعصبانہ رویے کی شدید مذمت کرتا ہے: "پارو ہمارے ملک میں سارا سال فرقہ وارانہ فسادات آخر کیوں؟ جس نے اس ملک میں رہنا قبول کر لیا ہے اس پر سیاسی الزام لگانا، چھرے گھونپنا، مسجدوں کو گرانا، کہاں کی شرافت ہے ہماری قوم کا دل بہت

چھوٹا ہے ہمیں انسان اور انسانیت کیلئے کام کرنا چاہیئے۔"(۲۸)ڈاکٹر شنکر کے خیالات تعصب سے پاک، اُس کی انسان دوست شخصیت کے ترجمان ہیں۔انیس ناگی اپنے کرداروں کی گفتگو کے ذریعے فکر انگیز نکتے اُٹھاتے ہیں۔قیامِ پاکستان کے بعد جہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہجرت کر کے پاکستان آئی، وہیں بہت سے مسلمانوں نے پاکستان نہ آنے کا فیصلہ کرتے ہوئے وہیں ہندوستان میں ہی رہنا منظور کیا۔ڈاکٹر شنکر ہندوستان میں ٹھہر جانے والے مسلمانوں کے حق میں بات کرتا ہے۔جن مسلمانوں نے ہندوستان میں رہنا پسند کیا، اب وہی اُن کا ملک ہے، اُنھیں اُس ملک میں آزادی سے جینے کا پورا حق ملنا چاہیئے مگر انتہا پسند ہندوؤں نے مذہبی و سیاسی اختلافات کی بنا پر ہمیشہ مسلمانوں کے لیے مشکلات کھڑی کی ہیں۔مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح کرنے کے لیے بابری مسجد کو شہید کرنے کی قابلِ مذمت حرکت اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔اُردو زبان کا مسئلہ ہمیشہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی ایک بڑی وجہ بنا رہا ہے۔گئو کشی کے معاملے پر ہندو مسلم فسادات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔انیس ناگی ایک اور اہم معاملے پر روشنی ڈالتے ہیں وہ یہ کہ ہندوستان سیاسی مسائل کے حوالے سے بیشتر مسئلوں کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہراتا آیا ہے۔ہندوستان میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات کے حوالے سے ہندوستان کی جانب سے پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا رہا ہے۔شنکر ان تمام متعصبانہ واقعات پر کڑھتا ہے۔اُس کا عزم انسان کی بھلائی ہے چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔

سورت میں طاعون کی وبا کے باعث لوگوں کی اموات اور اس حوالے سے حکومت کی مجرمانہ غفلت اور ہسپتال کی انتظامیہ کی نااہلی کے باعث ڈاکٹر شنکر پریس کانفرنس کرنے ارادہ کرتا ہے۔وہ دُنیا کے سامنے سچ اور جھوٹ واضح کر کے ذمہ داران کو اُن کی غفلت کا احساس دلانا چاہتا ہے۔اُس کے نزدیک طاعون پھیلنے کی سب سے بڑی وجہ حکومت کی نااہلی اور لاپرواہی تھی جس کی وجہ سے لوگ تیزی سے وبا کا شکار ہوئے۔شہر میں صفائی کی انتہائی ناقص صورت حال، جگہ جگہ گندگی و غلاظت کے انبار، بدبودار پانی کا محلے اور علاقوں میں جمع رہنا اور اس ساری غلاظت میں دوڑتے موٹے موٹے چوہے، حکومت کی بدانتظامی کا منہ بولتا ثبوت تھے اور جب وبا شروع ہو گئی تو حکومت نے اُس کی روک تھام کی بھی خاطر خواہ کوششیں نہیں کیں۔نہ ہی ہسپتالوں میں مریضوں کی ضرورت کے مطابق ادویات فراہم کی گئیں نہ ہسپتال کا عملہ طاعون کی بروقت تشخیص کر پایا۔اُس پر مزید تباہی ڈاکٹروں اور نرسوں کے اپنی ڈیوٹی سے فرار ہو جانے سے پھیلی۔اس ساری صورت حال کے پیشِ نظر ڈاکٹر شنکر نے پریس کانفرنس کرنے کا ارادہ کیا۔

> "کل کی پریس کانفرنس کیلئے ڈاکٹر شنکر نے اپنے ذہن میں ایک مسودہ تیار کر لیا تھا۔اسے علم تھا کہ اسے ملازم پیشہ ہونے کی وجہ سے یہ پریس کانفرنس نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ حکومتی سطح پر ابھی تک اس امر کا اعلان نہیں کیا گیا تھا کہ مہاراشٹر کے علاقے میں طاعون پھیل رہی ہے اور سورت شہر بڑی تیزی سے اُجڑ رہا تھا۔شنکر کو یہ بھی احساس تھا کہ اس کی پریس کانفرنس کو ایک سرکاری اعلامیہ تصور کیا جائے گا۔اس اعلان

سے حکومت کی نااہلی، حفاظتی اقدام میں تاخیر اور ڈاکٹروں کے فرار کی داستان سارے برصغیر میں مشہور ہو جائے گی۔"(۲۹)

سورت شہر کی انتظامیہ نے اپنے غیر ذمہ دارانہ رویے کی بنا پر عوام میں خوف وہراس کی فضا کو جنم دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاستدانوں، بیوروکریسی، میڈیا اور ہیلتھ ایجنسیوں کے درمیان صورتحال کے بیان اور روک تھام کے سلسلے میں اقدامات کے حوالے سے واضح تصادم نظر آیا جسے ساری دنیا نے دیکھا اور اعتراضات کا نشانہ بنایا۔ اسی صورتحال کا اظہار انیس ناگی ناول میں بخوبی کرتے نظر آتے ہیں۔

HDGC کی رپورٹ کے مطابق:

> "While anxiety was being displayed by the international community, the authorities in India did pretty little to calm the situation. There was clear confusion and lack of communication between the agencies involved in crisis management like health agencies, political leadership, bureaucracy and media." (۳۰)

ڈاکٹر شنکر اس کشمکش کا شکار ہے کہ اگر وہ پریس کانفرنس کرتا ہے تو حکومت اس کے خلاف ہو جائے گی اور پوری دنیا میں ہندوستان کی بدنامی ہو گی۔ اور ہوا بھی ایسا ہی، جیسے ہی حکام اعلیٰ کو ڈاکٹر شنکر کے پریس کانفرنس کے ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے اس سے رابطہ کر کے اُسے پریس کانفرنس سے روکنے کی پوری کوشش کی۔ حکام اعلیٰ نہیں چاہتے تھے کہ پریس کانفرنس کے ذریعے اُن کی کوتاہیاں دنیا کے سامنے آئیں اور اُن کو اعتراجات کا نشانہ بنایا جائے۔ پوری دُنیا کے سامنے ہندوستان کی ساکھ تباہ ہو جائے۔ سورت کے ایک معروف کاروباری شخص سے ڈاکٹر شنکر کی بحث ہوتی ہے، وہ ڈاکٹر شنکر کو پریس کانفرنس سے باز رکھنا چاہتا ہے۔

> "ڈاکٹر صاحب آپ پریس کانفرنس میں کیا کہنا چاہتے ہیں۔" لالہ موہن لال کے لہجے میں کچھ دھمکی تھی۔ "بس یہی کہ ہسپتال کا انتظام ناقص ہے، شہر کے ڈاکٹر یہاں سے فرار ہو چکے ہیں اور میونسپلٹی کو صرف چونا پھیرنے کے کوئی کام نہیں ہے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ دوسرے شہروں کو نکل جائیں۔"، "رام، رام، ڈاکٹر صاحب آپ تو دیش کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔"(۳۱)

ڈاکٹر شنکر کے اس اقدام اور پریس کانفرنس میں بیان کیے جانے والے حقائق کی خبر جیسے ہی حکام بالا کو ہوئی، اُس پر دباؤ شدید تر ہو گیا اور اُسے پریس کانفرنس نہیں کرنے دی گئی بلکہ اعلیٰ حکام کی طرف سے اُس پر پاکستانی سیاح کو طاعون کا مریض بنانے پر دباؤ بڑھنا شروع ہو گیا۔ حکام بالا چاہتے تھے کہ ڈاکٹر شنکر انجکشن کے ذریعے طاعون کے

جراثیم میونسپل افسر کے جسم میں داخل کردے تاکہ پاکستان پر سیاسی حوالے سے الزامات لگا کر پاکستان کو بدنام کیا جا سکے۔ انیس ناگی ناول میں ہندوستانی ذہنیت کی نقاب کشائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستانی حکومت کے نزدیک ایک انسانی جان کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اُنہیں اپنے سیاسی عزائم اور غلط ہتھکنڈوں سے غرض تھی۔ انہی غلط ہتھکنڈوں کے ذریعے ہندوستان، پاکستان پر دباؤ ڈالتا آیا ہے۔

انیس ناگی نے ہمیں تاریخ میں ہونے والی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تضادات و تصادمات کی جھلک دکھائی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انیس ناگی کے تاریخی شعور کی جھلک بھی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر شنکر اور ہیلتھ منسٹر کے درمیان اسی مسئلے پر طویل بحث ہوتی ہے۔ "تین گھنٹوں تک ایک سرکاری عمارت کے بند کمرے میں ہوم منسٹر، ہیلتھ منسٹر اور ڈپٹی کمشنر کے ساتھ اس کے مذاکرات ہوتے رہے، لیکن وہ پیہم انکار کرتا رہا، "پروفیسر صاحب۔۔۔ یہ ہمارے دیش کا مسئلہ ہے۔"، "لیکن میرے نزدیک یہ ایک انسانی مسئلہ ہے۔"(۳۲) انیس ناگی ڈاکٹر شنکر کو انسانیت اور بھلائی کا نمائندہ دکھاتے ہیں جو تاریخ میں ہونے والی کدورتوں اور دوریوں کو خاطر میں نہیں لاتا، جو ہندوستانی سماج اور مُسلم کش سوچ کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، اُس کے نزدیک انسانیت اور انسان کی قدر و قیمت سب سے پہلے اور بڑھ کر ہے۔ ہندوستانی ڈاکٹر کی اعلیٰ سوچ سرحدوں کی حدود کی محتاج نہیں۔

انیس ناگی نے میونسپل افسر کو پاکستانی عوام کی طرف سے دوستانہ جذبات کا نمائندہ کردار دکھایا ہے جو ہندوستان، بغیر کسی تعصب اور خدشے کے محض سیاحت کی غرض سے آیا ہے۔ مگر اُس کی اس بات پر کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں کیونکہ سیاستدان اور حکام بالا ابھی بھی تاریخی نفرتوں اور کدورتوں کو پالے ہوئے ہیں۔ سمجھوتہ ایکسپریس کو محض دکھاوے کے طور پر چلایا گیا، دلوں میں سمجھوتہ ابھی تک دونوں جانب سے نہ ہو سکا تھا۔ تبھی وزیر داخلہ ڈاکٹر شنکر کے انکار پر مشتعل ہو کر پاکستان کے خلاف واضح طور پر نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ "تمھاری ہمدردیاں اُن کے ساتھ ہیں جو ہمیں ہمیشہ نیچا دکھاتے ہیں، ہمیں کاٹتے رہتے ہیں۔"(۳۳)

تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان برسوں سے جنگ و جدل کی کیفیت چلی آرہی ہے، موقع ملنے پر الزامات کا سلسلہ دونوں جانب سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس سارے پس منظر کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انیس ناگی اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اختلاف کی سب سے بڑی وجہ ہے اور وہ ہے ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنا اور بہتان طرازی کرنا۔ ناول میں انیس ناگی نے اس ذہنیت کی عکاسی خوب کی ہے۔ وزیرِ داخلہ کی اس ذہنیت اور متعصبانہ سوچ کے پیچھے ایک پوری تاریخ موجود ہے جس سے دونوں ملکوں کے باسی واقف ہیں اور نا چاہتے ہوئے بھی تاریخ کی اس المناک حقیقت کو قبول کرنے پر مجبور ہیں، جس کے مطابق دونوں قوموں کا المیہ یہ ہے کہ وہ دونوں وقت آنے پر ایک دوسرے سے نفرت کے اظہار میں کبھی پیچھے نہیں رہی

ہیں۔ ناول میں ہندوستانیوں کی متعصبانہ سوچ، انیس ناگی کی تاریخی شعور کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ انیس ناگی کے تاریخی شعور کی بنیاد ہے۔

ڈاکٹر شنکر اپنی انسان دوست سوچ کے ہاتھوں مجبور ہے اور متعصب معاشرے میں اچھائی کی علامت اور امید کی کرن بن کر سامنے آتا ہے۔ اُسے احساس ہے کہ سورت کی حکومت میونسپل آفسر کو ناجائز طریقے سے اپنے مذموم عزائم کا نشانہ بنا کر محض ایک شخص سے پوری تاریخ کا بدلہ چکانا چاہتی ہے، جو کہ سراسر زیادتی اور ظلم ہے۔ ڈاکٹر شنکر، وزیر داخلہ کو واضح کرتا ہے۔" یہ بیماری باہر سے نہیں آئی۔ ہمارے اندر جو غلاظت ہے۔۔۔"(۳۴)ڈاکٹر شنکر کو اُس کی بات مکمل نہیں کرنے دی جاتی۔ انیس ناگی، ڈاکٹر شنکر کے ذریعے ہندوستان کو اپنے منفی رویے اور سوچ پر غور کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر شنکر، حقائق کو واضح کر کے سورت کی حکومت اور انتظامیہ کو آئینہ دکھاتا ہے، جس میں اُن کی بگڑی ہوئی صورتیں جھلک رہی ہیں۔ سورت کی انتظامیہ کی اپنی کوتاہی اور طاعون کی روک تھام میں ناکامی، طاعون کے پھیلاؤ کا سبب بنی۔ اپنی غلطی ماننے کی بجائے اُنہوں نے قصوروار دوسروں کو ٹھہرانا شروع کر دیا۔ اپنے اندر کی نفرت و دشمنی کو ایسے نازک موقع پر بھی نظر انداز نہ کیا اور نہ ہی انسانیت کا ساتھ دیا۔

ڈاکٹر شنکر، حکام بالا کو یہی باور کراتا ہے کہ یہ ہمارے اندر کی غلاظت اور گندگی ہے جس کے باعث اس آفت کا سامنا ہے۔ مگر کوئی آئینہ دیکھنے کو تیار نہیں۔ وزیر داخلہ، ڈاکٹر شنکر کی بات کاٹ کر تیزی سے جواب دیتا ہے۔"ڈاکٹر پرچار مت کریں، یہ بیماری باہر سے آئی ہے۔ ہم دھرم والے لوگ ہیں ہمسایہ مُلک نے دشمنی کی ہے۔"(۳۵)ہندوؤں اور مسلمانوں کا تاریخی المیہ یہی ہے کہ یہ دونوں قومیں جو صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتی آئی تھیں۔ آپس میں اچھے تعلقات نبھاتی آئی تھیں۔ مغربی اقوام کی مداخلت نے انہیں توڑ کر رکھ دیا۔ انگریز نے جس نفرت کا بیج بویا تھا اُس کی آبیاری دونوں قوموں نے مل کر کی اور دیکھتے ہی دیکھتے، نفرت و کینہ کا پودا تناور درخت بن گیا۔

انیس ناگی اسی المناک تاریخ کے نباض کی صورت میں اس نفرت انگیز سوچ کو بیان کرتے ہیں جس کے مطابق ہندو قوم خود کو اس نفرت سے بری الذمہ قرار دیتے ہوئے لڑائی میں پہل کرنے والوں میں مسلمانوں کا نام آگے کر دیتی ہے کہ دشمنی ہمسایہ ملک کی ہے۔ سمجھوتہ ایکسپریس کے ذریعے پاکستان فتنہ انگیزی کر رہا ہے نیز پاکستان بدلے کی غرض سے مردہ چوہے ہندوستان بھیج رہا ہے۔ انیس ناگی بیان کرتے ہیں:" سمجھوتہ ایکسپریس کو بند کر دیا گیا۔ ہندوستان کے فسطائی لیڈروں نے شور مچایا کہ پاکستان آئی۔ ایس۔ آئی کے ذریعے ہندوستان میں مردہ چوہے بھیج رہا ہے۔"(۳۶)سورت میں طاعون کی وبا کو سیاستدانوں اور شر پسند لیڈروں نے سیاسی مقاصد کے حوالے سے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ الزامات لگانے کا ایک اور موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ نفرت اور شر انگیزی پھیلانے میں فتنہ پرور لوگوں

کا پورا پورا ہاتھ تھا۔ سمجھوتہ ایکسپریس جو تعلقات کو اُستوار کرنے اور دونوں ملکوں کی عوام کے ساتھ ساتھ حکومتوں کو قریب لانے نیز اُن کے دلوں میں ایک دوسرے کیلئے گنجائش پیدا کرنے کے لیے چلائی گئی تھی، اُسے بند کر کے حکومتی سطح پر دونوں ممالک نے ایک دوسرے کا بائیکاٹ کر دیا، غرض اس تاریخی سانحے سے نمٹنے کیلئے بہتر حکمت عملی تشکیل دینے کی بجائے غلط عزائم کو ہوا دی گئی۔ جس سے دونوں ملکوں کے تعلقات میں مزید کشید گی بڑھتی چلی گئی۔

اس ناول میں انیس ناگی اپنے تاریخی شعور کے ذریعے اس تاریخی واقعے کو باطنی حوالوں کے ساتھ ساتھ خارجی حوالوں کے ذریعے بھی بیان کرتے ہیں۔ڈاکٹر شنکر اپنے دل، ضمیر اور ذہن کی کشمکش کے بعد فیصلہ کر کے میونسپل افسر کو اپنے کمرے میں طلب کرتا ہے اور سرنج میں محلول بھر لیتا ہے۔ میونسپل افسر کیلئے یہ صورتحال انتہائی تکلیف دہ اور اذیت ناک ہے۔ وہ تڑپ کر ڈاکٹر شنکر سے بھرپور التجا کرتا ہے کہ اُسے اذیت ناک موت کے گھاٹ نہ اتارا جائے، اور جب اُس کی التجائیں بے سود ہو جاتی ہیں تو وہ ہندوستانیوں کے خلاف اپنے غصے کا اظہار شروع کر دیتا ہے۔ یہی انیس ناگی کے بیان کی خوبی ہے کہ وہ ہندوستانی کے ساتھ ساتھ پاکستانی ذہنیت اور سوچ سے بھی نالاں نظر آتے ہیں انیس ناگی کا تاریخی شعور ہمارے سامنے اس تاریخی واقعے پر محض ایک طرف کے حالات بیان نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ پر بھی چوٹ کرتا ہے۔ میونسپل افسر ڈاکٹر شنکر سے کہتا ہے۔ ”کیا مجھے مارنے سے میرا ٹلک ختم ہو جائے گا؟ کیا آپ ایک بے بس شخص سے تاریخ کا بدلہ لینا چاہتے ہیں؟ یہ تاریخ آپ نے اور میں نے نہیں بنائی۔۔ اس سرنج میں زہر نہیں تو طاعون کے جراثیم ہیں۔ آپ میرے ذریعے ایک قوم کو بیمار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پہلے ہی بیمار ہے۔“(۳۷)

میونسپل افسر کے الفاظ میں انیس ناگی کے طرز ادا کا مخصوص لہجہ اور کاٹ موجود ہے۔ میونسپل افسر کا یہ کہنا کہ میرے ذریعے جس قوم کو بیمار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، وہ بے سود ہے۔ وہ قوم پہلے سے ہی بیمار ہے۔ ان جملوں میں انیس ناگی اپنے معاشرے کے رویوں پر طنز اور چوٹ کرتے نظر آتے ہیں۔ معاشرہ افراد سے تعمیر ہوتا ہے اور کسی بھی معاشرے اور قوم کی مضبوطی کی اہم شرط غیر جانبدارانہ سوچ اور صحت مند رویہ ہے۔ نفرت، شر انگیزی، متعصب سوچ سے پاک معاشرہ اور قوم ہی کامیابی کی منازل طے کرتی ہیں۔ اور جب کوئی قوم ذہنی طور پر پست اور زوال کا شکار ہو جائے تو وہ حقیقی معنوں میں بیمار ہو جاتی ہے۔ ایسے میں یہ بیمار ذہنیت اُس کے ہر اچھے عمل میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے۔ انیس ناگی اسی بیمار ذہنیت کا تذکرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ نفرتوں اور ایک دوسرے خلاف سازشوں نے دونوں ملکوں کی عوام کو ذہنی طور پر بیمار کر دیا ہے۔ اسی حقیقت کا اظہار ناول میں میونسپل افسر کرتا ہے۔ ڈاکٹر شنکر اُسے ٹیکہ لگانے کے بعد اُس کے کان میں سرگوشی کرتا ہے: ”نوجوان میں ڈاکٹر ہوں۔ قاتل نہیں

ہوں۔ میں تاریخ کے خلاف فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میں انسان ہوں اور انسانیت میرا مذہب ہے۔"(۳۸)ڈاکٹر شنکر، میونسپل افسر کو نہ زہر کا ٹیکہ لگاتا ہے نہ ہی طاعون کے جراثیم اُس کے جسم میں داخل کرتا ہے۔ بلکہ وہ اُسے خواب آور ٹیکہ لگا کر پاکستان روانہ کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر شنکر کا یہ عمل انسانیت کی سربلندی کا باعث بنتا ہے۔ ڈاکٹر شنکر انسانیت کا پرچار کرنے والا ایک اچھا انسان ہے جسکی سوچ تعصب کی آلودگی سے پاک اور ذہن تاریخ کی موشگافیوں سے آزاد ہے۔

میونسپل افسر پاکستانی معاشرے کا نمائندہ کردار ہے جو ایک عام شخص ہے اور کسی ناپاک ارادے کے بغیر صرف سیاحت کی غرض سے ہندوستان پہنچتا ہے۔ مگر سورت کی پولیس اور انتظامیہ کے عتاب کا نشانہ بنتا ہے۔ ڈاکٹر شنکر ہندوستان کی عام عوام کا نمائندہ کردار ہے جو شر پسندی کی بجائے انسان اور انسانیت کے ماننے والے ہیں۔ جبکہ دونوں طرف کی حکومتوں اور انتظامیہ کے دلوں کی کدورتوں نے دونوں ممالک کے درمیان دوری کی فضا پیدا کی ہے اور ہمیشہ ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھا ہے۔ دونوں طرف کے عوام چاہ کر بھی ایک دوسرے سے میل جول نہیں بڑھا سکتے کیونکہ دونوں اطراف سے بااثر طبقہ اس میل جول کے خلاف ہے۔

ناول میں انیس ناگی نے دکھایا ہے کہ ہندوستان کی حکومت نے میونسپل افسر کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک کیا جبکہ اُسی معاشرے کے ایک فرد نے انسانیت اور انسانی جان کو مقدم جانا۔ میونسپل افسر بالآخر اپنے وطن واپس لوٹتا ہے۔ مگر یہاں آکر بھی اُس کی آزمائشیں ختم نہیں ہوتیں بلکہ اُن میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ انیس ناگی نے ہندوستان کے بعد پاکستان کی انتظامیہ کے چہروں سے نقاب ہٹائے ہیں۔ غیروں کا سلوک پھر بھی انسان تکلیفیں سہتے ہوئے برداشت کر ہی لیتا ہے مگر اپنوں کا غیروں جیسا رویہ انسان کیلئے شدید تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ میونسپل افسر کے پاکستان لوٹنے کے بعد پاکستان کی انتظامیہ اُس کے ساتھ جو ہتک آمیز سلوک کرتی ہے، اس کی وجہ سے غیروں کی طرف سے دی گئی تکلیف کا احساس کچھ کم لگنے لگتا ہے۔ لاہور واپس پہنچنے کے بعد میونسپل افسر اور ساتھ آنے والے پندرہ سولہ آدمیوں کے ساتھ امیگریشن کے عملے نے جو سلوک کیا وہ انتہائی تکلیف دہ تھا۔

> "میں پندرہ سولہ لوگوں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا امیگریشن کے کاؤنٹر پر پہنچا وہ ایک منظر تھا۔ امیگریشن کے تمام عملے نے منہ پر ماسک باندھے ہوئے تھے۔ کوئی نصف درجن کے قریب افراد نے تارکاری کا لباس پہنا ہُوا تھا ان کے کاندھوں پر سلنڈر تھے اور ان کے ہاتھوں میں سپرے گنز تھیں۔ جنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک دم ہم پر سپرے کرنا شروع کر دیا۔ ہم نے چیخ کر کہا "ہم انسان ہیں، ہم پر سپرے مت کرو۔" ہم ادھر اُدھر بھاگ کر جان بچاتے اور کسٹم اور امیگریشن کا عملہ ہمیں چوہوں کی طرح بھاگتا دیکھ کر ہنس رہا تھا۔"(۳۹)

انیس ناگی تاریخ کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں کہ غیر اقوام نے ہمارے ساتھ ہتک آمیز اور قابل مذمت سلوک روا رکھا ہے۔ ہمیں ہر طرح سے اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انیس ناگی یہ بھی واضح

کرتے ہیں کہ ہمارے اپنوں نے بھی بدسلوکی کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی ہے۔ اس ناول میں انیس ناگی یہی حقیقت بیان کرتے ہیں۔ جہاں انسان کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔ اُس کے ساتھ جانور جیسا سلوک کیا جاتا ہے جبکہ ایسا سلوک تو جانور کے ساتھ بھی روا رکھنے کی ممانعت ہے۔ ان لوگوں پر اس لیے سپرے گیا کہ وہ ہمسایہ ملک سے آئے ہیں تو لہٰذا طاعون کے جراثیم اپنے ساتھ لائے ہوں گے لہٰذا بلغیر سوچے سمجھے اُن پر ادویات کا سپرے کر دیا گیا اور اذیت دے کر ایسے میں عملے کے لوگ اس غیر انسانی منظر کو دیکھ کر قہقہے لگانے لگے۔ انیس ناگی معاشرتی رویوں کے نقاد کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جو معاشرے کے افسوس ناک رویوں پر بے باکی کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں۔

میونسپل افسر کو واپس آکر شاہی قلعے کے عقوبت خانے میں قید کر دیا گیا۔ اپنے ملک میں آکر بھی اُسے آزادی نصیب نہ ہوئی۔ اُسے یہاں پر بھی کڑی تفتیش کا نشانہ بنایا گیا۔ اُس کے مسلسل خون کے ٹیسٹ کیے جا رہے تھے۔ وہ اپنے ملک میں اپنوں کی منت کرتا رہا اور یقین دلاتا رہا کہ اُسے طاعون نہیں ہے مگر انہوں نے بھی اُس کی بات کا اعتبار نہ کیا۔ اُس پر جاسوس ہونے کا الزام لگایا گیا۔ ”تم کمیونسٹ لگتے ہو یا تمھارے ذہن کی وہاں کافی صفائی کی گئی ہے۔ قلعہ میں قائم کردہ ہسپتال میں تمھیں جو مسلمان بیرا ملا تھا وہ ہمارا آدمی تھا۔ تم وہاں کیا کرتے ہو؟ تم نے تفتیش کے دوران انہیں کیا کیا بتایا ہے؟ تم ان کے جاسوس لگتے ہو اور سیاحت کے فراڈ میں ملک ملک پھر رہے ہو۔“(۴۰) انیس ناگی کے ناول تاریخی سچائیوں کو بہت خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ حفاظت کیلئے بنائے گئے قلعے، وقت کے ساتھ ساتھ عقوبت خانوں میں بدل گئے جہاں مختلف الزامات کی مد میں لوگوں کو لایا جاتا اور اُن سے پوچھ گچھ کی جاتی۔ لوگوں پر تشدد بھی کیا جاتا رہا۔ میونسپل افسر کے ساتھ کیا جانے والا یہ ناروا سلوک، اُس پر جاسوس ہونے کا الزام لگانا، اپنے مقاصد کے حصول کی ایک کڑی تھی وہ مقاصد جنہیں یہاں کی انتظامیہ اور بااثر افراد حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ ہندوستان پر مختلف حوالوں سے بوجھ ڈال کر سیاسی مقاصد حاصل کیے جاسکیں۔ دشمنی کو اور ہوا دی جاسکے اور الزام تراشی کے ذریعے دونوں ملک ایک دوسرے کو نیچا دکھا سکیں۔

اس ناول میں انیس ناگی اس امر کو بیان کرنے میں پوری طرح کامیاب نظر آئے ہیں کہ تعصب اور نفرت کا طاعون ہمارے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا بنا چکا ہے، مسئلہ ہمارے اپنے اندر موجود ہے۔ مگر موردِ الزام ہم دوسروں کو ٹھہراتے ہیں۔ اس طاعون کی زد میں آکر ہمارے سیاسی، سماجی و ثقافتی نظام کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں اور یہ المیہ ہماری تاریخ سے جڑا ہوا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ اس ناول میں انیس ناگی نے ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ کے معاشرتی اور سیاسی حوالوں کو استعمال کیا ہے۔ میونسپل افسر کا ہندوستان کے شہر سورت کا سفر، ہندوستانیوں کا پاکستانی سیاح سے ہتک آمیز اور متعصبانہ سلوک، سورت کی انتظامیہ اور پولیس کیا نفرت انگیز اور متشدد رویہ، سازش کے ذریعے پاکستان کو بدنام کرنے کی سعیِ لاحاصل، طاعون کا مریض بنا کر پاکستان پر بہتان

طرازی کی کوشش، پاکستان واپسی پر پاکستانی حکومت وانتظامیہ کا ہتک آمیز سلوک، جیسے حوالوں کی بنیاد اور پس منظر دونوں ملکوں کی تاریخ ہے، جسے انیس ناگی نے اپنے ناول چوہــوں کــی کہــانی میں پیش کیا ہے۔ انیس ناگی پوری غیر جانبداری کے ساتھ دونوں ملکوں کی انتظامیہ پر چوٹ کرتے ہیں۔ دونوں کی تاریخ کے تاریک پہلوؤں کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ انیس ناگی کے تاریخی شعور کا بھرپور اظہار یہ ہے کہ وہ تاریخ کے مختلف حوالوں کا جائزہ پوری ایمانداری سے لیتے ہیں۔ وہ معاشرے کی المناک حقیقتوں سے آنکھ نہیں چراتے اور نہ ہی انہیں مبالغے کے لبادے میں لپیٹ کر قاری کو گمراہ کرتے ہیں۔ انیس ناگی محقق کے ساتھ ساتھ نقاد کا کردار بھی ساتھ ساتھ ادا کرتے ہیں اور تاریخ کا بیان حقائق کی روشنی میں کرتے نظر آتے ہیں۔

اس ناول کے حوالے سے انیس ناگی نے خود ہی بیان کر دیا کہ اس میں جس طاعون کا ذکر کیا گیا وہ اصلی ہے۔ اس ناول میں انیس ناگی نے اصل طاعون کو معاشرے کی طاعون زدہ سوچ کو واضح کرنے کے لیے بطور علامت استعمال کیا ہے۔ سورت شہر میں طاعون کے پھیلاؤ کی وجوہات سے لے کر ایک ایک کڑی، تحقیق کے ذریعے جوڑتے ہوئے طاعون زدہ معاشرے کے منظر نامے کی بساط بہت خوبی سے بچھائی ہے۔ انیس ناگی کے طرزِ تحریر کی خوبی یہی ہے کہ وہ کوئی بھی امر بغیر پرکھے، حقائق کے التزام کے بغیر ادا نہیں کرتے۔ مختلف حوالوں سے اُن کی پیش کردہ معلومات وواقعات کو حقیقت کی سند حاصل ہے۔ انیس ناگی حقائق کو روایتی انداز میں بیان کرنے کے قطعی قائل نہیں ہیں۔ اُن کے اسلوب اور اندازِ تحریر میں محقق اور نقاد دونوں کا خوبصورت ملاپ ہے جو اُن کے ناول کو حقیقت اور فسانے کا ملا جلا رنگ بخشتا ہے۔ وہ تمام حقائق و واقعات کو محقق کی طرح پرکھتے ہیں اور نقاد کی طرح اُس کی خوبیوں خامیوں کو الگ کرتے ہوئے، سچائی پر مبنی تاریخ پر اپنے ناول کی بنیاد رکھتے ہیں۔ جو ان کے اس ناول چوہــوں کــی کہــــانی سے ثابت ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انیس ناگی تنقیدی تاریخی شعور کے حامل ہیں جو مُروجہ روایت اور غلط تاریخی حوالوں پر اعتبار نہیں کرتے بلکہ تاریخی حوالوں کو تنقیدی نکتہ نظر سے پرکھتے اور پھر اُسے تخلیق کا حسن بخشتے ہیں اور یہی انیس ناگی کے فن کا کمال ہے۔

حوالہ جات

۱۔ زاہد مسعود(مرتب)،انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار(لاہور:حسن پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء)
،ص۱۰۶۔

۲۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،(لاہور:جمالیات،۲۰۰۵ء)،ص۲۱۹۔

۳۔ ایضاً،ص۲۱۹۔

۴۔ ایضاً،ص۲۲۶۔

۵۔ ایضاً،ص۲۵۱۔

۶۔ ایضاً،ص۲۴۶۔

۷۔ ایضاً،ص۲۴۸،۲۴۷۔

۸۔ ایضاً،ص۲۵۶۔

۹۔ ایضاً،ص۲۵۷۔

۱۰۔ ایضاً،ص۲۵۷۔

۱۱۔ ایضاً،ص۲۶۲۔

۱۲۔ ایضاً،ص۲۶۳۔

۱۳۔ Ruchika Rai,"How Surat turned clean and good, and stayed that way", *The Times of India*(2011.)accessed,March17,2011,06:26IST.

۱۴۔ "Surat: A victim of its open sewers",(*New York Times*. 25 September 1994), Retrieved 2008-04-26.

۱۵۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۲۸۶۔

۱۶۔ ایضاً،ص۲۸۱۔

۱۷۔ "Surat: A victim of its open sewers." New York Times. (1994) Retrieved 2008-04-26. https://trove.nla.gov.au/version/75457686.

۱۸۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۲۸۷۔

۱۹۔ ایضاً،ص۲۲۷۔

۲۰۔ http://www.aag.org/HDGC/www/health/units/unit4/html.

۲۱۔

F. Burns, John."Thousands Flee Indian City in Deadly Plague Outbreak." *The New York Times*(1994).www.nytimes.com>plague outbreak in1994.

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ 1994 plague in India[online]. last modified March 16, 2018.https://en.m.wikipedia.org/wiki/1994_plague_in_india.

۲۴۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۲۶۷۔

۲۵۔ ایضاً،ص۲۶۹۔

۲۶۔ ایضاً،ص۲۶۹۔

۲۷۔ ایضاً،ص۲۶۹۔

۲۸۔ ایضاً،ص۲۸۱۔

۲۹۔ ایضاً،ص۲۸۷،۲۸۶۔

۳۰۔ http://www.aag.org/HDGC/www/health/units/unit4/html.

۳۱۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۲۹۱۔

۳۲۔ ایضاً،ص۲۹۳۔

۳۳۔ ایضاً،ص۲۹۵۔

۳۴۔ ایضاً،ص۲۹۷۔

۳۵۔ ایضاً،ص۲۹۷۔

۳۶۔ زاہد مسعود(مرتب)،انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار،ص۱۰۶۔

۳۷۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۳۰۳۔

۳۸۔ ایضاً،ص۳۰۵،۳۰۳۔

۳۹۔ ایضاً،ص۳۰۷۔

۴۰۔ ایضاً،ص۳۰۹،۳۰۸۔

باب پنجم

کیمپ: انیس ناگی کی تاریخی فکر کا نمائندہ ناول

کیمپ انیس ناگی کا ناول ہے جو ۱۹۸۸ء میں جمالیات لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے صفحات کی کل تعداد ۸۴ ہے جبکہ اس میں ۱۷ مختصر ابواب شامل ہیں۔ انیس ناگی کے تاریخی شعور تک رسائی کے ضمن میں ناول کیمپ میں بیان کردہ تاریخی حوالوں کو بنیاد بنایا جائے گا، جس سے انیس ناگی کے تاریخی تصورات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

تاریخ کے حوالے

اس ناول میں افغانستان میں جنگ کے نتیجے میں، پاکستان میں پناہ لینے والے افغان مہاجرین کے کیمپ کی زندگی، حالات اور اُن مہاجرین کے پاکستان پر سیاسی، سماجی و معاشی حوالوں سے اثرات کو بطور پس منظر استعمال کیا گیا ہے۔ انیس ناگی نے جولائی ۱۹۹۷ء سے جنوری ۱۹۹۹ء تک بطور کمشنر افغان مہاجرین اپنی خدمات انجام دیں۔ اس دوران اُنھوں نے مہاجرین کی زندگیوں کا، اُن کے رہن سہن، عادات و اطوار، رسم ورواج اور معاشرت کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ اسی بنا پر انیس ناگی کے اس ناول کے تانوں بانوں میں حقیقت کے رنگ جھلکتے ہیں اور ہمیں افغان مہاجرین کی اصل زندگی کے گوں ناگوں پہلوؤں کو جاننے اور اُن کی نفسیات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

ناول کے آغاز میں انیس ناگی نے شہر لاہور کا منظر نامہ پیش کیا ہے جہاں دو دوست، محمد خاں لودھی، ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر اور چوہدری امام دین، ریٹائرڈ سپرینٹنڈنٹ سول سیکریٹریٹ، ایک حلوائی کی دکان پر ناشتہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ناشتے کے بعد دونوں دوست گردو پیش کا جائزہ لیتے ہوئے اُن پر تبصرہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دوست بازار میں افغانیوں کو قالین، کپڑے اور اسمگل شدہ اشیاء فروخت کرتے دیکھ کر اپنے دوست سے حیرت کا اظہار کرتا ہے۔ "اتنے افغانی کہاں سے آگئے ہیں؟"(۱) ان دونوں دوستوں کی حیرت بجا ہے۔ پاکستان میں جگہ جگہ افغانیوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی دیکھ کر اُن کا حیران ہونا اچھنبے کی بات نہ تھی۔

یہیں سے انیس ناگی ہمیں مختلف راستوں سے گزارتے ہوئے، ضلع میم اور شہر کاف کی سڑکوں کو ناپتے ہوئے بنوں کے راستے، پاکستان میں افغانیوں کے قائم شدہ کیمپ کی طرف لے چلتے ہیں۔ "بستی کاف سے ایک چھوٹی سی سڑک چپکے سے باہر نکلتی ہوئی بنوں کی طرف جاتی ہے۔۔ چند گز کے فاصلے پر کوٹ بندھن ہے۔ یہ موضع کہیں

نظر تو نہیں آتا البتہ وہاں ایک ٹوٹے اور ہوا میں مرتعش بورڈ پر ”کیمپ“ لکھا ہُوا ہے۔“(۲) کیمپ کا اصل نقشہ دکھانے سے قبل، انیس ناگی کیمپ کے بورڈ کی خستہ حالی دکھا کر قاری کو کیمپ کی خستہ حالی کا پیشگی احساس دلاتے ہیں۔ کیمپ کی حالت، بورڈ کی مانند انتہائی تباہ حالی کا شکار ہے۔ مدقوق اور ویران کچے مکان گویا کسی قدیم دور اور تہذیب کی یادگار دکھائی دیتے ہیں۔ ”کیمپ میں دو فرلانگ کے سفر کے بعد سنسان مکانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، یوں لگتا ہے یہ کسی تہذیب کے کھنڈر ہیں۔“(۳) انیس ناگی کیمپ کا نقشہ کھینچتے ہوئے مہاجرین اور اُن کے اردگرد کا ماحول جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ کیمپ کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔ کیمپ کی اجڑی ہوئی حالت، سیاہ اور سُرمئی کپڑوں میں ملبوس سیاہ پگڑیاں باندھے، اپنے گھروں کے باہر بنے تھڑوں پر بیٹھے مہاجرین کی پر اسرار خاموشی اور سوچتی ہوئی آنکھیں کچھ نہ کہتے ہوئے بھی، بہت کچھ کہتی معلوم ہوتی ہیں۔ انیس ناگی نے ناول میں ہجرت اور غریب الوطنی کے دکھ کو تاریخی حوالوں کے التزام کے ساتھ بہت خوبی و مہارت سے واضح کیا ہے۔

افغانیوں کا اصل وطن افغانستان ہے، مگر حالات نے اُنہیں اپنے وطن کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ افغانستان میں بسنے سے پہلے افغانیوں کی سرزمین کون سی تھی، اُن کے آباؤاجداد کہاں کے رہنے والے تھے، کہاں سے ہجرت کرتے ہوئے افغانستان پہنچے اور پھر یہیں بس گئے۔ انیس ناگی ہمیں افغان مورخین کا حوالہ دیتے ہوئے افغانیوں کی قدیم تاریخ سے آگاہ کرتے ہیں۔

> ”افغانوں کے مورخین کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی جد میں ایک بادشاہ ساعول تھا جس کے دو بیٹے تھے، ایک کا نام طالوت تھا اور دوسرے کا نام افغان تھا۔ ان کے بارہ قبیلے تھے۔ مصر میں اسرائیلیوں کی خوشحالی دیکھ کر بابل کے بادشاہ نے ان کو ملک بدر کرنا شروع کر دیا۔ اس افراتفری میں اسرائیلیوں کا بارہواں قبیلہ کہیں گم ہو گیا جو بھٹکتا ہوا افغانستان کے شمالی علاقے میں کھو گیا۔“(۴)

اسرائیل (Israel Finkelstein)، بادشاہ ساعول کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں بیان کرتا ہے: ”عبرانی بائبل کے مطابق، ساعول، مملکت اسرائیل اور یہوداہ کا پہلا بادشاہ تھا۔ اس کا دور روایتی طور پر گیارہویں صدی قبل مسیح میں تھا۔ جس نے ۱۰۵۰۔ ۱۰۱۲ ق م تک حکومت کی۔“(۵) بادشاہ ساعول کی اولاد میں سے ایک بیٹے کا نام ارمیہ (Irmia) تھا اور ارمیہ کے بیٹے کا نام ملک افغانہ (Malak Afghana) تھا۔ آزاد دائرۃ المعارف کے مطابق: ”افغانہ ایک قبائلی سردار یا شہزادے کا نام ہے جو پشتون روایات کے مطابق موجودہ پشتونوں کا جد الامجد سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق بنی اسرائیل کے مشہور بادشاہ طالوت کی اولاد سے ہے۔ افغانستان کا موجودہ نام بھی انہی کی وجہ سے پڑا ہے۔“(۶) افغانوں کے تاریخی پس منظر سے پتہ چلتا ہے کہ دورِ قدیم میں افغانوں کے آباؤاجداد کو جلاوطنی و ہجرت کے دُکھ جھیلنے پڑے، اپنے وطن کو اُنہیں ناسازگار حالات کی بنا پر خیر باد کہہ کر ملکوں ملکوں بھٹکنا پڑا۔ یہی ہجرت و جلاوطنی کے دُکھ اُن کی نسلوں کو وراثت میں ملے جس کے نتیجے میں افغان اپنے ملک

سے حالات کی ابتری کے باعث، اپنی اور اپنے بچوں کی بقا کے لیے ہجرت کر کے، پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ افغانستان، جو پاکستان کا ہمسایہ ملک ہے، ایک طویل عرصے سے میدان جنگ بنا ہوا ہے۔ اس کے باسی، برسوں سے یا تو جنگی حالات سے نمٹتے ہوئے دشوار گزار زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، یا اپنے گھر بار چھوڑ کر اپنے خاندان اور بچوں کی زندگیوں کی خاطر ہمسایہ ممالک میں پناہ لے کر غریب الوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں سوویت فوج نے افغانستان پر حملہ کر کے اپنا تسلط جمالیا۔ افغانستان جنگ کی زد میں تھا۔ جس کی وجہ سے لاکھوں افغان مہاجرین ہجرت کر کے ایران اور پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اتنی تعداد میں مہاجرین کا ہجرت کر کے آنا یقیناً کسی بھی ملک کی معیشت پر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے اور ایسا ہی پاکستان کے ساتھ بھی ہوا۔ لاکھوں افغان مہاجرین کی کفالت کی ذمہ داری پاکستان پر آپڑی تھی۔ بہت سے اقتصادی، معاشی و معاشرتی مسائل کے باجود پاکستان نے انسانی بنیادوں پر افغان مہاجرین کو اخوت و بھائی چارے کا ثبوت دیتے ہوئے پناہ دی۔

۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۳ تک مسلسل افغانستان سے، مہاجرین ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لیتے رہے۔ ان برسوں میں یہ تعداد تقریباً ۳۰ لاکھ کے قریب جا پہنچی۔ CCAR اسلام آباد کی ایک رپورٹ کے مُطابق: "۱۹۸۴ کو بھی پاکستان میں رجسٹرڈ افغان مہاجرین کی تعداد ۲۸ لاکھ سے زائد تھی۔ اس تعداد کے علاوہ ۴ لاکھ مہاجرین غیر رجسٹرڈ تھے۔ "(۷) حکومت پاکستان نے مہاجرین کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر خیمہ بستیاں تشکیل دیں تا کہ مہاجرین کی آبادکاری کے مسئلے سے نمٹا جا سکے۔ ہر خیمہ بستی میں مہاجرین کی تعداد تقریباً ۵۰۰ سے ۸۰۰ تک تھی۔

کچھ برسوں بعد خیموں کی جگہ مٹی کے کچے مکانوں نے لے لی۔ اسد سلیم شیخ اس حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> "چار برس خیموں میں گزارنے کے بعد افغان مہاجرین نے خیموں کو ترک کرنا شروع کر دیا اور ان کی بجائے نیم پختہ مٹی کے ڈھانچوں کی تعمیر شروع کر دی جنہیں "مٹی کا گھر" کا نام دیا گیا۔ کچے مکانوں کے یہ ڈھانچے افغانستان کے دیہاتی علاقوں کی روایتی رہائش گاہوں سے مشابہہ ہیں۔"(۸)

انیس ناگی نے ناول میں ایک ایسا ہی کیمپ دکھایا ہے، جس میں مہاجرین نے افغانی طرز کے کچے مکانات تعمیر کر کے اپنی رہائش کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو، اپنی تہذیب و معاشرت اور رہن سہن کے انداز نہیں بھلا پاتا۔ لہذا کیمپ کے مہاجرین بھی اپنی روایات اور ماحول کے مطابق کیمپ میں زندگی گزار رہے تھے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک ریٹائرڈ فوجی "میجر قربان" ہے۔ جو اپنی سخت گیری کے لیے مشہور ہے۔ تمام مہاجرین اُس سے ڈرنے کے ساتھ ساتھ اُسے سخت ناپسند بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی نظر میں وہ اُن کی آزادنہ نقل و حرکت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ میجر قربان کو انیس ناگی نے ناول کے ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ مثبت خیالات کا حامل ایک مُحب وطن انسان ہے۔ وہ پاکستان کی خیر خواہی کے ساتھ ساتھ مہاجرین کی خیر خواہی بھی چاہتا ہے۔ میجر قربان ایک عام سا آدمی تھا جس کا باپ پنساری کی دکان چلاتا تھا اور اسے بھی اسی کام میں لگانا چاہتا

تھا۔ مگر میجر قربان نے فوج کی نوکری اختیار کی اور ریٹائر ہونے کے بعد کیمپ کی دیکھ بھال اور انتظامی معاملات کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ انیس ناگی نے چونکہ افغان مہاجرین کے کیمپوں کے حالات کا انتہائی قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ اس لیے میجر قربان میں ہمیں اُسی تن دہی اور جذبے کی لہر نظر آتی ہے جو انیس ناگی کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ ناول میں افغان مہاجرین کے مختلف قبائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ میجر قربان پٹھانوں کی ایک سی شکلوں اور انداز و اطوار کے باجود یہ جان کر حیران تھا کہ مہاجرین کم و بیش سینتیس(۳۷) قبیلوں میں تقسیم تھے۔ "اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس کے کیمپ میں کم و بیش سینتیس کے قریب مختلف قبیلوں کے افراد تھے: احمد زئی، آقا خیل، بلوچ، مُغل، فارسی واں، کاکڑ، عیسیٰ خیل، خلجی خاں خیل، مروت، شنواری، نیازی، قندھاری، تاجک، ازبک۔"(۹)

انیس ناگی کے ہاں تاریخ کا بیان تحقیق کے التزام اور تنقید کی کسوٹی سے گزر کر واضح انداز میں ملتا ہے۔ افغان قبائل کے حوالے سے انیس ناگی کی معلومات و مشاہدہ قابلِ ذکر ہے۔ افغان قبائل اپنی قدامت، رسوم و رواج اور رہن سہن کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہیں۔ ہر قبیلے کی کچھ نمایاں خصوصیات انہیں دوسرے قبائل سے ممتاز کرتی ہیں ورنہ دیکھنے میں سارے پٹھان ایک جیسے نظر آتے ہیں۔

افغان مہاجرین پاکستان میں خالی ہاتھ آئے تھے۔ اُن کے پاس رہائش، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کیلئے کچھ نہ تھا۔ پاکستان نے اس حوالے سے مدد کا بھرپور ہاتھ بڑھایا۔ مہاجرین کو خوراک، لباس، جوتے، گھریلو استعمال کی اشیاء، کھانے کا سامان اور پکانے کا تیل فراہم کیا۔ نیز کمبل، بستر وغیرہ کا انتظام بھی بڑے پیمانے پر کیا گیا۔ انسانیت کے جذبے کے تحت پاکستان کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک نے بھی مدد کا ہاتھ بڑھایا اور مہاجرین کے لیے امداد فراہم کی۔ غیر ممالک سے مہاجرین کے لیے اشیاء خورد و نوش، کپڑے، کمبل وغیرہ آئے۔ برسوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پاکستان کے ساتھ ساتھ امداد بھیجنے والے ممالک مہاجرین کا بوجھ برداشت کرتے رہے۔ مگر یہ سلسلہ آخر کب تک چلتا۔ مہاجرین کے قیام کے بڑھتے ہوئے دورانیے کے باعث اب مسائل جنم لینے لگے تھے۔

انیس ناگی بیان کرتے ہیں۔ "مقامی اور بین الاقوامی سطح پر سب کا خیال تھا کہ مہاجروں کا مسئلہ ایک دو سال میں طے ہو جائے گا اس لیے یہاں مستقل بنیاد پر انتظام و انصرام کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن مہاجروں کے قیام کا مسئلہ گھسٹتا رہا تھا۔ گھر واپسی کے طویل انتظار میں اٹھارہ برس بیت چکے تھے۔"(۱۰) افغانستان مسلسل جنگ و جدل کا میدان بنا ہوا تھا۔ مہاجرین اس امید پر بیٹھے تھے کہ ایک نہ ایک دن اپنے ملک کو لوٹ جائیں گے مگر اُن کا یہ انتظار ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ جہاد کا خاتمہ ہو جانے کے باوجود افغان دھڑوں کے درمیان مسلسل جاری رہنے والی جنگ نے مہاجرین کی واپسی کو ناممکن بنایا ہوا تھا۔ اب امداد دینے والے ممالک بھی تنگ آ چکے تھے جس کے باعث پاکستان

پر بھی بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔ انیس ناگی نے ناول میں اسی تکلیف دہ کیفیت کو بیان کیا ہے۔ مہاجرین خوراک کی کمی کے باعث انتہائی پریشان تھے۔ اُن کے بچے بھوک سے بلک رہے تھے۔ ناول میں یہ کیفیات اُبھر کر سامنے آئی ہیں۔

"میجر قربان کو بھی ان مسائل کا احساس تھا لیکن وہ ان مہاجروں سے بھی زیادہ مجبور تھا کیونکہ اس کیمپ کا انچارج ہونے کے باوجود کچھ نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ خوراک اور پانی کی کمی کافی شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ادھر مہاجرین جو پہلے خاموشی سے چیزیں وصول کرتے تھے، اب وہ تقاضا کرنے لگے تھے۔"(۱۱)

خوراک انسان کی پہلی اور بنیادی ضرورت ہے۔ اور جب وہ میسر نہ ہو تو اچھا بھلا انسان وحشی بن جاتا ہے۔ مہاجرین، جن کے چہرے اور آنکھیں پر اسرار خاموشی کے سائے تلے رہتے، اب وہ بھی آواز اُٹھانے لگے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انیس ناگی نے مہاجرین کے کرب کو جذبات کی گہرائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خوراک کی کمی کے باعث مہاجر خواتین اور بچوں کی حالت انتہائی ناساز گار تھی۔

"Absent Afghans" کے ایک آرٹیکل کے مطابق:

'Children under the age of five as well as thousands of women were at risk for dying based on lake of food or medical care." (۱۲)

جیسے جیسے مہاجرین کا پاکستان میں قیام طویل ہوتا جارہا تھا، اُسی کے مطابق مسائل سر اُٹھا رہے تھے۔ انیس ناگی ناول میں ایک اور نکتہ واضح کرتے ہیں کہ مہاجرین کے بچے، جو اتنے برسوں میں اب جوان ہو چکے تھے، اور وہ بچے بھی جو پاکستان ہی میں پیدا ہوئے تھے، سب کی سوچ یہی تھی کہ افغانستان ہی اُن کا ملک ہے، وہ پاکستان میں مہاجر ہیں اور اس سے زیادہ اس ملک سے اُن کا کوئی تعلق نہیں، اُن کا تعلق محض مجبوری کا اور عارضی ہے۔ وہ پاکستان کی طرف سے دی گئی سہولتوں کو استعمال کرنے کے باوجود اس ملک سے کسی قسم کا کوئی قلبی تعلق استوار نہ کر پائے تھے۔ انیس ناگی افغان مہاجرین کی نفسیات سے ہمیں بخوبی آگاہ کرتے ہیں۔

پاکستان کی حکومت نے مہاجر کیمپوں میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے سکولوں کا اجرا کیا۔ پاکستان کا یہ اقدام مہاجرین کے مستقبل کی بہتری کے سلسلے میں ایک اہم پیش رفت تھی۔ اس اقدام کے پیچھے یہی صحت مندانہ سوچ کار فرما تھی کہ جب تک مہاجرین پاکستان میں رہنے پر مجبور ہیں، اُن کے بچوں کی تعلیم کا اہتمام کر کے اُن کے مستقبل کو محفوظ بنایا جائے تاکہ وہ بچے پڑھ لکھ کر معاشرے کا کارآمد اور صحت مند رُکن بن سکیں۔ ناول میں جو نکتہ قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ کیمپ میں قائم شدہ سکول میں پشتو میں تعلیم دی جارہی تھی، افغان بچے پوری دلچسپی کے ساتھ پشتو میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ افغانستان سے دور ہونے اور واپسی کے امکانات نظر نہ آنے کے باوجود مہاجرین اور اُن کے بچے افغانستان سے ہی دلی و ذہنی طور پر وابستہ تھے۔ انہیں اُردو زبان سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور اسی لیے وہ

اُردو نہیں پڑھتے تھے کیونکہ اُن کے ذہنوں میں یہ بات واضح تھی کہ اُنہوں نے ایک نہ ایک دن اپنے ملک واپس لوٹنا ہے۔ ناول میں مہاجرین کی اس سوچ کی خوب عکاسی کی گئی ہے۔ میجر قُربان افغان بچوں کو اُردو کی بجائے پشتو میں کتابیں پڑھتے دیکھ کر سکول ماسٹر سے استفسار کرتا ہے۔"ماسٹر صاحب ایسی تعلیم کا کیا فائدہ جو استعمال میں نہ آسکے۔ آپ انہیں اُردو میں کیوں نہیں پڑھاتے؟ میجر صاحب ہم نے ایک نہ ایک دن واپس جانا ہے، آپ کی زبان ہمارے کس کام کی۔"(۱۳) مہاجرین دورِ حاضر کے تقاضوں اور حال کی ضرورتوں کو سمجھنے سے زیادہ مستقبل کے سود و زیاں میں اُلجھ گئے تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ افغان بچے وقت کے تقاضوں کے مطابق تعلیم حاصل کرتے تاکہ اُن کا مستقبل محفوظ ہوتا کیونکہ اُنہیں پاکستان میں رہتے ہوئے ایک طویل عرصہ ہو چکا تھا، پشتو میں تعلیم حاصل کرنا بے فائدہ تھا مگر مہاجرین کے نظریات بدلنا آسان نہیں تھا۔

انیس ناگی ناول میں اس تاریخی المیے کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ پاکستان نے جس انسانی ہمدردی اور اخوت و محبت کے جذبے کے تحت مہاجرین کو پناہ دی،، اُس جذبے کی قدر اُس طرح نہ کی گئی جس کا حق بنتا تھا۔ مہاجرین اپنے ملک سے دور تھے۔ پاکستان نے اُنہیں اسلامی بھائی چارے کے تحت پناہ دی تھی، بجائے اس کہ، کہ وہ اس بھائی چارے کی قدر کرتے، اُنہوں نے کیمپ میں مشکوک اور خفیہ سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ پناہ لینے والے بہت سے مہاجرین نے اپنے آپ کو کیمپ میں کسی نہ کسی طرح خود مختار بنایا ہوا تھا اور یہ خود مختاری میجر قربان کیلئے قابل قبول نہ تھی، انیس ناگی نے کیمپ میں مہاجرین کے خود ساختہ دفاعی نظام کو واضح کیا ہے۔"اگرچہ کیمپ کا عملہ ان کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا ہے لیکن ان مہاجروں نے اپنی بہتری اور دفاع کا ایک اپنا نظام بنایا ہوا تھا۔"(۱۴)

کیمپ میں رات کے وقت ہونے والی مشکوک سرگرمیوں سے میجر قربان انجان نہیں تھا۔ اُسے رات کے وقت کیمپ میں مشکوک نقل و حرکت کا احساس ہوتا، رات کے اندھیرے میں کچھ سائے گردش کرتے نظر آتے، اونٹوں سے سامان اُتارا جاتا۔ اس سارے عمل نے مہاجرین کو میجر قربان کی نظروں میں انتہائی مشکوک بنا دیا تھا جو کچھ نہ کہتے تھے مگر اُن کی خاموشی میں بہت سے راز پوشیدہ تھے۔ وہ اپنی زبان بند رکھتے مگر اُن کے مشکوک عمل سے پر اسرار حرکات کا احساس ہوتا تھا۔

> "میجر قربان اپنی کرسی سے اٹھا اور بند دریچے کے شیشوں سے باہر دیکھنے لگا، اسے چاندنی میں کچے مکانوں سے دور کچھ سیاہ دھبے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے، اُس نے جلدی سے اپنی کلاشنکوف اٹھائی اور اس کا میگزین چڑھایا۔۔۔۔ اسے کئی دنوں سے اطلاع مل رہی تھی کہ ہفتے میں ایک دو مرتبہ رات کی تاریکی میں مہاجر پہاڑ کے راستے سے آتے ہیں اور کچھ سامان اتار کر چلے جاتے ہیں۔ ادھر اخبار واویلا مچا رہے ہیں کہ بڑے شہروں میں روز بروز اسلحے کا اضافہ ہو رہا ہے اور ہر بڑے شہر میں منشیات کا کھلے بندوں دھندا چل رہا ہے۔"(۱۵)

افغانیوں کو مصیبت زدہ دیکھ کر پاکستان نے اپنے اسلامی بھائیوں کیلئے اپنے ملک اور دل کے دروازے وا کر دیئے تھے۔ مگر ان پناہ گزینوں میں جرائم پیشہ افراد نے انتہائی غلط کردار ادا کرتے ہوئے تمام مہاجرین کی ساکھ کو نقصان پہنچایا۔ مہاجرین کی آمد کے باعث پاکستان میں بہت سے مسائل نے جنم لیا۔ پاکستان میں ناجائز اسلحہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ جس نے ملک میں ناجائز اور پر تشدد سرگرمیوں میں اضافہ کیا۔ اس بنا پر پاکستان کی عالمی ساکھ کو شدید دھچکا لگا۔ پاکستان پر دہشت گرد ہونے اور دہشت گردوں کو پناہ دینے کا الزام لگایا گیا۔ بھابانی سن گپتا کے مطابق:

"افغان مہاجرین کی آمد سے پاکستان کی دفاعی حیثیت متاثر ہونے کی بنا پر اس کیلئے فوجی اور دفاعی مسائل پیدا ہوئے۔ سوویت یونین اور افغانستان کی طرف سے ان الزامات کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ پاکستان کے علاقہ میں مہاجر کیمپوں میں گوریلا تربیتی مراکز ہیں اور پاکستان افغانستان کے اندر خانہ جنگی میں گوریلوں کی اعانت کر رہا ہے۔ اور کیمپوں میں انہیں فوجی تربیت دیتا ہے۔"(١٦)

پاکستان کو ہمدردی کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ میجر قربان جو ہر حال میں پاکستان کی بقا چاہتا ہے، اس قسمت سے واقف ہے جو اُس کا ملک بھلائی کے بدلے میں ادا کرنے پر مجبور تھا۔ وہ اپنے ماتحت شیر گل کو سختی سے تنبیہ کرتا ہے۔" یہ کیمپ انسانوں کو انسان کے ظلم سے بچانے کیلئے بنایا گیا ہے نہ کہ سمگلنگ کیلئے۔"(١٧) پاکستان میں ناجائز سرگرمیوں کی وجہ افغان مہاجرین میں سے وہ لوگ تھے جو شر پسند اور تخریب کار ذہن رکھتے تھے۔ آغاز میں مہاجر کیمپوں میں مہاجرین کی رجسٹریشن کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ ١٩٧٨ء سے مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا جبکہ کیمپوں میں ان کی رجسٹریشن ١٩٩٥ء کے بعد شروع کی گئی جس سے شر پسند عناصر کو اپنے شر کو پھیلانے اور اپنے مذموم عزائم کی جڑیں مضبوط کرنے کا بہترین موقع مل گیا اور اُنہوں نے پاکستان اور اس کی عوام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ انور ہاشمی، مہاجرین کے سبب پاکستان میں پیدا ہونے والے مسائل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"Camp without any boundary provides refugees easy way, which is now creating serious problems for security and peace throughout the region. Refugees have destructive weapons. It also complaints that beyond the camp these refugees are contaminated in different crimes...without a boundary it is very easy to smuggle weapons from camp."(١٨)

مہاجرین نے کیمپ میں اسلحہ اکٹھا کر کے کیمپ کی ساکھ کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ کیمپ جو تباہ حال لوگوں کی اعانت کیلئے قائم کیا گیا تھا۔ اُسے مہاجرین میں سے شر پسند لوگوں کے ساتھ ساتھ دوسرے علاقوں اور ملکوں کے لوگوں نے جرائم کا اڈا اور اسلحے کا گڑھ بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان حقائق کا اظہار انیس ناگی نے ناول میں بے باکی سے کیا

ہے۔ اسلحہ کی اسمگلنگ کی بنا پر ۸۰ کی دہائی میں پاکستان میں دہشت گردی نے زور پکڑا اور عوام میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا۔ جس نے انتشار اور بے چینی کی کیفیت پیدا کی۔ منشیات کی اسمگلنگ نے پاکستان میں منشیات کے استعمال کی شرح میں تیزی سے اضافہ کیا جس سے نوجوانوں کی زندگیاں تباہ ہوئیں اور پاکستان کو اس حوالے سے ناقابلِ تلافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول کا کردار میجر قربان، کیمپ کی بگڑتی ہوئی صورتحال سے پریشان ہے۔ وہ کسی صورت نہیں چاہتا کہ کیمپ کسی بھی غلط سرگرمی کا گڑھ بنے۔ وہ اگرچہ سخت گیر ہے مگر مہاجرین سے پوری ہمدردی رکھتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ مہاجرین کسی بھی غلط سرگرمی میں ملوث ہوں۔ "وہ یہاں سے اسمگلنگ کو روکنا چاہتا تھا۔ وہ بھی آرزومند تھا کہ وہ واپس چلے جائیں۔ یہ اس کی سوچ کا مثبت پہلو تھا کیونکہ اس نے بھی دو برس تک جلاوطنی کا دُکھ جھیلا تھا۔ اسے بھی انسانی دکھ اور مصیبت کا علم تھا۔"(۱۹) میجر قربان کا ماضی اُس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ وہ مہاجرین کے دُکھ کو سمجھتا تھا۔ جب مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا تاریخی المیہ ہُوا اس وقت میجر قربان مشرقی پاکستان میں تھا۔ اُس وقت اُسے جنگی قیدی بنا کر انڈیا میں رانچی کیمپ (Ranchi Camp) میں قید کر دیا گیا تھا جہاں اُس پر بے رحمی سے تشدد کیا جاتا، اُس سے ناکردہ گناہوں کو قبول کرنے پر اصرار کیا جاتا رہا تھا۔ وہ تکلیف دہ عرصہ جو اُس نے رانچی کیمپ میں گزارا، اُسے مہاجرین سے ہمدردی پر اکساتا۔ جسے وہ اپنے عمل سے زیادہ ظاہر نہ ہونے دیتا مگر وہ اُن کا سچا خیر خواہ تھا اور اس کے ساتھ پاکستان کو بھی افغان مہاجرین کے ہاتھوں کسی صورت نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میجر قربان کیلئے سب سے بڑا مسئلہ مہاجرین کی کیمپ سے باہر آزادانہ نقل و حرکت تھی۔

انیس ناگی نے ناول میں ایک بڑے مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مہاجرین نے کیمپ کی حُدود میں رہنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ وہ تیزی سے پاکستان کے مختلف علاقوں میں پھیلنے لگے۔ مہاجرین کی آمد کے فوراً بعد سے چونکہ اُن کی رجسٹریشن کا بندوبست نہ کیا گیا تھا لہٰذا انہیں آزادی کے ساتھ پاکستان کے مختلف علاقوں میں نقل و حرکت کا موقع مل گیا اور اُس موقع کا انہوں نے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور پاکستان کو معاشرتی، اقتصادی، سیاسی نوعیت کے مسائل سے دوچار کیا۔ اس حوالے سے اسد سلیم شیخ بیان کرتے ہیں:

> "تیس لاکھ افغان مہاجرین کی مسلسل موجودگی نے پاکستان کیلئے بعض ایسے مسائل پیدا کیے ہیں جن کے پاکستانی معاشرت پر واضح اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ خصوصاً بلوچستان اور صوبہ سرحد میں جہاں مہاجرین اور مقامی آبادی کا مجموعی تناسب ایک اور سات کا ہے۔ اس صورت میں مقامی اور مہاجرین کے درمیان تعلقات تسلی بخش ہونے کے باوجود ایسے اختلافات پیدا ہوئے جو مذکورہ فریقین کے مابین تنازعات اور لڑائی جھگڑوں کا باعث بنے۔ عام طور پر یہ تنازعات افغان مہاجرین کے مقامی افراد کی ملکیت کھیتوں میں پڑاؤ اور مویشیوں کیلئے چارہ کاٹنے پر پیدا ہوئے۔"(۲۰)

جب افغان مہاجرین نے کیمپ سے نکل کر پاکستان کے مختلف علاقوں کا رُخ کرنا شروع کیا تو عوام میں بے چینی کی فضا پیدا ہونے لگی۔ کیونکہ مہاجرین نے اپنے لیے روزگار کی تلاش شروع کرتے ہوئے مقامی افراد کی مزدوری اور مختلف پیشوں میں سے اپنا حصہ وصول کرنا شروع کیا، جس سے مقامی افراد کیلئے روزگار کی شرح میں کمی واقع ہوئی جس پر عوام نے افغانیوں کی ملک میں بڑھتی ہوئی شرح پر اعتراضات اور نکتہ چینی شروع کر دی۔ اس ضمن میں نجمہ صدیقی رقمطراز ہیں:

> "بعض مہاجرین نے خیمہ بستیوں سے باہر اپنے لیے روزی کمانے کے ذرائع پیدا کیے ہیں۔ یہ زیادہ تر زرعی اور تعمیراتی نوعیت کی مزدوری کرتے ہیں اور مقامی مزدوروں سے کم رقم پر کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے لوگ افغان مہاجر مزدوروں کو مقامی مزدوروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ پشاور اور کوئٹہ کے علاوہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے دیگر شہروں میں مقامی مزدوروں کی بے روزگاری کا معاشی اور سماجی مسئلہ پیدا ہوا ہے۔"(۲۱)

مقامی آبادی اس صورتحال سے پریشان تھی کہ مہاجرین اُن کے کاروبار میں شراکت اختیار کرتے جا رہے تھے جس سے مقامی لوگ نالاں تھے۔ بہت سے مہاجرین نے کیمپ سے باہر رہائش اختیار کی ہوئی تھی، جس کی بنا پر کرائے کے مکانوں کا حصول مقامی آبادی کیلئے مشکل ہونے لگا تھا۔ مہاجرین نے مختلف کاروبار کر کے خود کو خوشحال بنانے کی جدوجہد جاری رکھی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں زمین و جائیداد کے مالک بن گئے۔ اس طرح مکانوں کے کرایوں کے ساتھ ساتھ جائیداد کی قیمتوں میں بھی خوب اضافہ ہوا جس سے پاکستان کی عوام کو اقتصادی سطح پر مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

افغان مہاجرین نے کیمپ میں رہتے ہوئے محض امداد پر اکتفانہ کیا بلکہ مختلف کام کر کے خود کو مستحکم کرنا شروع کر دیا تھا۔ افغانی مہاجر عورتیں گھروں میں قالین بافی کے ساتھ ساتھ سلائی کڑھائی کے کام کرتیں جو اُن کے شوہر، باپ اور بھائی بازاروں میں بیچ آتے۔ رفتہ رفتہ اُنہوں نے اپنی دکانیں بنالیں جس میں اُن کی خواتین کا بنایا ہوا مال فروخت ہوتا، یوں کاروبار میں اُن کے قدم جمتے چلے جا رہے تھے۔ ان تمام عوامل کا احاطہ انیس ناگی نے ناول میں بخوبی کیا ہے۔ جب میجر قربان اپنے اسسٹنٹ شیر گل سے مہاجرین کی پس ماندگی و غربت کا ذکر کرتا ہے تو شیر گل اُسے مہاجرین کی سماجی و کاروباری حیثیت سے آگاہ کرتا ہے۔ "ان کی عورتیں گھروں میں قالین بناتی ہیں، قمیضوں کے گلے بناتی ہیں۔ یہ اتنے غریب نہیں ہیں جتنے نظر آتے ہیں، باہر قصبے میں ان کی دکانیں ہیں، جہاں ہر طرح کا مال مل جاتا ہے۔"(۲۲)

افغان مہاجرین نے ہجرت کے دُکھ اور تکلیفوں کے باوجود اپنے پاؤں پر جلد از جلد کھڑے ہونے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ وہ اپنے گھروں میں بیکار نہ بیٹھے تھے اور نہ ہی اُن کی عورتیں فارغ رہتیں۔ قالینوں کی بُنائی پوری

تن دہی سے کی جاتی اور پھر اُنہیں فروخت کر کے اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے مہاجرین اپنے اخراجات پورے کرتے اور زیادہ سے زیادہ بچت کی کوشش کیا کرتے تھے۔ بظاہر مہاجرین کی حالت انتہائی بری اور غلیظ رہتی، مگر ان کے پاس پیسے اور اسلحے کی کمی نہ تھی۔ انیس ناگی نے مہاجر کیمپ کا جس گہرائی سے مشاہدہ کیا وہ اس ناول میں حقائق کے التزام کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مہاجرین کے خود ساختہ کاروباری ذرائع اور نظام کی جڑیں مضبوط ہوتی جارہی تھیں۔ اس حوالے سے نفیس صدیقی، ایک خیمہ بستی کے سربراہ عبدالباری کا حوالہ اُنہی کے الفاظ میں درج کرتے ہیں: "ہمارے کیمپ میں ایک بھی مہاجر خاندان نہیں جو خوراک، لباس اور دیگر ضروریات کے حصول کیلئے کسی دوسرے کی امداد کا محتاج ہو۔ ہم اپنے لیے آمدنی قالینوں کی خرید و فروخت کے ذریعے پیدا کرتے ہیں۔" (۲۳) مہاجرین نے پاکستان میں رہتے ہوئے ترقیاں کیں، جائیدادیں بنائیں، بہت سے مہاجرین غیر ممالک کو سُدھار گئے۔ جو تعلیم یافتہ تھے اُنہوں نے دوسروں ملکوں میں نوکریاں حاصل کر کے باہر نکل گئے۔ مہاجرین نے اس سارے عمل میں جو کام غلط کیا وہ تھا ناجائز طریقوں سے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ حاصل کرنا جو کہ پاکستان کی سالمیت کے خلاف مہاجرین کا ایک منفی عمل تھا۔ اسد سلیم شیخ کے مطابق: "بعض خوشحال اور متمول مہاجرین نے پشاور اور کوئٹہ کے علاوہ دیگر شہروں میں جائیدادیں خریدی ہیں۔ اس غرض سے انہوں نے ناجائز طریقے سے پاکستان کے شناختی کارڈ اور بعض نے پاسپورٹ بھی حاصل کیئے۔" (۲۴)

میجر قربان، جو وطن سے محبت کرنے والا شخص ہے، اُس کیلئے یہ تمام صورتحال تکلیف دہ ہے۔ وہ کیمپ کا انچارج ہے اور کسی صورت نہیں چاہتا کہ مہاجرین کیمپ سے نکل کر پاکستان میں پھیل جائیں اور پاکستان کی سالمیت کو کسی طرح خطرہ لاحق ہو۔ انیس ناگی کیمپ کے حالات کے پس منظر میں میجر قربان کے ذریعے اُس دور کے تاریخی المیے کو بہت خوبی سے پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ انیس ناگی نے مہاجرین کی ہجرت کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ تاریخ میں ہونے والی ہجرتوں کے دُکھ اس ناول میں بنیاد اور پس منظر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ وہ حالات حاضرہ کا بیان تو کرتے ہیں مگر اُس کے ساتھ تاریخی حوالوں کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔

انیس ناگی نے بہت خوبی کے ساتھ کیمپ اور مہاجرین کے حالات و سرگرمیوں کو بیان کیا ہے اس کے ساتھ مہاجرین کی آمد سے پاکستانی عوام کے ردِعمل کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ پاکستان کی مقامی آبادی نے مہاجرین کے ہر جگہ دخل اور موجودگی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ "میجر قربان کیمپ کے نظم و نسق کے بارے میں جو اقدام لے رہا تھا۔ وہ اس کی منطقکے مطابق درست تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مہاجرین کیمپ سے باہر نکل کر پورے ملک میں پھیل جائیں کیونکہ ان کی شہروں میں کثرت دیکھ کر مقامی لوگوں نے بڑبڑ شروع کر دی تھی۔" (۲۵) تاریخ عالم پر نظر دوڑائی جائے تو تاریخ میں ہمیں ایسی ہجرتوں کا ذکر ملتا ہے جب ایک بڑے پیمانے پر لوگوں نے اپنے وطن کو

جغرافیائی، سیاسی و معاشرتی وجوہات کی بنا پر خیر باد کہا، نقل مکانی نے اُن کے دلوں اور ذہنوں میں عدم تحفظ کے جس احساس کو جنم دیا، اُس احساس کو اُنھی کے بھائی بندوں نے اپنی ہمدردی و محبت سے کسی حد تک کم کرنے کی کوششیں بھی کیں۔ مگر انسان جہاں دوسروں کی مدد کا جذبہ رکھتا ہے وہیں اُس کے ذہن میں پہلا احساس خود کو پہلے محفوظ کرنے اور اپنی بقا اور سالمیت کا بھی اٹھتا ہے۔ انیس ناگی کا یہ ناول ہجرت کی المناک حقیقتوں سے پردہ اٹھاتا ہے، جب انسان اپنے وطن، اپنی جنم بھومی سے جدا ہو کر خود کو ذہنی و جسمانی لحاظ سے تنہا اور خطرات میں گھرا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے تو وہ اپنی بقا کی کوششیں شروع کر دیتا ہے ایسے میں بہت سے معاملات میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ اس وقت انسان کیلئے صحیح اور غلط کی وہ اہمیت نہیں ہوتی جو بالعموم اُس کی پہلے والی زندگی میں ہوا کرتی تھی۔ اُس وقت انسان صرف اپنی اور اپنے خاندان کی بقا اور سالمیت کے بارے میں سوچتا ہے۔ انیس ناگی نے ہجرت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی افغان مہاجرین کی سوچ کی خوب عکاسی کی ہے، مہاجرین کا اولین مقصد بھی اپنی اور اپنے خاندان کی بقا اور سالمیت تھا اور ایسے میں اُنہیں صحیح اور غلط کی پرواہ نہ رہی تھی۔ مہاجرین نے پاکستان میں محض پناہ لینے پر اکتفا نہ کیا تھا بلکہ اپنے قدم اس ملک میں جمانے کی غرض سے مثبت، منفی ہر طرح کا راستہ اپنایا۔ جس سے پاکستان کی حکومت اور عوام کے لیے مسائل نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور جس نیک مقصد کے تحت مہاجرین کو پناہ دی گئی تھی اُس میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ مقامی آبادی نے مہاجرین کے ہر شعبہ زندگی میں عمل دخل پر اعتراضات کرنے شروع کر دیئے تھے۔ مقامی آبادی کا یہ جذبہ کہ مہاجرین مجبور ہونے کی بنا پر مدد و ہمدردی کے مستحق ہیں، اب ماند پڑنے لگا تھا۔ کیونکہ مہاجرین اب مجبور نہیں رہے تھے۔ لہٰذا لوگوں نے مہاجرین کی پاکستان میں روز افزوں بڑھتی شرح کے خلاف آواز اٹھانی شروع کر دی تھی۔ اسد سلیم شیخ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ”صوبہ سرحد اور بلوچستان کے عوام نے افغان مہاجرین کو خوش دلی سے ہر ممکن امداد فراہم کی۔ امداد کی فراہمی کے باوجود مقامی افراد کے سیاسی اور معاشی مفادات مقامی افراد اور مہاجرین کے درمیان تعلقات کو خوشگوار رکھنے یا بگاڑنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ شروع میں سرحد اور بلوچستان کے عوام کی طرف سے مہاجرین کیلئے جس ہمدردی اظہار کیا گیا تھا اُن میں اب وہ جذبہ نہیں رہا۔“(۲۶)

مختلف وجوہات کی بنا پر مقامی لوگوں اور مہاجرین کے درمیان بتدریج بڑھتی خلیج کا اظہار انیس ناگی نے کیا ہے۔ انیس ناگی دورِ حاضر کے حالات کا جائزہ تاریخی عوامل کی آمیزش کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر گزرتا لمحہ تاریخ کا اٹوٹ حصہ بن جاتا ہے۔ تاریخ کا گہرا مشاہدہ اور خارجی و باطنی حوالوں سے اس کا اظہار انتہائی ضروری ہے اور یہ اظہار ہمیں انیس ناگی کی تحریر میں بخوبی نظر آتا ہے۔ مہاجرین نے اپنے رویے سے میجر قربان کو پریشانی میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ وہ کسی قسم کی پابندی کے بغیر کیمپ سے نکل جاتے اور اپنے کاموں کو سر انجام دینے کے بعد لوٹ آتے مگر اس کے باوجود کیمپ میں مہاجرین کی تعداد میں میجر قربان کی سختی کے باوجود تیزی

سے کی واقع ہو رہی تھی جو اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ مہاجرین کیمپ سے نکل کر پاکستان کے مختلف علاقوں میں پھیل رہے تھے اور اپنے ٹھکانے بنا رہے تھے۔ اور یہ صورتحال میجر قربان کیلئے تشویش ناک تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مقامی آبادی میں مہاجرین کے خلاف اشتعال پھیلے اور بھائی چارے اور اخوت کے جذبے کی پامالی ہو۔ تبھی اُس نے کیمپ کے گرد خاردار تاریں لگوانے کا فیصلہ کیا۔ "مجھے یوں لگتا ہے کہ مہاجر یہاں سے نکلنے کی کوشش میں ہیں۔ سنو کل ٹرک بھیجو اور وہاں سے باربڈ وائر منگواؤ اور اسے سارے کیمپ کے گرد لگوادو۔ میں انہیں یوں نہیں نکلنے دوں گا۔"(۲۷)

میجر قربان کا یہ عمل جہاں پاکستان کی بقا کی خاطر تھا وہیں وہ مہاجرین کو کیمپ میں محدود کر کے اُن کی بقا بھی چاہتا تھا۔ اُس کا یہ جذبہ مثبت تھا، اُس کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ جب تک مہاجرین اپنے وطن کو واپس نہیں لوٹ جاتے وہ کیمپ تک محدود رہیں، پاکستان کیلئے کسی قسم کا خطرہ نہ بنیں۔ انیس ناگی نے افغانستان سے مہاجرین کی ہجرت اور پاکستان میں اُن کے قیام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عوامل کی تاریخ کو ناول میں سچائی کے ساتھ سمیٹا ہے۔

مہاجرین کی پاکستان میں آمد ایک بڑے پیمانے پر ہوئی اور اس آمد کا سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مہاجرین کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ اتنے زیادہ مہاجرین کی بحالی اور انتظامات درحقیقت پاکستان کیلئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس سے نمٹنے کیلئے پاکستان کی حکومت نے جو انتظامات ممکن تھے، انہیں عمل میں لایا گیا۔ مگر اس ساری صورتحال میں اہم ترین مرحلہ مہاجرین کی رجسٹریشن کا تھا جو افراتفری میں بروقت نہ کی جا سکی۔ نیز کیمپوں کے گرد کوئی رکاوٹ نہ ہونے کے باعث مہاجرین کو پورا پورا موقع مل گیا کہ وہ جہاں چاہیں آ جا سکتے ہیں۔ امینہ خان، افغان مہاجرین پر تحقیق کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "Afghan refugees have been living in Pakistan for more than three decades, frequently moving across the border." (۲۸)

اسی امر کا بیان انیس ناگی نے ناول میں کیا ہے۔ کسی رکاوٹ اور رجسٹریشن کے بغیر مہاجرین آزادانہ ہر جگہ گھومتے نظر آتے، اپنے کاروبار بڑھاتے، جائیدادیں بناتے اور ناجائز طریقوں سے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوا کر دوسرے ملکوں کا سفر کرتے تھے۔ اس منتشر صورتحال میں میجر قربان کا کیمپ کے گرد خاردار تاریں لگوانا انہیں شدید مشتعل کر گیا۔ آزادی سے گھومنے پھرنے والوں کیلئے یہ پابندی ناقابل قبول تھی۔ میجر قربان کے خلاف بڑھتی نفرت نے مہاجرین کی ذہنیت اور سوچ کو آشکار کر دیا تھا۔ مہاجرین کسی قسم کی پابندی کے روادار نہ تھے۔ اُنہیں شروع سے پاکستان میں جو آزادی ملی، اُس کا انہوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اب جب میجر قربان انہیں کیمپ تک محدود رکھنا چاہتا تھا تو وہ میجر کے جانی دشمن بن گئے تھے۔ کیمپ میں مقیم بااثر مہاجرین میجر کو قتل کرنے کے منصوبے تشکیل

دینے لگے۔ تبھی جب ایک روز میجر قربان معمول کے مطابق کیمپ کے جائزے کیلئے نکلا تو اسے اپنے پیچھے مہاجرین کا جتھا آتا نظر آیا۔ "کچھ قدم چلنے کے بعد میجر قربان نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو تین چار سو مہاجر چادریں اوڑھے اور سیاہ پگڑیاں پہنے ہوئے دبے پاؤں چل رہے تھے۔ میجر قربان نے خطرے کو بھانپتے ہوئے اپنے گن مین کو کہا کہ وہ کلاشنکوف کا میگزین چڑھالے۔"(۲۹) میجر قربان کی نیت صاف تھی۔ وہ مہاجرین کے حوالے سے کسی بھی قسم کا متعصب رویہ نہ رکھتا تھا بلکہ وہ انہیں اور اپنے ملک کو آنے والے خطرات سے بچانا چاہتا تھا اور اس میں وہ حق بجانب تھا۔ کیمپ میں ہونے والی غیر معمولی حرکات کی اطلاع وہ دارالخلافہ پہنچانے کی سعی کرتا مگر وہاں سے اُسے خاطر خواہ جواب نہ ملتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حکام بالا کو کیمپ کی کسی بھی غیر معمولی صورتحال سے بے خبر رکھے۔ مگر اس کی بات کوئی سننے والا نہ تھا۔

> "اس نے کئی مرتبہ ٹیلیفون پر دارالخلافہ میں بات کرنے کی کوشش کی لیکن دارالخلافہ کا ٹیلیفون ہمیشہ خراب رہتا، اس نے بین الاقوامی ایجنسی کے حکام سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس پر اسے یہ جواب ملا کہ وہ وہی کچھ کرے جس کی اسے ہدایت کی جاتی ہے۔ یہ سن کر میجر قربان ایک دم مشتعل ہو گیا۔" اس کا مطلب ہے کہ انہیں ہر ایک چیز کی آزادی ہے؟"(۳۰)

حُکامِ بالا کے بے فکر اور لاتعلقی پر مبنی غیر ذمہ دارانہ رویے پر انیس ناگی نے کڑی چوٹ کی ہے۔ انیس ناگی نے بطور کمشنر، کیمپ کے نظم و نسق کے سلسلے میں بااثر افراد کے جس لااُبالی طرزِ عمل کا جائزہ لیا، اُسے اپنے تاریخی شعور کی بنیاد پر ناول کا حصہ بنایا۔ پاکستان کی تاریخ میں ایسے بہت سے حالات و واقعات آتے، جب حکام بالا کی معاملات سے چشم پوشی، کڑے نتائج کا باعث بنی اور جن کا اثر ملک و ملت کے مستقبل پر پڑا۔ اسی قسم کے رویوں نے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے جدا کر دیا۔ انہی غیر ذمہ دارانہ رویوں کے باعث پاکستان کو مارشل لا کے بھیانک ادوار دیکھنے پڑے، جس کے نتیجے میں انسان عدم تحفظ کا شکار ہوئے، طمع اور لالچ نے دلوں میں گھر کیا، منافقت و نفسانفسی کی فضا نے انسانی اقدار کو بری طرح پامال کیا، مفاد پرستی پر مبنی یہی رویے حکام بالا کی حقیقت کو سامنے لانے کا باعث بنے اور ان تمام عوامل نے مل کر نقصان کیا تو صرف انسان اور انسانیت کا اور غیر انسانی معاشرہ کا جنم ہوا۔

انیس ناگی اس ناول میں ایسے ہی بے ضمیر افراد پر طنز کرتے ہیں جنھوں نے اپنے مفادات کی خاطر کیمپ میں ہر طرح کی مجرمانہ سرگرمیوں کی اجازت دے رکھی تھی۔ انہیں ملک کے تباہ و برباد ہونے سے قطعاً غرض نہ تھی وہ اپنی غرض کے غلام تھے۔ افغان مہاجرین کی پشت پناہی کرنے والوں کا نیٹ وارک بہت مضبوط تھا۔ تبھی ایک افغانی مہاجر، میجر قربان سے کیمپ میں بے جا پابندی نہ کرنے کی دھمکی آمیز سفارش کرتا ہے۔ "آپ نے کیمپ میں اور اس سے باہر چوکیاں بٹھادی ہیں، ہمارا سارا مال اسی راستے سے آتا ہے۔ آپ گھبرائیں نہ ہماری لائن اوپر سے نیچے تک ملی ہوئی ہے، وگرنہ ہمیں کون کام کرنے دیتا۔۔۔ہم ہر مہینے آپ کی خدمت کے لیے تیار ہے، ہمیں فری

ہینڈ چاہیئے۔"(۳۱)چونکہ افغان مہاجرین ہر طرح کے کاروبار میں دخیل تھے اور ہر کاروبار زندگی میں انہوں نے اپنی جگہ تیزی سے پیدا کی تھی۔ اس لیے پاکستان کی معیشت پر افغانیوں کے سبب خاطر خواہ اثر پڑا تھا۔ اور پاکستانی مارکیٹ میں کاروبار کی شرح میں اضافہ ہوا۔ افغانیوں نے کاروبار میں اپنی حیثیت بنانے کے لیے مختلف اقدامات کیے، ان اقدامات کے لیے جہاں کچھ لوگوں کو ناراض کرنا پڑتا ہے وہیں بہت سے لوگوں کو خوش کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ افغانیوں کو مقامی مارکیٹ میں اپنی جگہ بنانے کیلئے انہیں بڑے بڑے لوگوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ جن کے سبب افغان مہاجرین کو فری ہینڈ ملا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے پاکستان میں پھیل بھی رہے تھے اور کھل کر کاروبار بھی کر رہے تھے۔ کیمپ میں مہاجرین کی آزادانہ نقل و حرکت پر پابندی لگنے کا نقصان محض مہاجرین کو ہی نہیں تھا بلکہ اُن کی پشت پناہی کرنے والے اُن لوگوں کو بھی تھا جو کاروباری منافع میں شراکت دار تھے۔ تبھی جب میجر قربان مہاجرین کی مشکوک سرگرمیوں کی اطلاع اوپر پہنچاتا اُسے خاطر خواہ جواب نہ ملتا تھا۔ بلکہ اوپر والوں کی طرف سے قطعی لا تعلقی کا اظہار کیا گیا اور میجر قربان کو بھی تمام معاملات سے لاتعلق رہ کر مہاجرین کو پابند نہ کرنے کا حکم ملا مگر میجر قربان ایسی لاتعلقی و بے حسی کا مظاہر نہ کر سکا جو اُس کے وطن کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔ افغان مہاجرین نے پاکستانی مارکیٹ میں کپڑے اور الیکٹرونکس کے کاروبار میں اپنی ساکھ کو مضبوط کر لیا تھا، اس کاروبار میں وہ خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ انور ہاشمی کے مطابق:

"Refugees had control over cloth and electronics market." (۳۲)

مہاجرین "فری ہینڈ" حاصل کرنے کیلئے میجر قربان کو رشوت دے کر خریدنا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ اس پر حکام بالا کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا کہ وہ افغان مہاجرین کو آزادی کے ساتھ کیمپ سے اندر باہر آنے جانے کی آزادی دے، اُن کی سرگرمیوں سے لاتعلق رہے۔ اپنا کام کرے اور انہیں اپنا کام کرنے دے۔ انیس ناگی ناول میں افغان مہاجرین کے حالات وواقعات کا بخوبی جائزہ پیش کر کے قارئین کو تاریخی سچائیوں سے آگاہ کرتے ہیں، ماضی کی حقیقی صورت گری اس ناول کا خاصہ ہے۔

انیس ناگی مہاجر کیمپ کے ایک اور مسئلے کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں، کیمپ میں ہر طرف گندگی کے ڈھیر تھے جن کے درمیان رہنے والے مہاجرین کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہر طرف گندگی اور غلاظت کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ مہاجرین اپنی حالت کی طرف زیادہ دھیان نہ دیتے۔ اُن کے جسم اور لباس سے بدبوؤں کے بھبھکے اُڑتے۔ اپنی صفائی وستھرائی پر مہاجرین قطعاً توجہ نہ دیتے اور یہی مخدوش حالت کیمپ کی بھی بنی ہوئی تھی۔ افغان مہاجرین کے کیمپ میں پاکستان نے انسانی بنیادوں پر مہاجرین کو بنیادی انسانی سہولتیں مہیا کیں۔ اُن کیلئے خیمہ بستیاں بسائی گئیں۔

بیت الخلاء تعمیر کیے گئے۔ تا کہ کیمپ میں صحت وصفائی کا انتظام بر قرار رکھا جاسکے۔ یونیسف UNICEF کی رپورٹ کے مطابق:

> "حکومت پاکستان نے یونیسف UNICEF کی مدد سے مختلف منصوبوں کے تحت ۱۹۸۳ء تک باجوڑ ایجنسی میں ۵۰۰۰ اور کرم ایجنسی میں ۳۰۰۰ بیت الخلاء تعمیر کیے۔ اس کے علاوہ مختلف کیمپوں میں مزید ۹۰۰۰ بیت الخلاء ۱۹۸۴ء میں تعمیر کیے گیے۔ صحت وصفائی کے انتظام کو بہتر بنانے کیلئے یونیسف UNICEF نے مختلف ٹیمیں تشکیل دی ہیں۔"(۳۳)

حکومت نے اپنی طرف سے مہاجرین کی بہتری اور صحت کیلئے ہر ممکن اقدامات کیے مگر ان سہولتوں سے صحیح معنوں میں مہاجرین نے فائدہ نہ اُٹھایا۔ انیس ناگی نے ناول میں کیمپ کی جو حالت بیان کی، وہ انتہائی مخدوش تھی۔ جس سے انسانی زندگیوں کو شدید خطرہ لاحق ہونے کا امکان تھا۔ میجر قربان کیمپ کے دورے پر نکلا تو اسے کیمپ میں ہر طرف مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ مکھیوں کے جھنڈ کے جھنڈ گندگی کے ڈھیروں پر منڈلا رہے تھے۔ جو کہ لمحہ فکریہ تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں مکھیوں کا حملہ انسانی جانوں کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا تھا۔

> "ابھی جیپ کچھ ہی دور چلی تھی کہ اُسے مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دی، اس نے دائیں طرف دیکھا تو خار دار تاروں سے دور مہاجرین نے ایک کھلے میدان کو مذبح خانہ بنایا ہوا تھا جس میں کافی تعداد میں گائے یا کسی مویشی کا خون بکھرا ہوا تھا اور جس کے پاس اس کی آنتیں اور غلاظت کے ڈھیر تھے جن پر مکھیوں کا ایک لشکر بھنبھنا رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر انسانی فضلے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ان پر مکھیوں کے یلغار تھی۔"(۳۴)

کیمپوں میں ہزاروں کی تعداد میں بیت الخلاء تعمیر کیے جانے کے باوجود انسانی غلاظت کھلے میدانوں میں ڈھیر تھی۔ اس کے علاوہ وہی میدان مذبح خانے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا اور خون اور آنتیں ہر طرف ڈھیر تھی اور اس ساری گندگی کے باعث کیمپ میں مہاجرین کی صحت وزندگی خطرہ تھا جو کہ مکھیوں کے لشکر کی صورت میں سامنے تھا۔ میجر قربان کو شدید خطرے کا احساس ہوا۔ "Absent Afghans" کے ایک آرٹیکل میں افغان مہاجرین کے کیمپ کی صورتحال پر تبصرہ ملتا ہے:

> "Health conditions within refugee camps are simply in human, Human waste is everywhere, there is no proper sewage system. Health care is unseen." (۳۵)

انیس ناگی معاشرے کی کڑوی حقیقتوں کے نباض اور نقاد کا کردار نبھاتے ہیں۔ جو معاشرے کے بھیانک چہرے سے نظریں چرانے کی بجائے پورے حوصلے اور بے باکی کے ساتھ اُس چہرے سے نقاب اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ معاشرے کے وہ پہلو جو انسانیت کا سر جھکنے پر مجبور کر دیں، جب انسانی جان کی وقعت دو کوڑی کی ہو جائے

، انسان مجبوریوں کے باعث بنیادی انسانی سہولتوں اور معیار زندگی کو ترسنے لگیں، اُس وقت انیس ناگی کا شعور تاریخ کے المیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہوئے اپنی تحریروں کے ذریعے ہمارے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ افغان مہاجر کیمپ میں انیس ناگی نے بذات خود انسانوں کو انتہائی تکلیف دہ زندگی گزارتے دیکھا۔ ایسی جگہ جہاں شاید جانور بھی نہ رہ پائیں۔ انیس ناگی نے مہاجرین کو ایسی جگہ پر زندگی سے لڑتے بھڑتے دیکھا۔ انیس ناگی کا تاریخی شعور ان تمام حقیقتوں کو سمیٹ کر ناول کا حصہ بناتا ہے۔ مہاجرین کیلئے کیمپ میں حکومت کی طرف سے فراہم کردہ سہولتیں وقت کے ساتھ ساتھ کم ہونے لگیں تھیں۔ مہاجرین کا بوجھ پاکستان پر برسوں سے قائم تھا اور وقت کے ساتھ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ لہذا کیمپ کا جو انتظام اور خوراک کی فراہمی ابتدا میں تھی، اب اُن میں خاطر خواہ کمی واقع ہونے لگی تھی۔ جس کی بنا پر کیمپ میں صحت وصفائی کے مسئلے بھی پیدا ہونے لگے۔ جس کا شکار سب سے پہلے کیمپ میں موجود بچے اور عورتیں ہوئیں۔ ناول میں انیس ناگی غلاظت وگندگی کے باعث کیمپ میں پیدا ہونے والے مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ میجر قربان کے خدشے کے مطابق وبا کا آغاز ہو گیا تھا، جب ہر طرف انسانوں اور جانوروں کی غلاظت پھیلی ہوئی ہو تو ایسی وباؤں کا پھیلنا تعجب کی بات نہیں۔ تبھی میجر قربان چلاتے ہوئے اپنے اسسٹنٹ کو ہدایات جاری کرتا ہے۔ "دیکھو ڈاکٹروں کو میرا پیغام دو، یہ ریڈ الرٹ ہے، آسمان سے مکھیوں کا لشکر نیچے اتر رہا ہے، ان میں ہر طرح کی مکھیاں شامل ہو سکتی ہیں جن سے کیمپ میں وبا پھیل سکتی ہے۔ مہاجرین کو بھی اطلاع دے دو کہ ان سے مقابلے کیلئے تیار ہو جائیں۔"(۳۶)

وبا کے باعث کیمپ میں ہنگامی صورتحال کا اعلان کر دیا گیا۔ کیمپ میں قائم ہسپتال میں ڈاکٹروں کو میجر قربان نے ہدایات جاری کر دیں۔ کیمپ میں بیماریاں پھیلنے لگی تھیں۔ صحت وصفائی کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دینے کے باعث مہاجرین پر بیماریاں حملہ آور ہو رہی تھیں۔ مہاجرین نے "صفائی نصف ایمان ہے" میں چھپی حکمت کو قطعاً فراموش کر دیا تھا۔ ایک طرف کیمپ کی حالت مخدوش تھی، دوسرا مہاجرین بھی صفائی کا قطعاً خیال نہ رکھتے تھے۔ جس سے ہزاروں افراد مختلف بیماریوں میں مبتلا ہونے لگے۔ اس کا اندازہ "Absent Afghans" کے آرٹیکل سے ہوتا ہے:

"Diarrhea frequently claims thousands of children within refugee camps." (۳۷)

میجر قربان نے ہنگامی بنیادوں پر کیمپ میں وبا سے نمٹنے کے اقدامات شروع کر دیے۔ اس نے کیمپ کے لوگوں کو اپنے تمام کپڑے اکھٹے کرنے کو کہا اور اس کے بعد اُن تمام کپڑوں کو آگ لگا دی۔ کپڑوں میں آگ لگنے سے فضا میں دھواں بھرنے اور بالآخر آسمان کی طرف بلند ہونے لگا، جس سے گھبرا کر مکھیوں کا لشکر اوپر کی طرف اٹھنا شروع ہوا اور آخر کار غائب ہو گیا۔ میجر قربان کی حکمتِ عملی سے وقتی طور پر مکھیوں سے چھٹکارا پالیا گیا تھا۔ وبا کی

اطلاع میجر قربان نے دارالخلافہ بھجوا دی جس کے نتیجے میں ایک وفد آیا جو کیمپ کی صورتحال کا بہ نفس نفیس جائزہ لینے کی بجائے محض کاغذی کاروائی کر کے چلا گیا۔ انیس ناگی حکام بالا کے رویوں پر کڑی چوٹ کرتے ہیں۔"جناب ہمیں اپنے علاج کیلئے بہتر دوائیاں اور ماہر ڈاکٹر چاہئیں۔۔۔اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو پھر علیحدگی کا ہسپتال بنانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہم پہلے ہی علیحدگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم اچھوت تو نہیں ہیں؟"(۳۸)دارالخلافہ سے آئے وفد نے کیمپ میں بیماروں کو دیکھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ جو لوگ غیر ملکی تھے وہ ایشیائیوں کی بیماریوں سے خوف زدہ تھے اور اُن کے ساتھ ساتھ وفد میں شامل ایشیائی لوگ بھی اُن کے ہم خیال تھے۔اُن کے نزدیک کیمپ میں بسنے والے اچھوت تھے اور اُنہیں بھی بیمار کر سکتے تھے۔اُنہوں نے علیحدگی کے ہسپتال بنانے کی ہدایات دیں کہ مہاجرین کے چند گھروں کو کاغذوں میں علیحدگی کے ہسپتال ظاہر کر دیا جائے گا تاکہ کاغذی کاروائی پوری کی جا سکے، جس پر میجر قربان اُن کی بے حسی پر بھڑک اُٹھا۔کیمپ میں بنیادی ضرورت ماہر ڈاکٹروں اور دوائیوں کی تھی جو فراہم نہ کی گئیں، اس پر میجر نے غصے سے چلا کر کہا کہ ہم اچھوت نہیں، جو حکام بالا کیمپ کے لوگوں سے غیر انسانی رویہ روا رکھے ہوئے ہیں۔ انیس ناگی کا تاریخی شعور انہیں حقائق کے انکشاف پر اکساتا ہے۔ تاریخ میں اچھوتوں کے ساتھ کیا جانے والا ظالمانہ سلوک انہیں کیمپ میں مہاجرین کے ساتھ ہوتا دکھائی دیا۔ جو انیس ناگی کی برداشت سے باہر ہے۔ انیس ناگی کا لہجہ طنز کی کڑواہٹ سے لبریز ہو جاتا ہے جب کبھی وہ اپنے ارد گرد بے حسی اور انسانیت کے استحصال کا دور دوراں دیکھتے ہیں۔

افغان مہاجرین کیلئے میجر قربان کی طرف سے کی جانے والی تمام کوششیں بے سود ثابت ہو رہی تھیں۔ دارالخلافہ کی طرف سے بھی کوئی خاطر خواہ جواب موصول نہ ہوتا اور نہ ہی کیمپ میں موجود مہاجرین میجر قربان کی کوئی بھی بات سننے اور ماننے کو تیار تھے، اُنہیں میجر قربان اپنی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ محسوس ہو رہا تھا اور وہ اُسے راستے سے ہٹانے کے عملی منصوبے پر غور کرنے لگے تھے۔ میجر قربان کو اُس کے قریبی لوگوں نے مہاجرین کے ارادے کی اطلاع بھی دی اور ہوشیار رہنے کو بھی کہا۔ مگر میجر قربان خود بھی اپنی زندگی سے تنگ آ چکا تھا۔ اس نے تمام عمر تنہا اور اکیلے گزاری تھی۔ ازدواجی زندگی کا سکون نہ دیکھا تھا نہ پیشہ ورانہ زندگی نے اس کے دل و دماغ پر اچھی یادیں ثبت کیں۔ کیمپ میں بھی اُسے ایسے حالات نہ ملے جن کی یادوں کے سہارے وہ اچھی زندگی گزار پاتا۔ انیس ناگی نے میجر قربان کے کردار کے ذریعے ہماری توجہ تاریخ کے محب وطن لوگوں سے لے کر زمانہ حال تک کے جاں نثاروں کی جانب دلائی ہے۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ انتہائی نایاب اور انمول رتن زمانے کی ٹھوکروں کی نذر ہو گئے۔ معاشرے نے ایسے لوگوں کی قدر نہ کی، یہاں تک کہ وہ خاک میں جا ملے، میجر قربان کا انجام بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ میجر قربان اپنی کلاشنکوف لے کر کشتی میں سوار ہو کر دریا کی ایک سمت روانہ ہو گیا۔ موٹر بوٹ تیزی سے پانی کو

چیرتی چلی جارہی تھی۔ اچانک میجر نے اپنی کلاشنکوف کا ٹریگر دبا کر چاروں سمت برسٹ مارنے شروع کر دیا، وہ ایک ہیجا نی و اضطراری کیفیت میں مبتلا تھا۔ میجر قربان کے ٹریگر دبانے کی دیر تھی کہ دریا کے آس پاس جھاڑیوں میں سے گولیوں کی بوچھاڑ میجر کی کشتی کی سمت بڑھی، آج دشمنوں کو موقع مل گیا تھا اپنی راہ کے کانٹے کو راستے سے ہٹانے کا ۔ناول کا اختتام میجر قربان کی دردناک مورت پر ہوتا ہے۔

> "اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد وہ موٹر بوٹ۔۔۔ دریا کے کنارے جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی پائی گئی۔ اس میں میجر قربان کی جمے ہوئے خون میں لاش اکڑی ہوئی تھی۔ بعض کا خیال تھا کہ میجر قربان نے نفسیاتی دباؤ کے تحت کلاشنکوف سے خودکشی کر لی تھی۔ لیکن وہ لوگ جو کیمپ کے حالات سے واقف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میجر قربان کو قتل کر دیا گیا تھا۔"(۳۹)

انیس ناگی کے بیشتر ناولوں کے مرکزی کرداروں کا اختتام اُن کی دردناک موت پر ہوتا ہے۔ جب وہ معاشرے کی غلط کارروائیوں کو برداشت کرنے کی قوت کھو بیٹھتے ہیں تو بالآخر زندگی کے آگے ہاتھ کھڑے کر کے گویا یہ اعلان کرتے نظر آتے ہیں کہ معاشرے کی ناجائز کارروائیوں کو مٹانا اب اُن کے بس کی بات نہیں۔ معاشرہ اس حد تک بگاڑ کا شکار ہو چکا ہے کہ اُسے سدھارنا محض فرد واحد کا کام نہیں۔۔۔ معاشرے کی بقا اسی چیز میں ہے کہ جب معاشرے کا ہر فرد اپنی ذمہ داریوں کو سمجھے اور بخوبی پورا کرے اور اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو معاشرے سے میجر قربان جیسے محب وطن لوگ ختم ہوتے چلے جائیں گے۔

ناول کیمپ میں انیس ناگی نے افغانستان جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کو بخوبی بیان کیا ہے۔ افغانستان میں جنگ کے باعث لاکھوں مہاجرین ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے، پاکستان نے مہاجرین کی بھرپور کفالت کی اور اسلامی بھائی چارے کا ثبوت دیا۔ غیر ممالک نے بھی مدد کا ہاتھ بڑھایا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ مہاجرین کا بوجھ برداشت کرنا غیر ممالک کے ساتھ ساتھ پاکستان کیلئے بھی مشکل ہوتا گیا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ افغان مہاجرین نے پاکستان کیلئے سیاسی، سماجی واقتصادی نوعیت کے مسائل پیدا کرنے شروع کر دیے جس نے پاکستان کی سالمیت اور عالمی سطح پر اُس کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچایا۔ افغان مہاجرین کی نسلیں تک پاکستان میں پیدا ہوئیں، پلی بڑھیں مگر اُنہوں نے ہر ممکن طریقے سے پاکستان کی جڑیں کاٹیں اور اسے نقصان پہنچایا۔ اس کے ساتھ ساتھ انیس ناگی نے ہجرت و جلاوطنی کے تاریخی المیے کو بھی ناول میں خوب سمیٹا ہے۔ وطن سے دوری، پردیس میں اجنبیت کا احساس دوچند کر دیتی ہے۔ اس حقیقت کا انیس ناگی بخوبی علم رکھتے ہیں اور ناول میں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ انیس ناگی کے ناول اُن کے باریک بیں مشاہدے کے عکاس ہیں۔ اس ناول میں انیس ناگی نے حقائق کا بیان تاریخ کی صداقتوں کو مقدم رکھتے ہوئے کیا ہے۔ انیس ناگی کا تاریخی شعور اس ناول میں وضاحت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ انیس ناگی کیلئے تاریخ نہ ہی محض ماضی کا حوالہ ہے اور نہ ہی گزرے ہوئے واقعات کی بازگشت، انیس ناگی تاریخ

کو ماضی، حال اور مستقبل کی کڑیوں سے اس طرح ملاتے ہیں کہ ہمیں ماضی کا شعور، حال کا تجزیہ اور مستقبل کا بہتر ادراک کرنے میں مدد ملتی ہے۔ انیس ناگی تاریخ کو محض سنی سنائی کہانی نہیں سمجھتے بلکہ اپنے شعور کی بنیاد پر کڑے انداز میں تنقیدی حوالوں سے پرکھتے ہیں۔ جس کی بنا پر اُن کے ناول جہاں تاریخ کی سچائیوں کو بھرپور طریقے سے بیان کرتے ہیں، وہیں اُن کے تاریخی شعور کے بھی بھرپور عکاس ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،(لاہور:جمالیات،۲۰۰۵ء)،ص۳۲۲۔

۲۔ ایضاً،ص۳۲۷۔

۳۔ ایضاً،ص۳۲۷۔

۴۔ ایضاً،ص۳۲۸۔

۵۔ Israel Finkelstein, "The last Labayu: King Saul and the expansion of the first North Israelite Territorial Entity." edited by Yaira Amit, Ehud, Bin Zvi, Israel Finkelstein_and_Oded_Lipschits,171-187.(Eisenbrauns,2006) aleph.nli.org.li>RMB01.000468308.html.

۶۔ https://en.m.Wikipedia.org>wiki>Afghana.

۷۔ "Humanitarian Assistance programme for Afghan Refugees in Pakistan" National (2016). https://pakobserver.net/ccar-to-brief-senate-on-afghan-refugees.

۸۔ اسد سلیم شیخ،افغان مہاجرین: ایک جائزہ(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۹ء)،ص۱۰۴۔

۹۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۳۳۲۔

۱۰۔ ایضاً،ص۳۳۵۔

۱۱۔ ایضاً،ص۳۵۰۔

۱۲۔ refugee camps Absent Afghans[online]. last modified December 20,2017. https://sites.google.com>site>
lfie within refugeescamps.

۱۳۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص۳۴۷۔

۱۴۔ ایضاً،ص۳۴۹۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۳۱۔

۱۶۔ Bhabani sen Gupta,"The Afghan Syndrome"*Arabia Newsweek*,10 January 1982;(London:Croom Helen,1982),P.142. https://www.arabianews.com

۱۷۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)، ص ۳۳۳۔

۱۸۔ Anwar Hashmi, "Afghans Refugees Camps:big problem for Pakistan" ,*The fact* ,no.4(2004).https://www.fact.com.pk.

۱۹۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)، ص ۳۴۶،۳۴۵۔

۲۰۔ اسد سلیم شیخ،افغان مہاجرین: ایک جائزہ، ص ۱۴۰۔

۲۱۔ Najma Sadeque"Afghan Refugees what when the Aid stops?"*Dawn*, (24 June 1983). https://najmasadeque.wordpress.com.

۲۲۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)، ص ۳۴۵۔

۲۳۔ نفیس صدیقی، "افغان مہاجرین کا مسئلہ اور پاکستان" مشمولہ جنگ(روزنامہ)،(لاہور: ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۴ء)، ص ۷۰۔

۲۴۔ اسد سلیم شیخ،افغان مہاجرین:ایک جائزہ، ص ۱۴۰۔

۲۵۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)، ص ۳۴۳۔

۲۶۔ اسد سلیم شیخ،افغان مہاجرین:ایک جائزہ، ص ۱۴۲۔

۲۷۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)، ص ۳۴۳۔

۲۸۔ Amina Khan,"Afghan Refugees in Pakistan"(Institute of Strategic studies, March 07, 2017),Pg.03. accessed March07,2017, Final-IB-Amina-dated-07-03-3.pdf_web:issi.org.pk.

۲۹۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)، ص ۳۴۲۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۴۳۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۳۹۰،۳۸۹۔

۳۲۔ Anwar Hashmi, "Afghans Refugees Camps:big problem for Pakistan." *The fact*,no.4(2004).https://www.fact.com.pk.

۳۳۔ UNICEF Assistance to Afghan Refugees in Pakistan (Pakistan UNICEF,1994),P.14.

۳۴۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص ۳۲۶۔

۳۵۔ refugee camps Absent Afghans[online]. https://sites.google.com

۳۶۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص ۳۶۳،۳۶۲۔

۳۷۔ refugee camps Absent Afghans[online]. https://sites.google.com

۳۸۔ انیس ناگی،فصیلیں(چار ناول)،ص ۳۷۷۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۴۰۳۔

ماحصل

پوری دُنیا میں ادب کی جڑیں عمیق تر اور اسکی وسعتیں لا محدود ہیں۔ صدیوں سے ادب انسان کے جذبات و احساسات کو اپنے اندر بخوبی سمیٹتا آیا ہے۔ ادب میں یہ خوبی ہے کہ یہ انسان کی ذہنی و جذباتی اُتار چڑھاؤ کے نتیجے میں جنم لینے والی کیفیات کو اپنے اندر جذب کر کے امر کر دیتا ہے۔ اردو کے نثری ادب میں ابتدا میں انسان نے داستانوں کو تخیل و حقیقت کے ملاپ کے ساتھ اپنے خیالات کے مفصل اظہار کا ذریعہ بنایا۔ داستانوں کی طوالت نے ذہن و دل میں اُمڈتے خیالات کے سیل رواں کا بخوبی اعادہ کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان نے شعوری ترقی کرتے ہوئے دُنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ انسان کی ظاہری و باطنی ترقی نے جہاں دُنیا کے ہر شعبے میں تبدیلی پیدا کی وہاں ادب، جو ہمیشہ سے سماجی اُتار چڑھاؤ کا شاہد رہا ہے، کے رُجحانات اور اظہار کے زاویے بھی تبدیل ہوئے۔

ناول کے آغاز نے لوگوں کے رُجحان اور توجہ کو داستانوں کی ضخامت سے ناول کے توازن کی طرف مبذول کرنا شروع کیا۔ وقت کے دھاروں کے ساتھ بہتے ہوئے زمانے کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے ناول کی بنیادیں مضبوط ہوتی گئیں۔ برسوں سے زندگی کے ہر شعبے سے متنوع و رنگارنگ موضوعات ناول میں اظہار کا درجہ پاتے رہے ہیں۔ ان موضوعات میں سے ایک بڑا اور وسیع موضوع تاریخ کا ہے۔ تاریخ، جو ماضی کے واقعات کا آئینہ، حال کا جائزہ اور مستقبل کی پیش گوئی سے عبارت ہے، کو دنیا بھر کے اُدباء نے اپنے ناولوں میں برتا اور تاریخ کو زندہ کیا۔

زیرِ بحث تحقیقی مقالہ میں تاریخ، تاریخی شعور و تاریخی ناول نگاری کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے بعنوان "انیس ناگی کے ناولوں میں تاریخی شعور: تحقیقی و تنقیدی جائزہ بحوالہ خصوصی: فصــیلیں (مجموعہ چار ناول) موضوع سے بحث کی گئی۔ انیس ناگی کے دیگر ناول شاملِ تحقیق نہیں تھے۔ اس موضوع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو تحقیق طلب مسئلہ سامنے آیا وہ یہ تھا کہ انیس ناگی نے اپنے ناولوں میں تاریخ کی سفاکیوں کو کس طرح اور کس انداز میں پیش کیا ہے؟ نیز انیس کے بیان کردہ تاریخی حقائق اصل سے مماثل ہیں یا مختلف؟ مسئلے کا تحقیقی و تنقیدی حوالے سے جائزہ مجوزہ تحقیقی کام کا ہدف مقرر کیا گیا۔ اس تحقیقی مسئلے کے پیش نظر مفروضہ قائم کیا گیا تھا کہ انیس ناگی کے ناولوں میں بیان کردہ تاریخ حقیقت پر مبنی تاریخی شعور فراہم کرتی ہے۔ زیرِ تحقیق مسئلے کے حل اور قائم کردہ مفروضے کی جانچ اور پرکھ کے لیے جو سوالات تحقیق سامنے رکھے گئے، وہ یہ تھے کہ انیس ناگی کا تصورِ تاریخ کیا ہے؟ انیس ناگی کے تاریخی شعور کا اظہار کس انداز میں ہوتا ہے؟ نیز انیس ناگی کا تاریخی شعور، سماجی و سیاسی شعور کو کیسے متاثر کرتا ہے؟

ان تحقیقی سوالات کے پس منظر میں جو بنیادی مقاصد تھے وہ یہ کہ ان سوالات کے جوابات کے حصول کے ذریعے انیس ناگی کا تصورِ تاریخ معلوم کیا جائے نیز انیس ناگی کے ناولوں میں تاریخی عناصر کو تلاش کر کے اُن کے تاریخی

شعور کو جانچا جائے۔ تحقیقی موضوع کے مسئلے، مفروضے، سوالات اور مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے باب اوّل بعنوان "اُردو ناول میں تاریخی شعور: ایک جائزہ" میں آغاز میں تاریخ کی تعریفات کو مختلف انسائیکلوپیڈیا، ویکیپیڈیا اور مورخین کی آرا کو مدِ نظر رکھ کر پیش کیا گیا۔ تاریخ، ماضی کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے ماضی کی تہذیبوں اور ثقافتوں کو زندہ کرتی ہے۔ ماضی میں جو اہم واقعات اور عظیم سانحات پیش آئے جس کے اثرات دُنیا نے حال اور مستقبل میں بھی جھیلے، وہ واقعات تاریخ کے ذریعے امر ہو گئے۔

تاریخ نے ہمارے اسلاف کے کارنامے ہم تک پہنچائے ہیں، جن کو سمجھ کر بعد میں آنے والی نسلوں نے اپنے حال، اور مستقبل کو سنوارا۔ نیز ماضی کی غلطیوں کا اعادہ بھی تاریخ میں ملتا ہے جن پر غور کر کے حال اور مستقبل کو بہتر بنانے کی سعی بھی نظر آتی ہے۔ ماضی کے افراد کی معاشی و معاشرتی، سیاسی و مذہبی زندگی کا عکس تاریخ میں جھلکتا ہے۔ ہر انسان کے اندر جستجو کا مادہ موجود ہوتا ہے جو انسان کو عہدِ گزشتہ کے بارے میں جاننے، گزرے دور کے لوگوں کے رہن سہن، خوراک، لباس، رسم ورواج، زبان اور تہذیب و تمدن کو کھوجنے پر اکساتا ہے۔ گزرا ہوا دور ہمیشہ سے باعثِ کشش رہا ہے۔ یہ کھوج، یہ کشش تاریخ کے جھروکوں میں جھانک کر تسکین کا درجہ پالیتی ہے۔ ماضی کے حوالے سے معلومات تاریخ کے خزانے میں بہ آسانی مل جاتی ہیں۔ تاریخ کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ علوم انسان کی یہ طویل و ضخیم داستان برس ہا برس سے لکھی جارہی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ضخامت میں اضافہ ہو تا جارہا ہے۔

جب دُنیا میں تحریر کی ابتدا ہوئی تو وہ گویا تاریخ کی ابتدا کا نقطۂ آغاز تھا۔ کاغذ پر منتقل ہونے سے پہلے تاریخ نے مختلف دھاتوں، لکڑی کے ٹکڑوں اور چمڑے پر اپنی جگہ بنائی۔ تاریخ کو مختلف حوالوں سے محفوظ کرنے کا خیال انسان کو ادراک اور شعور کے درجے پر فائز ہونے کے بعد سب سے پہلے آیا ہو گا۔ دنیا میں اپنی سالمیت اور بقا کی خاطر انسان نے اپنے ماضی کو یاد رکھنا ضروری خیال کیا کیونکہ تاریخ تبھی ہمارے حال اور مستقبل کی راہوں میں روشنی پھیلا سکتی ہے جب ہم اُسے یاد رکھتے ہیں۔ تاریخ کو بیان کرتے ہوئے مورخ کا فرض ہے کہ وہ مکمل غیر جانبداری برتتے ہوئے تعصب کے اظہار سے ہر حال میں پرہیز کرے نیز اپنے خیالات اور تبصروں کو تاریخ میں شامل کرنے سے احتراز برتے ورنہ تاریخ کے مسخ ہونے کا پورا پورا احتمال رہتا ہے۔ تاریخ کا سچائی کے ساتھ بیان حقیقت پر مبنی تاریخی شعور فراہم کرتا ہے۔ مختلف حوالوں اور ماہرین کی آرا کی روشنی میں تاریخی شعور کے مختلف مُباحث پر غور کرنے سے تاریخی شعور کو سمجھنے میں مدد ملی۔ ماضی، حال، اور مستقبل کو آپس میں پیوست کر کے ہی تاریخی شعور کو بنیاد فراہم کی جاسکتی ہے۔ تاریخی شعور حقائق کا مکمل اور درست سمت میں ادراک اور آگاہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ انسان کی علمی کیفیت ہے کہ وہ ماضی کو اُس کے حقائق کے ساتھ سمجھ کر حال کا تجزیہ اور مستقبل کا لائحہ عمل طے کرتا ہے۔ تاریخی

شعور کی تعمیر میں ماضی کے حوالوں کو درست سمت میں سمجھنا ضروری ہے جب ایک شخص تاریخ اور تاریخی حوالوں کو درست سمت میں سمجھ کر اپنے اندر جذب کرتا ہے تو اس عمل میں ہر فرد کے داخلی و خارجی رجحانات دوسرے فرد سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ ہر شخص ماضی، حال اور مستقبل کے تعلق کی تفہیم اپنی شخصیت، مزاج، خیالات اور سوچ کے مطابق کرتا ہے۔ اسی بنا پر ہر فرد انفرادی تاریخی شعور کا حامل ہوتا ہے۔ تاریخی شعور کی بنیاد محض ماضی کو قرار دینا درست نہیں، ہر ماضی اپنے نقوش آنے والے وقت پر ثبت کرتا چلا جاتا ہے۔ تاریخی شعور کے بننے میں پہلی سیڑھی موروثی حوالے ہیں۔ آباؤاجداد سے ملنے والا تاریخ کا علم، بڑے بوڑھوں سے سنے گئے ماضی کے قصے پہلی سطح پر ہمارے تاریخی شعور کی تعمیر کرتے ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری سیڑھی تعلیمی درسگاہوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ کی کتب ہیں جو ہمیں ذہنوں میں تاریخ کی بنیادیں مضبوط کرتی ہیں۔

تاریخ کو اس کے زمان و مکان کی روشنی میں دیکھنا، تعصب سے پاک تاریخی شعور کی بنیادی شرط ہے۔ تاریخی شعور کیلئے تاریخ کو ہر دور کے مخصوص حالات کے تناظر میں رکھ کر دیکھنا ضروری ہے۔ تاریخی شعور کا اظہار مختلف تناظرات میں ہوتا آیا ہے۔ ادب میں تاریخی شعور کا اظہار داستان، افسانہ، ناول ڈرامہ، شاعری، تھیٹر وغیرہ کے ذریعے ہوتا آرہا ہے۔ تاریخی فکشن میں ماضی کے سانحات، نامور شخصیات و غیر معمولی واقعات کو اُدباء نے ادب میں اظہار کا درجہ دے کر امر کر دیا۔ تاریخی ناولوں میں تاریخ کا موضوع بہت کامیابی سے برتا گیا۔ عالمی ادب میں تاریخ کے حوالے سے بہترین و شاہکار تحریریں لکھی گئیں۔ یونان، جاپان، یورپ، برطانیہ، امریکہ، فرانس، غرض ہر جگہ اور ہر دور کے بہترین لکھاریوں نے ادب بالخصوص ناول میں ماضی کو زندہ کر کے ادب اور تاریخ کے باہمی تعلق کو مزید گہرا کر دیا۔ اُردو ناول کی روایت بھی تاریخی ناول نگاری کے ذکر سے خالی نہیں۔ ناول نگاری کے پہلے دور میں مولوی نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعے اپنے دور کی معاشرتی و سیاسی تاریخ کو زندہ کیا۔ ناول کے فنی تقاضوں پر پورا نہ اُترنے کے باوجود مولوی نذیر احمد کے ناول اُن کے تاریخی شعور کے بھرپور عکاس ہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنے فن کے ذریعے لکھنوی تہذیب و معاشرت کے زوال کی تاریخ بہت خوبی سے رقم کی۔ فسانہ آزاد میں سرشار نے مزاح کے پیرائے میں تاریخ کے ورق کھولے ہیں۔

اردو کی تاریخی ناول نگاری میں عبدالحلیم شرر کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ اُنہوں نے اپنے ناولوں میں اسلامی تاریخ کو زندہ کر کے مسلمانوں میں جوش و جذبہ پیدا کرنے کی بھرپور سعی کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں زوال کے بعد مسلمانوں کو عبدالحلیم شرر جیسے ناول نگار کی ضرورت تھی۔ عبدالحلیم شرر اپنے فن کے ذریعے قارئین کی امیدوں پر پورا اُترے۔ محمد علی طیب نے بھی عبدالحلیم شرر کی پیروی میں اسلامی تاریخ کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ مُصورِ غم علامہ راشد الخیری نے اسلامی تاریخ سے مختلف موضوعات کو چُن کر اردو ادب کی تاریخی ناول نگاری میں اپنا حصّہ

ڈالا۔ صادق حسین صدیقی سردھنوی نے تاریخی واقعات، مسلمانوں کی فتوحات اور اسلامی شخصیات کو اپنے ناولوں میں بخوبی پیش کیا۔

اُردو ادب کے رومانوی ادیبوں میں سے اے حمید کا نام قابل ذکر ہے جنھوں نے تاریخی ناول تحریر کیے اور تاریخ کے مختلف موضوعات کو اظہار کا درجہ دیا۔ ترقی پسند ادیبوں میں پریم چند کا نام قابل ذکر ہے جنھوں نے ہندوستان کی سماجی اور معاشرتی تاریخ میں ہندوستانی طبقاتی نظام، سماجی نا انصافیوں، انسانی حقوق کی پامالی، کسان کا جاگیر دار کے ہاتھوں استحصال اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم جیسے موضوعات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ پریم چند کے ناول اُن کے دور اور معاشرے کی تہذیبی و سماجی تاریخ کے بھرپور اور بہترین عکاس بن کر سامنے آتے ہیں۔

تاریخی ناول نگاری کے ضمن میں نسیم حجازی کا نام نمایاں نظر آتا ہے جنھوں نے اسلامی تاریخ کے ساتھ ساتھ قیام پاکستان کے بعد فسادات و مختلف حالات و واقعات کو موضوع بنایا اور مسلمانوں کا رشتہ اپنی تاریخ سے گہرا کرنے کی بھرپور سعی کی۔ قیام پاکستان کے واقعہ نے ادیبوں کی سوچ اور طرز تحریر کے ساتھ ساتھ موضوعات میں بھی واضح تبدیلی پیدا کی۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد لکھے گئے بیشتر ناولوں میں جذباتیت کا اُبال، واضح طور پر دیکھنے کو ملا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جیسے جیسے جذبات کا طوفان تھما ویسے ویسے ناول کے طرز ادا میں بھی اعتدال پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ ایم اسلم نے تاریخی ناول لکھنے کا آغاز قیام پاکستان سے قبل کر دیا تھا۔ اسلامی تاریخ میں مسلمان فاتحین، غزوات اور قیام پاکستان کے بعد فسادات کو ناول کا موضوع بنایا۔ ان کے ناولوں میں جذبات کا غلبہ رہا۔ رشید اختر ندوی نے بھی فسادات کو موضوع بناتے ہوئے قیام پاکستان کے بعد کے تاریخی حالات و اقعات میں مسلمانوں کو ہر طرح سے مظلوم دکھایا۔ رئیس احمد جعفری کے تاریخی ناول قیام پاکستان کے حوالے سے فسادات کو موضوع بناتے ہوئے اُن کے جذباتی بہاؤ کے عکاس نظر آتے ہیں۔ قیسی رام پوری نے ۱۹۴۷ء کی ابتر صورتحال کی جذباتی تصویر پیش کی۔ رامانند ساگر نے ہندو مسلم فسادات کی بھرپور منظر کشی کر کے اُس دور کے تاریخی المیے کو موضوع بنایا۔ قدرت اللہ شہاب نے فسادات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی غیر انسانی صورتحال کا ذمہ دار صرف ہندوؤں کو ہی نہیں مسلمانوں کو بھی ٹھہرایا۔ *یا خُدا* میں اس کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ عزیز احمد کے ناول اُن کے تاریخی شعور کے بھرپور عکاس ہیں۔ اُنہوں نے اپنی تحریروں میں تہذیبی، ثقافتی و تاریخی عوامل کا بیان بہت خوبی سے کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر اپنے آپ میں ایک عہد کا درجہ رکھتی ہیں۔ اُنہوں نے ہندوستان کی اڑھائی ہزار سالہ تاریخ کو اپنے ناول *آگ کا دریا* میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اُن کے ناول ہندوستان کی تہذیبی، معاشی و معاشرتی تاریخ کی بہترین نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا تاریخی شعور اُن کے علمی و فکری شعور سے مُزین ہے۔ احسن فاروقی نے اپنے ناولوں میں اودھ کی زوال آمادہ تہذیب کی تاریخ کا نوحہ بیان کیا ہے۔ ہندوستان کی تہذیب و

معاشرت اور سیاست کے رنگ ان کے ناولوں کی خوبی ہیں۔ فضل کریم فضلی نے بنگال کے جان لیوا قحط میں تڑپتے بلکتے لوگوں کی المناک تاریخ کو موضوع بنایا۔ سماجی، سیاسی و معاشرتی حقائق کا نوحہ عبداللہ حسین کے ناولوں کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُن کے ہاں قیام پاکستان سے قبل کے حالات کے ساتھ قیام پاکستان کے بعد کی صورتحال بھی بخوبی پیش کی گئی ہے۔

خدیجہ مستور نے فسادات کو براہِ راست موضوع بنانے کی بجائے قیام پاکستان کے حوالے سے اُٹھنے والی تحریک اور اُس دور کی معاشرتی تاریخ کو موضوع بنایا۔ اُن کے ناول اُن کے تاریخی شعور کی بخوبی ترجمانی کرتے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے تاریخی کرداروں کے ذریعے مسلم تاریخ کو اپنے فکروفن کی آمیزش کے ساتھ بہت خوبصورتی سے پیش کیا۔ حیات اللہ انصاری نے برصغیر کی سیاست، معاشرت و تاریخ کو موضوع بنایا۔ الطاف فاطمہ نے قیام پاکستان اور سقوط ڈھاکہ کی تاریخ کو ناول کے پیرایہ میں بیان کیا۔ رشیدہ رضویہ کا تاریخی شعور اُن کے ناولوں میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ پاکستانی سیاست کے حقائق کا بیان اُن کے فن کی خوبی ہے۔

اُردو کی تاریخی ناول نگاری کی روایت کا جائزہ لینے کے بعد باب اوّل کے اختتام پر تحقیق کا طریقہ کار واضح کیا گیا۔ انیس ناگی کے فصیلیں میں شامل چار ناولوں، ایک گرم موسم کی کہانی، قلعہ، چوہوں کی کہانی اور کیمپ میں تاریخی حوالوں کا جائزہ لینے کے بعد تجزیاتی فریم ورک کی بنیاد پر انیس ناگی کے تاریخی شعور کو جانچا گیا۔ رابرٹ تھارپ نے ۲۰۱۴ء میں جارن روسن، کلاس گورن کارنس اور پیٹرسی سائیکس کی تحقیقات کی روشنی میں افراد کا تاریخی شعور معلوم کرنے کے ضمن میں تجزیاتی فریم ورک تشکیل دیا۔ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی فرد نے اپنی تحریر میں تاریخ کے کس نوعیت کے حوالوں (وجودیت، سیاست اور سائنس وغیرہ) کو کیسے استعمال کیا ہے۔ اگر تاریخ کو روایتی انداز میں بیان کیا ہے تو فرد کا شعور روایتی تاریخی شعور کہلاتا ہے۔ اگر مثالی انداز میں بیان کیا ہے تو فرد مثالی تاریخی شعور کا حامل ہوتا ہے۔ تنقیدی انداز میں تاریخ کا بیان کرنے والا فرد تنقیدی تاریخی شعور کا حامل ہوتا ہے جبکہ وراثتی انداز میں تاریخ کو قلم بند کرنے والا فرد وراثتی تاریخی شعور کا حامل کہلاتا ہے۔ انیس ناگی کے ناولوں میں تاریخی حوالوں کی نوعیت اور اظہار کے طریقہ کار کا جائزہ لینے کے بعد انیس ناگی کے تاریخی شعور کو جانچا گیا۔

باب دوم میں انیس ناگی کے ناول ایک گرم موسم کی کہانی میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات، بغاوت کے اسباب اور انقلابیوں کی پسپائی کے تاریخی المیے کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول کے آغاز میں مرکزی کردار جاوید کو ایک مقبرہ نما عمارت میں ۱۸۵۷ء کے تاریخی ریکارڈ کی حفاظت کے کام پر یہ کہہ کر معمور کر دیا جاتا ہے کہ تاریخی ریکارڈ میں قطعاً کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ تاریخی ریکارڈ کی حفاظت پر معمور عملہ بے ایمان ہے۔ اُن کی پشت

پناہی ملک کے طاقتور افراد کر رہے ہیں جو تاریخی سچائیوں کو چھپانا چاہتے ہیں، جنہیں چھپا کر سیاسی مقاصد حاصل کیے جا رہے ہیں۔ جبکہ جاوید تاریخی حقائق کو سامنے لانا چاہتا ہے۔ اُس کے نزدیک ۱۸۵۷ء کا تاریخی ریکارڈ یک طرفہ سچ دکھاتا ہے۔ اس کوشش میں وہ تاریخی ریکارڈ کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے ۱۸۵۷ء کے دور میں جا پہنچتا ہے۔

انیس ناگی قاری کو ماضی میں لے چلتے ہیں۔ لاہور کی سیاسی و سماجی زندگی کا عکس ناول میں اُبھر کر آیا ہے۔ انگریزی عمل داری میں ایشیائیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہندو، سکھ، مسلم سبھی انگریز کے ظلم و ستم کا شکار بنے ہوئے تھے۔ جبر و استبداد کے خلاف آواز اُٹھانے والوں کو انگریز توپ کے آگے باندھ کر اُڑا دیا کرتے۔ عوام میں انگریز کے کسی بھی عمل کے خلاف بولنے کی جرات ختم ہو چکی تھی۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر انگریز کی طرف سے ملنے والے وظیفے پر قانع تھا۔ اس کے علاوہ اُس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ ناول کا مرکزی کردار بہادر علی، جو انگریزی فوج میں صوبیدار میجر تھا، اور اُس کا بیٹا دلاور علی، مایوسی کے اندھیروں میں ڈوبی عوام کے درمیان اُمید کی کرن کی مانند ہیں۔ جو ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے اور جہاد کرنے والے ہیں۔ انگریز کا سلوک فوج میں ایشیائی سپاہیوں کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز اور ظالمانہ تھا۔ فوج میں گائے اور سور کی چربی کے کارتوسوں نے بغاوت کی آگ بھڑکا دی۔ انقلاب کی لہر میں چند لوگوں نے انقلابیوں کا ساتھ دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ خود غرض و لالچی افراد نے انگریز کی طرف سے انعام اکرام کے وعدے پر انقلابیوں کی مُخبری کرتے ہوئے انتہائی بُزدلی کا ثبوت دیا۔ بہادر علی، دلاور علی، اور مولوی حسام الدین کی جہادی کوششیں اپنوں کی سازشوں کے باعث دم توڑ گئیں مگر ایسے باہمت و بے غرض لوگوں نے قومی بقا کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ تاریخی اعتبار سے انیس ناگی کا یہ ناول خصوصی اہمیت و حیثیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں انیس ناگی کا تاریخی شعور اُن کے فکر و فن کے متوازن ملاپ کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ انیس ناگی نے اس ناول میں ۱۸۵۷ء کے عہد سے سیاست کے حوالوں کو استعمال کیا ہے جس سے ۱۸۵۷ء کے دور کی سیاسی صورتِ حال کُھل کر سامنے آئی ہے۔ ناول میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے اسباب و واقعات کو کہانی کے تانوں بانوں میں بُن کر بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ چند فرضی کرداروں کے علاوہ تاریخ کے حقیقی کرداروں کو انیس ناگی نے مکالموں اور رویوں کے ذریعے اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اُن کا تاریخی شعور ہمارے سامنے واضح ہو کر آتا ہے اور اُن کے تاریخی نظریات سے بھی کماحقہ آگاہی ہوتی ہے۔

ناول میں ۱۸۵۷ء کا تاریخی ریکارڈ مقبرہ نما عمارت میں دفن دکھایا گیا ہے۔ جیسے مُردوں کو دفنا کر اُن سے جڑے تمام حقائق و عوامل کو گویا دفن کر دیا جاتا ہے۔ انیس ناگی نے تاریخ سے وابستہ اسی المیے کو بیان کیا ہے۔ انیس ناگی نے مُلک کے بااثر طبقے پر گہرا طنز اور چوٹ کی ہے۔ ایسے لوگ جن کے بزرگوں نے ماضی میں ملکی و اجتماعی فائدے پر اپنے فائدے کو ترجیح دے کر ملک کی بقا و سالمیت کو شدید اور ناقابل تلافی نقصان پہنچایا، آج بھی ایسے مُلک دشمن

کردار اپنے فائدے کے لیے مُلک کی جڑوں کو کاٹ رہے ہیں اور ساتھ ساتھ اس کوشش میں بھی سرگرداں ہیں کہ اُن کی حقیقت، اُن کا ماضی کسی کے سامنے آشکار نہ ہونے پائے۔ اُن کا احتساب نہ ہو تاکہ اُن کے ماضی کے ساتھ ساتھ اُن کا مستقبل بھی محفوظ رہے اور اُن کی آئندہ آنے والی نسلیں بھی مُلکی اثاثوں کو اپنی ملکیت سمجھ کر استعمال کر سکیں۔ لہٰذا تاریخی حقائق کو چھُپا کر رکھنے میں ہی بااثر طبقے کی عافیت ہے۔

انیس ناگی نے ناول میں ایسے افراد کے چہروں سے نقاب اُٹھائے ہیں اور ایسا کرنے میں انیس ناگی کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ تبھی انیس ناگی نے ناول میں ایسے افراد کی طرف توجہ دلائی ہے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریز کے ہاتھوں مراعات اور دولت کے لالچ میں آزادی بیچ کر بخوشی غلامی خریدی۔ اور جنگ آزادی میں انقلابیوں کی مُخبری کر کے جدوجہدِ آزادی کو ناکام بنا کر انگریز سے انعام و اکرام وصول کیئے جو صرف اُنہیں ہی نہیں بلکہ اُن کی نسلوں تک کو فائدے پہنچا گئے۔ مختلف تاریخی کتب سے انیس ناگی کے بیان کردہ حقائق کی سند فراہم ہوتی ہیں۔ تاریخ میں ایسے نوابین اور اعلیٰ طبقے کے حالات سامنے آتے ہیں جنھوں نے اپنے مُلک اور ہم وطنوں کے ساتھ غداری کا ثبوت دیا۔

۱۸۵۷ء کے دور میں انگریزی حکومت کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے ساتھ ناروا سلوک کو انیس ناگی نے کرداروں، مکالموں اور ناول کی مجموعی فضا کے ذریعے سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہندوستان کی عوام کی دگرگوں حالت کے ضمن میں بادشاہ کے کردار پر ناول میں مختلف مقامات پر بار بار چوٹ کی گئی ہے۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر انگریز کا وظیفہ خوار، محض کٹھ پتلی بادشاہ تھا جسے مُلک اور عوام کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ تاریخ کی کتابوں میں بہادر شاہ ظفر کے کردار پر ہندوستان کی ابتر حالت کے پس منظر میں شدید اعتراضات اٹھائے گئے ہیں۔ بادشاہ کو اپنے عیش و آرام اور تماشوں سے فرصت ملتی تو وہ عوام کی دادرسی کرتا۔ ایسی صورتحال میں انگریز کو عوام کے ساتھ ہر طرح کے سلوک کی پوری آزادی میسر تھی۔ اسی بنا پر انیس ناگی نے تاریخ کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ اُن کی غلطیوں کا خمیازہ ماضی میں عوام نے بھگتا اور آج بھی بااثر افراد کے فیصلے عوام کی زندگیوں کو اذیت ناک بنا رہے ہیں اور عوام اُن کے غلط فیصلوں کو برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ماضی میں ہمارے حکمرانوں نے جس قوم کو اپنی سرزمین پر قدم رکھنے کی اجازت دی، اُس قوم نے ہمارے حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی کا جلد ہی احساس کر کے ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے اور ایک وقت آیا کہ حکمرانوں کا تاج انگریز کی ٹھوکروں میں آگیا۔

انیس ناگی نے انگریز کی تشکیل کردہ فوج میں ایشیائی سپاہیوں کی دگرگوں حالت کا تذکرہ سچائی کے التزام کے ساتھ کیا ہے۔ گورے سپاہیوں کو جو تنخواہ اور مراعات ملتی تھیں۔ کالے سپاہیوں کو اُس کا آدھا بھی نہ ملتا۔ مگر محنت اُن

سے دو گنا وصول کی جاتی۔ انگریز کالے سپاہیوں بالخصوص مسلمانوں سے شدید خطرہ محسوس کرتے اور اُن سے ہر لمحہ خبر دار رہتے۔ فوج میں چربی کے کارتوسوں کی آمد نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو شدید ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس حوالے سے انگریز کے خلاف آواز اُٹھانے میں پہلا نام منگل پانڈے کا تھا، جس کا انگریز نے فوری طور پر سدباب کیا۔ مگر بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ انیس ناگی نے تاریخ کی سچائیوں کو ناول میں خوب سمیٹا ہے۔ تاریخ کی کتب میں ۱۸۵۷ء میں بغاوت کے اسباب میں سب سے بڑا سبب چربی کے کارتوس کو ٹھہرایا گیا جس کے سبب ہندوستان کی سبھی قومیں انگریز کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گئیں سوائے غداروں کے ایک مخصوص طبقے کے جن کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ تاریخ میں جدوجہد آزادی کے آغاز کا ایک اور سبب انگریز کا ہندوستان میں عیسائیت کا پرچار بھی تھا۔ جس کے خلاف ہندوستان میں جہاد کی لہر اُبھری۔ چربی کے کارتوس کے خلاف فوج میں اٹھنے والی بغاوت کی آگ پورے مُلک میں پھیل گئی مگر غیر منظم جہاد اور انقلاب کی لہر کو انگریز نے بزورِ قوت کُچل دیا۔ انیس ناگی نے ۱۸۵۷ء سے متعلق حقائق کے ضمن میں مستند حوالوں کو بنیاد بناتے ہوئے اپنے باطن کی سچائی اور جذبات کی گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اُس دور کا تاریخی منظر نامہ اُبھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

فرضی کرداروں کی ناول میں موجودگی حقائق کو مسخ کرنے کی بجائے حقیقی کرداروں کے ساتھ مل کر ماضی کے حالات وواقعات کو زیادہ وضاحت سے پیش کرتی ہے۔ ناول کا عنوان ایک گرم موسم کی کہانی اُس مخصوص دور کی منتشر و مخدوش حالت کا نوحہ اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ انیس ناگی کا تاریخی شعور ۱۸۵۷ء کے عہد کے سیاسی وسماجی شعور کو بہتر طور پر سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ تجزیہ کے نکات کی رو سے ناول میں موجود تاریخی حوالوں کی نوعیت ۱۸۵۷ء کی سیاسی اتار چڑھاؤ کشمکش اور انقلاب کی جدوجہد سے متعلق ہے۔ جسے انیس ناگی نے تحقیق وتنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر سچائی کے ساتھ نبھایا ہے۔ اس تحقیق کے نتیجے میں یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ انیس ناگی کا تاریخی شعور تنقیدی نوعیت کا حامل ہے کیونکہ اُن کے ناول میں موجود تاریخی حوالے اصل سیاق وسباق سے متعلق اور مماثل ہیں۔ اور یہی نکتہ تنقیدی تاریخی شعور کی بنیاد ہے۔

باب سوم میں ناول قلعہ میں انیس ناگی نے ۷۰ سے ۸۰ کی دہائی میں پاکستان بالخصوص لاہور میں بدعنوانی و کرپشن کے دور دورے کو موضوع بنایا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار دارا، جو ایک ایماندار بیوروکریٹ آفیسر ہے، وہ ایک مدقوق وخستہ حال عمارت، جو قلعہ کے نام سے مشہور ہے، میں بیٹھا سارا دن لوگوں کی جھوٹ پر مبنی کہانیاں سنتا رہتا اور کسی بات کا اعتبار نہ کرتا۔ قلعہ کا سارا عملہ بدعنوان ہے جو لوگوں سے رشوت لے کر لاہور میں فالتو زمینوں اور قیمتی پلاٹوں کی ناجائز الاٹمنٹ کے کاغذات بناتا ہے مگر دارا اُن فائلوں اور کاغذات پر دستخط کرنے سے انکاری ہے۔ ماتحت عملے کے ساتھ ساتھ اُس کے افسران بالا بھی اس کرپشن کا حصہ ہیں بلکہ دارا کو بھی وہ اس کرپشن میں

شامل ہونے کی ترغیب دیتے ہیں مگر دارا اپنی سروس میں ہر طرح کی بدعنوانی سے دور رہتا ہے اور یہی عمل اُس کا سب سے بڑا جرم بنا دیا جاتا ہے۔ دارا کے اوپر جھوٹے الزمات لگا کر اُسے ملازمت سے گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ حکامِ بالا کے اس عمل کا دارا پر گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ معاشرے سے بدلہ لینے کی ٹھان لیتا ہے اور ایسا کرنے کے لیئے دارا بدعنوان معاشرے اور کرپشن زدہ نظام کا ایک حصہ بن جاتا ہے اور بالا آخر غلط ہتھکنڈوں سے الیکشن میں جیت کر مخالفین کو نیچا دکھا کر آسودگی محسوس کرتا ہے۔ انیس ناگی کا یہ ناول پاکستان کی تاریخ میں کرپشن و بدعنوانی سے بھرے معاشرے کے لیے تازیانہ ہے۔ بیوروکریسی نے قیام پاکستان کے بعد سے ہی ملک میں اپنے قاعدے قانون بنا کر ہر محکمے میں اپنا اثر و نفوذ قائم کرنا شروع کر دیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ محکمہ ملک کی جڑوں میں اترتا چلا گیا اور ہر محکمے میں ملازمتوں اور عہدوں کے حوالے سے اقربا پروری کی بنیاد پر اپنوں کو خوب نوازا۔ انیس ناگی خود ایک بیوروکریٹ رہے لہٰذا اس محکمے کی بد انتظامی اور بدعنوانی کا مشاہدہ اُنہوں نے انتہائی قریب سے کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انیس ناگی نے متروکہ جائیداد کے محکمے میں بھی اپنے فرائض سرانجام دیئے۔ انیس ناگی ایک نڈر اور بے باک شخصیت کے مالک تھے اُنہیں سچائی کا سامنا کرنے اور اُس سچ کو سب کے سامنے ظاہر کرنے میں ذرا باک نہ ہوتا تھا۔ اس ناول میں اُنہوں نے تاریخ کی انہی سچایوں کو بے باکی سے بیان کیا ہے۔

انیس ناگی نے ۱۹۷۷ء میں ضیاء الحق کے مارشل لاء کی جبریت اور اس کے خلاف آواز اُٹھانے والوں کو اپنی موت آپ مرتے دیکھا۔ تاریخ کی سفاکیت کو انیس ناگی نے اپنے باطن میں محسوس کیا جس کی گونج اس ناول میں سنی جا سکتی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء کی سختی کے باوجود اہل اقتدار اور بااختیار افراد نے لاہور میں فالتو زمینوں اور پلاٹوں پر ناجائز قبضہ کیا ہُوا تھا۔ لوگوں میں زمین کی ہوس اور لالچ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں میں ایک بے چینی اور عدم تحفظ کا ایسا احساس تھا جو شاید زیادہ سے زیادہ زمین پر قبضہ کر کے ہی ختم ہو سکتا تھا مگر لوگوں کی ہوس اور طمع کی کوئی حد نہ تھی۔ مارشل لا کی سختی اور گرفت میں ایماندار لوگ پس رہے تھے۔ احتساب کے وقت بدعنوان افسر اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے قانون کی گرفت سے صاف بچ جاتے اور سختی ماتحت افسران کو برداشت کرنی پڑتی۔ تاریخ کی ان کڑوی سچائیوں کا اعادہ انیس ناگی نے بہت خوب کیا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد سے مکانوں کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں مہاجرین کے ساتھ ساتھ مقامی افراد نے بھی کوششیں شروع کر دیں۔ لوگوں نے اپنے حق سے زیادہ لینے کی ہوس میں ناجائز ہتھکنڈے استعمال کر کے اُس مشکل وقت میں بھائی چارے و انسانی ہمدردی کے جذبے کو بری طرح پامال کیا۔ انیس ناگی کے والد کو لاہور میں مہاجرین کو مکانوں کی الاٹمنٹ کی ذمہ داری سونپی مگر مہاجرین کے ساتھ ساتھ اپنے افسران کی طرف سے انہیں ہوس و لوٹ کھسوٹ کے وہ مظاہرے دیکھنے کو ملے جس نے انسانیت کا سر شرم سے جھکا دیا۔ اس کے باوجود کاروائیاں اور افسران

بالا کی سختی انیس ناگی کے والد کے حصّے میں آئی کہ وہ ایماندار تھے۔ پاکستان کی تاریخ کے دردناک باب انیس ناگی کے ناول میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جنھوں نے اس مُلک کو مستحکم ہی نہ ہونے دیا۔ نیکی، بدی کی جنگ میں بدی کی جیت ناول کا مرکزی نکتہ ہے۔ ناول میں بیان کردہ تاریخی حوالے انیس ناگی کے تنقیدی تاریخی شعور کے عکاس ہیں۔ پاکستان کی سیاست کے تاریخی حوالوں کے بیان میں انیس ناگی نے ہر حال میں سچائی کو ملحوظ خاطر رکھا ہے جسکی بنا پر یہ ناول انیس ناگی کے تنقیدی تاریخی شعور کا بھرپور اظہار ہے۔

باب چہارم میں ناول چوہوں کی کہانی میں ۱۹۹۴ء میں ہندوستان کے شہر سورت سے دیگر شہروں میں پھیلنے والی طاعون کی وبا، جس نے انسان سے زیادہ انسانیت کا قتل عام کیا، کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک میونسپل افسر ہے جو پاکستان سے اجازت نامہ لیے بغیر ہندوستان کے شہر سورت جا پہنچتا ہے۔ وہاں بھی وہ اپنی اصل شناخت چھپاتا ہے۔ سورت میں گندگی و غلاظت کے باعث طاعون کی وبا پھیل رہی ہے جسکی بنا پر شہر سے باہر جانے کے راستے بند کر دیے جاتے ہیں۔ میونسپل افسر کو سورت کی پولیس حراست میں لے کر تشدد کے ذریعے اُس سے یہ اُگلوانا چاہتی ہے کہ وہ اقرار کرے کہ وہ پاکستانی ایجنٹ ہے جو اپنے جسم میں طاعون کے جراثیم لے کر آیا ہے تاکہ ہندوستان میں طاعون کی وبا پھیلا سکے۔ اس نفرت و شک کی بنا پر سمجھوتہ ایکسپریس کو بھی بند کر دیا گیا اور ہندوستان کی انتظامیہ اس الزام کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے ایک سینئر ڈاکٹر شنکر پر میونسپل افسر کے جسم میں طاعون کی جراثیم داخل کرنے لیے دباؤ ڈالتی ہے مگر ڈاکٹر شنکر ایسا غیر انسانی فعل کرنے سے صاف انکار کر دیتا ہے بلکہ اُسے خفیہ طریقے سے پاکستان بھجوا کر انسانیت کا سربلند کر دیتا ہے۔ مگر پاکستان واپس آنے کے بعد میونسپل افسر کو شکوک و شبہات اور ہتک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُسے اپنوں نے ہی نفرت و حقارت کا نشانہ بنایا۔

انیس ناگی کا یہ ناول ہندوستان و پاکستان کے ظاہری و باطنی تعلقات کے تضاد کی بہترین نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ انیس ناگی نے اٹل تاریخی سچائیوں کو ناول کے پیرائے میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ دونوں ملکوں کے لوگوں کے اصل چہرے کھُل کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں ہندوستان کے شہر سورت میں طاعون کی وبا کا آغاز ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے ہندستان کی کئی ریاستوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

سورت شہر کے ہسپتالوں کے عملے نے بے قابو ہوتی ہوئی صورتحال کے پیش نظر فرار میں عافیت سمجھی۔ سیاحوں نے ہندوستان کا رخ کرنا چھوڑ دیا، جس سے ہندوستان کی معیشت کو شدید نقصان پہنچا اور عالمی سطح پر ہندوستان کی سماجی ساکھ متاثر ہوئی۔ ہندوستان نے وبا کی ذمہ داری پاکستان پر یہ کہہ کر ڈال دی کہ پاکستان کی خفیہ ایجنسیاں سمجھوتہ ایکسپریس کے ذریعے ہندوستان میں چوہے بھیج رہی ہیں۔ سمجھوتہ ایکسپریس، جسے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کی بہتری و مضبوطی کے لیے چلایا گیا تھا، کو بند کر کے دونوں اطراف کی انتظامیہ نے ایک دوسرے کے

خلاف تعصب و نفرت کا ثبوت دیا۔ وبا کی آڑ میں دونوں ملکوں نے اپنے سیاسی عزائم کے حصول کی خاطر ایک دوسرے پر الزام تراشی کی۔ اخبارات میں ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد جنم لینے والی نفرت کی جڑیں پاکستان و ہندوستان میں مضبوطی سے پھیل چکی ہیں۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد دونوں ملک ایک دوسرے سے سیاسی، سماجی و معاشی و مذہبی کسی بھی حوالے سے سمجھوتہ نہ کر پائے۔ انیس ناگی نے ہندوستان و پاکستان کی مشترکہ تاریخ کی کڑواہٹوں کو ناول میں حقائق کے التزام کے ساتھ بغیر کسی تعصب و کینہ کے بیان کیا ہے۔ میونسپل افسر اور ڈاکٹر شنکر کو انیس ناگی نے انسانیت اور امن کا علمبردار دکھایا ہے۔ اس ناول میں انیس ناگی نے ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ کے سیاسی حوالوں کو غیر جانبدارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ تاریخ کو بیان کرتے ہوئے انیس ناگی محقق کے ساتھ ساتھ نقاد کا فرض بھی خوب نبھاتے ہیں۔ ناول میں انیس ناگی کے تاریخی نظریات اُن کے تاریخی شعور کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

باب پنجم میں ناول کیمـــــــپ میں پاکستان میں قائم کردہ افغان مہاجرین کے کیمپوں کی تکلیف دہ زندگی نیز جرائم پیشہ افراد کا کیمپوں کی آڑ میں پاکستان کو نقصان پہنچانے کی سازش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افغانستان میں سوویت فوج کے قبضے اور جنگ کے باعث ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۳ء تک تقریباً ۳۰ لاکھ کے قریب افغان مہاجرین پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ ناول میں افغان مہاجرین کے ایک کیمپ کو دکھایا گیا ہے جس کا انچارج ایک ریٹائرڈ میجر قربان ہے جو سخت گیر انسان ہے۔ وہ مہاجرین کی نقل و حرکت پر گہری و کڑی نگاہ رکھتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ مہاجرین کیمپ سے نکل کر پاکستان میں پھیل جائیں۔ اس سے مقامی آبادی میں انتشار پھیلنے کا خدشہ تھا۔ جبکہ مہاجرین نے اپنی بہتری اور دفاع کا اپنا نظام بنایا ہوا تھا۔ وہ کیمپ اور کیمپ سے باہر ہر جگہ پر اپنی من مانی چاہتے تھے۔ کیمپ میں مشکوک سرگرمیوں کے باعث میجر قربان کی طرف سے کی جانے والی سختی نے مہاجرین کو میجر قربان سے مزید بدظن کر دیا۔ کیمپ میں مہاجرین کی بہتری لیے کی جانے والی میجر قربان کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہو رہی تھیں کیونکہ مُلک کے کچھ بااثر افراد مہاجرین کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ میجر قربان مہاجرین کے ساتھ ساتھ حکام بالا کی راہ کا کانٹا بنا ہوا تھا جسے انہوں نے میجر قربان کی خودکشی کا رنگ دے کر اپنے راستے سے ہٹا دیا۔

انیس ناگی نے اس ناول میں افغانستان جنگ کے نتیجے میں پاکستان میں پناہ لینے والے مہاجرین کی ہجرت کے باعث پیدا ہونے والی عدم تحفظ کی کیفیت و جلاوطنی کے دُکھ کو بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ تقریباً ۳۰ لاکھ کے قریب مہاجرین کی آمد نے پاکستان کو معاشی، سماجی، اقتصادی و سیاسی حوالوں سے ان گنت مسائل سے دوچار کر دیا۔ انیس ناگی چونکہ خود جولائی ۱۹۹۷ء سے جنوری ۱۹۹۹ء تک بطور کمشنر افغان مہاجرین تعینات رہے لہذا ناول میں بیان کردہ حقائق میں اُن کے مشاہدے کی گہرائی اور تجربے کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ افغان مہاجرین کو انیس ناگی نے

کیمپوں میں تکلیف دہ زندگی گزارتے دیکھا۔ حکومت پاکستان کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک نے مدد کا بھرپور ہاتھ بڑھایا مگر مہاجرین کے کم و بیش ۱۸ سالہ طویل قیام نے مدد کے جذبات کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ بیرون ممالک سے امداد آنا بند ہوئی تو تمام تر بوجھ پاکستان پر آگیا جسے پاکستان نے ایک طویل عرصے تک خوش اسلوبی سے برداشت کیا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ پاکستان پر مہاجرین کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔

مہاجرین میں سے جرائم پیشہ ذہنیت کے افراد نے دہشت گردی، منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ کے باعث پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا کر اخوت و انسانی ہمدردی کے جذبے کو شدید ٹھیس پہنچائی۔ انہوں نے پاکستان کی بے شمار قربانیوں کی قدر نہ کی۔ افغان مہاجرین نے پاکستان میں کپڑے اور الیکٹرونکس کے کاروبار میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے اور جس کا وہ اب پورا فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ افغانستان نے پاکستان کی ہمدردی کا لحاظ نہ کرکے خود غرضی کا ثبوت دیا۔ انیس ناگی نے افغانستان و پاکستان کی تاریخ کے حقائق کو اپنی فکر کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے ناول میں بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ جس میں انیس ناگی کا ذاتی تجربہ حقیقت کا رنگ بھرنے کا سب سے بڑا حوالہ ہے نیز یہ ناول انیس ناگی کے تاریخی شعور کا بہترین ترجمان ہے۔

انیس ناگی کے ناولوں کا تحقیقی و تنقیدی حوالوں سے تجزیہ کرنے کے بعد انیس ناگی کے تاریخی شعور پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ انیس ناگی نے اپنے ناولوں ایک گرم موسم کی کہانی، قلعہ، چوہوں کی کہانی اور کیمپ میں تاریخ کے ستم اور جبریت کو باطنی سطح پر محسوس کیا، تاریخ کے المیوں کو داخلی کرب کی آمیزش کے ساتھ ناول کے پیرائے میں اظہار کا درجہ عطا کیا۔ ایک گرم موسم کی کہانی میں انیس ناگی نے تاریخ کو بیان کرتے ہوئے ہر حال میں سچائی کو مقدم رکھا ہے۔ ناول میں حقیقی اور تاریخ کے زندہ کرداروں کو پیش کیا گیا ہے نیز فرضی کردار بھی اپنے مکالموں اور طرزِ عمل سے پورے ناول میں تاریخ کو اصل حقائق اور سچائی کے قریب ترین دکھاتے ہیں۔ ناول میں انیس ناگی نے محض ماضی کا ہی عکس پیش نہیں کیا بلکہ دورِ حاضر کی کڑوی حقیقتوں پر بھی طنز کیا ہے۔ ماضی کے حکمرانوں کی غلط سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے آج کے حکمرانوں کے طرزِ عمل کا اعادہ بھی انیس ناگی ساتھ کرتے ہیں۔ کیونکہ انیس ناگی اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ماضی کے حوالوں کو حال اور مستقبل کے حالات کی روشنی میں بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ ماضی میں گزرے واقعات کے اثرات ہمارے حال کو کس طرح مُتاثر کرتے ہیں، اس کا اظہار ناول میں بہت خوبی سے ملتا ہے۔ قلعہ میں انیس ناگی نے ایک طویل عرصے سے پاکستان کی جڑوں کو کاٹتی کرپشن کا تذکرہ اپنے مشاہدے و تجربے کی روشنی میں کیا ہے۔ بیوروکریسی کے محکمے میں رہتے ہوئے انیس ناگی اس محکمے کے اندرونی حالات سے بخوبی واقف تھے۔ اس کرپشن نے جس طرح قیام پاکستان سے لے کر اب تک ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے، اس کا اظہار

بے باکی کے ساتھ ناول میں ملتا ہے۔چوہوں کی کہانی ہندو مسلم تاریخ کی کڑواہٹوں کا واضح اظہار ہے۔ دونوں ملک ایک دوسرے کے حوالے سے متعصبانہ جذبات رکھتے ہیں مگر سمجھوتہ ایکسپریس کے اجراءسے اپنے اُن نفرت انگیز جذبات کو چُھپانا چاہتے ہیں، مگر کسی نہ کسی موقع پر وہ منفی جذبات اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں تو دونوں ملکوں کے بااثر طبقے کے چہروں سے نقاب خود بخود ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ ناول میں انیس ناگی نے ایسے ہی چہروں کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ منفی عناصر کی نقاب کُشائی کا عمل ہمیں ناول کیمپ میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسے ملک دُشمن عناصر ، جنھوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے افغان مہاجرین کو پاکستان میں اپنی من مانیوں کی اجازت دے کر ملکی سالمیت کو داؤ پر لگا دیا، ایسے افراد انیس ناگی کے قلم کی زد سے بچ نہیں سکے۔ چاروں ناولوں میں انیس ناگی نے غیر جانبدار رہتے ہوئے ماضی کی حقیقتوں اور تاریخ کی سچائیوں کو بیان کرنے کا حق ادا کیا ہے۔

فصیلیں میں شامل ناولوں کی کہانیوں کے تانوں بانوں میں انیس ناگی کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ کارفرما نظر آتا ہے۔ زیرِ تحقیق ناولوں میں بیان کیئے گئے حقائق سے انیس ناگی کا براہِ راست واسطہ پڑا، جس کی بنا پر وہ حقائق انیس ناگی کے شعور کا حصہ بن گئے اس کے علاوہ جو حقائق انیس ناگی کے ذاتی تجربے میں نہیں آئے، اُن میں بھی تاریخی سچائیاں کسی طور مسخ نہیں ہوئیں۔ انیس ناگی نے اُن سچائیوں کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر تنقیدی حوالوں سے چھان پھٹک کر پیش کیا ہے۔ اسی بنا پر انیس ناگی کے بیان کردہ تاریخی حوالوں اور اصل تاریخ میں اختلاف نظر نہیں آتا۔ انیس ناگی کے تاریخی نظریات تعصب کی آلودگی سے پاک ملتے ہیں۔ انیس ناگی کے ناول ماضی کے حوالے سے روایتی و ٹھوس خیالات کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ تاریخ کے حوالے سے بلا تحقیق و جواز اٹل نظریات انیس ناگی کے ہاں ناپید ہیں۔ اس تحقیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اُن کے ناولوں میں بیان کردہ تاریخی حقائق مبالغے سے پاک ہیں۔ انیس ناگی نے تاریخ کے بیان میں ہر حالت میں سچائی کو مقدم رکھتے ہوئے تاریخی حوالوں کو اصل سیاق و سباق کے تناظر میں بیان کیا۔ جس کے مطابق انیس ناگی تنقیدی تاریخی شعور کے حامل نظر آتے ہیں۔ تنقیدی تاریخی شعور کا بنیادی اصول یہی ہے کہ تاریخ کو اُس کے اصل سیاق و سباق میں رکھتے ہوئے پوری سچائی کے ساتھ بیان کیا جائے۔ انیس ناگی کے ناول اس اُصول کی پوری طرح پابندی کرتے نظر آتے ہیں اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ انیس ناگی کا تاریخی شعور سیاسی و سماجی شعور سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور انیس ناگی کے بیان کردہ تاریخی حقائق اصل تاریخ سے مماثل ہیں۔ انیس ناگی کے فصیلیں میں شامل چاروں ناولوں کے تجزیے و تحقیق کے بعد، تحقیق کے آغاز میں قائم کردہ مفروضہ "انیس ناگی کے ناولوں میں بیان کردہ تاریخ حقیقت پر مبنی تاریخی شعور فراہم کرتی ہے۔" درست ثابت ہوتا ہے۔ تاریخی کتب و دیگر تاریخی حوالوں کے ذریعے کی گئی تحقیق کے ذریعے یہ بات ثابت ہوئی کہ انیس ناگی کے

ناولوں میں بیان کردہ تاریخ حقیقت پر مبنی تاریخی شعور فراہم کرتی ہے۔ تاریخ کے بیان میں یہی حقیقت نگاری وسچائی انیس ناگی کے فن کی معراج اور اصل الاصول ہے۔

کتابیات

احمد،صلاح الدین۔صریر خامہ، جلد دوم۔لاہور:المقبول پبلی کیشنز،۱۹۶۹ء۔

احمد،عزیز الدین۔پنجاب اور بیرونی حملہ آور۔لاہور:بک ہوم ۲۰۱۴ء۔

انور،خورشید۔قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور۔نئی دہلی:انجمن ترقی اُردو ،۱۹۹۳ء۔

بخاری، سہیل۔اردو ناول نگاری۔دہلی:الحمرا پبلشر،۱۹۷۲ء۔

حیدری،کرم۔مسلمانانِ برصغیر کی جدو جہد آزادی میں مسلم لیگ کا کردار۔ اسلام آباد نیشنل پریس ٹرسٹ،۱۹۷۲ء۔

خان، ممتاز احمد۔آزادی کے بعد اردو ناول۔کراچی:انجمن اردو پاکستان ۱۹۹۷ء۔

خورشید مصطفیٰ رضوی،سید۔تاریخ جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ ء۔لاہور:یو پبلیشرز،۲۰۰۷ء۔

زمان،ایس ایم۔نسیم حجازی ایک مطالعہ۔س ن۔

سعید،احمد۔حصول پاکستان ۔لاہور:نیو کریسنٹ پبلشرز،۱۹۷۲ء۔

سکسینہ،رام بابو۔تاریخ ادب اردو۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء۔

سندیلوی،سلام۔ادب کا تنقیدی مطالعہ۔لکھنؤ:نسیم بک ڈپو،۱۹۷۲ء۔

شیخ،اسد سلیم۔افغان مہاجرین :ایک جائزہ۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۹ء۔

طالب،اشتیاق۔تمہید۔کراچی:مشتاق بک ڈپو،۱۹۸۳ء۔

عبدالقیوم۔حالی کی اردو نثر نگاری۔س ن۔

عسکری،حسن۔انسان اور آدمی (مضامین)۔علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۷۶ء۔

علی،مبارک(مُرتب)۔تاریخ اور مورخ (ڈاکٹر کے۔ایم اشرف کی تحریریں)۔لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۰۲ء۔

علی،مبارک(مئولف)۔جدید تاریخ۔لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۰۱ء۔

فاروقی،احسن۔ناول کیا ہے۔لکھنو:نسیم بک ڈپو،۱۹۳۶ء۔

فاطمی،علی احمد۔پریم چند نئے تناظر میں۔دہلی تخلیق کار پبلشرز،۲۰۰۶ء۔

فاطمی، علی احمد۔تاریخی ناول اور اصول۔الہ آباد: تہذیب نو پبلی کیشنز، ۱۹۸۰ء۔
قریشی، سلیم الدین۔سر سید احمد خان اسباب بغاوت ہند: تین غیر مطبوعہ مضامین۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء۔
قیصر الاسلام، قاضی۔فلسفے کے جدید نظریات۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۸ء۔
گل، صادق علی۔سرگزشت تاریخ۔لاہور: عزیز بک ڈپو، س ن۔
گوریجہ، رشید احمد۔اردو میں تاریخی ناول۔لاہور: ابلاغ، ۱۹۹۴ء۔
لال، کنہیا۔تاریخ لاہور۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔
محمد شفیع، میاں۔۱۸۵۷ ء پہلی جنگ آزادی(واقعات وحقائق)۔لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۰۴ء۔
محمد لطیف، سید۔تاریخ لاہور۔لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۷ء۔
محمد لطیف، سید۔تاریخِ پنجاب۔لاہور: تخلیقات، س ن۔
مسعود، زاہد(مرتب)۔انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار۔لاہور: حسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء۔
ملک، عنایت الہیٰ۔پاکستان میں انتظامیہ کا زوال۔لاہور: مشعل، س ن۔
منگلوری، ممتاز۔تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند۔س ن۔
ناگی، انیس۔ایک ادھوری سر گزشت۔لاہور: جمالیات، ۲۰۰۸ء۔
ناگی، انیس،ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری۔لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ ۱۹۸۸ء۔
ناگی، انیس۔فصیلیں(چار ناول)۔لاہور: جمالیات، ۲۰۰۵ء۔

BIBLOGRAPHY

Adamson, Lynda G. *World Historical Fiction.* US: Phoenix, AZ Orxy Press, 1999.https://www.amazon.com/world-historical-fiction.html.

Anne Doody, Margaret. *The True Story of the Novel.* New Brunswick, NJ: Rutgers University Press, 1996.https://books.google.com.

C. Seixas, Peter. *Theorizing Historical Consciousness.* Canada: University of Toronto Press, 2004.https://books.google.com.pk.

Carr, E.H. *What is History*.UK: Cambridge University Press,1961.

https://www.hist.com.ac.uk.

Chance, Jane. *Women Medievalists and the Academy*.US: University of Wisconsin Press,2005. https://books.google.com.

Finkelstein, Israel. *The last Labayu: King Saul and the expansion of the first North Israelite Territorial Entity*. edited by Yaira Amit, Ehud, Bin Zvi, Israel Finkelstein_and_Oded_Lipschits,171-187.Eisenbrauns,2006.

aleph.nli.org.li>RMB01.000468308.html.

Inge, William.*Art and practice of historical fiction*. Washington: Library of Congress, 1976.https://books.google.com.

Straub, Jurgen. *Telling Stories Making history: Toward a Narrative psychology of the historical construction of Meaning, [in:] Narration, identity and Historical Consciousness* ed.J. Straub.NewYork: Oxford University press2005

https://books.google.com.pk/books/about/Narration

_Identity_and_Historical_Conseiousness.html.

آرٹیکل/ARTICLES

احمد، صلاح الدین "شرر کی ناول نگاری" مشمولہ صریر خامہ، جلد دوم۔ دہلی: پی۔ کے پبلی کیشنز، ۱۹۶۹ء۔

جاوید، قدوس "قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ" مشمولہ قومی زبان۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۰ء۔

شرر، عبدالحلیم "آپ بیتی" "مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر۔ لاہور: ادارہ فروغ اردو، س ن۔

صدیقی، نفیس "افغان مہاجرین کا مسئلہ اور پاکستان" مشمولہ جنگ (روزنامہ)۔ لاہور: ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۴ء۔

طیب، محمد علی مرقع عالم، شمارہ ستمبر۔ ۱۸۹۰ء۔

Ali,Mubarak.The age of the sage."*DAWN*(2014).

https://www.age-of-the-sage.

F. Burns, John."Thousands Flee Indian City in Deadly Plague Outbreak." *The New York Times*(1994).www.nytimes.com>plague outbreak in1994.

Gadamer, Hans-Georg."The problem of Historical consciousness,"special issue, *Graduate Faculty Philosophy Journal* 5:1(1975). https://doi.org/10.5840/gfpj1975512.

Glencross, Andrew."Historical Consciousness in International Relations theory: A_hidden_disciplinary_dialogue"*SAGE* _journals (2015). https://www.journals.sagepub.com.

Gupta, Bhabani sen."The Afghan Syndrome"*Arabia Newsweek*,10 January (1982).https://www.arabianews.com.

Hashmi, Anwar. "Afghans Refugees Camps: big problem for Pakistan", *The facst*, no.4(2004).https://www.fact.com.pk.

Jeismann,KarlErnst.*Geschichtsbewusstsein,in_Hand_buch_Dar_Geschichtsdid aktik*_ed_Klaus_Bergmann_et_al_VOL.1, https://de.m.wikipedia.org/wiki/Historical_thinking.

Khan, Amina. "Afghan Refugees in Pakistan." *Institute of Strategic studies* (2017), accessed March07,2017, Final-IB-Amina-dated-07-03-3.pdf. web: issi.org.pk.

Lee, Peter. "Historical Consciousness and Understanding history."*The International Journal*_Volume_4, no_1. (2004). Access January,2009. https://www.google.com/amp/embedded? v=7.25.17.

Rai, Ruchika."How Surat turned clean and good, and stayed that way".*The Times of India*(2011.)accessed,March17,2011,06:26IST.

Sadeque, Najma. "Afghan Refugees what when the Aid stops?"*Dawn*, (24 June 1983). https://najmasadeque.wordpress.com.

Sivaramakrishnan, Kavita."What's in A name? The plague & the borders of Global-Local public health"*American Journal of Public Health*. (2015). https://doi:10.2015/AJPH.2010.300026

Thorp, Robert."Historical Consciousness and Historical Media-A History Didactical Approach to Educational Media" *Education Inquiry* Vol 5, (2014) https://doi.org/10.3402/edui.v5.24282.

"Humanitarian Assistance programme for Afghan Refugees in Pakistan" *National* (2016). https://pakobserver.net/ccar-to-brief-senate-on-afghan-refugees.

"Surat: A victim of its open sewers." *New York Times*. (1994).
Retrieved 2008-04-26. https://trove.nla.gov.au/version/75457686.

"The Nobel Prize in Literature 1929." Nobel prize. Org. Retrieved November. https://www.nobelprize.org>1929>press.

"UNICEF Assistance to Afghan Refugees in Pakistan" *The Express*. (1994). https://tribune.com.pk/story/1192625.

WEBSITES

Afghana[online].last_modified_November10,2018
https://en.m.Wikipedia.org>wiki>Afghana

Evacuee Trust Property Board[online]. last modified March 10, 2018.https://en.m.wikipedia.org/wiki/Evacuee-Trust-Property-Board.

refugee camps Absent Afghans[online]. last modified December 20,2017. https://sites.google.com>site> lfie within refugeescamps.

What is History[online].last modified April 4,2018.https:// en.m.wikipedia.org>wiki>History.

http://www.aag.org/HDGC/www/health/units/unit4/html

1994 plague in India[online]. last modified March 16, 2018.https://en.m.wikipedia.org/wiki/1994_plague_in_india.

What is Historical Consciousness [online]. last modified February 29,2018.http://teachinghistory.org/ HISTORICONSCIOUSNESS.

انٹرویو

شہریار، قاسمی، ابوالکلام۔ "قرۃ العین سے ایک غیر رسمی گفتگو" مشمولہ کتاب نما۔ دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۱۹۸۹ء۔